دوزخ میں ایک پہر

محمد الیاس

افسانے

محمد الیاس

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Muhammad Ilyas
Dozakh Main Aik Pehar/ Muhammad Ilyas.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2012.
240pp.
1. Urdu Literature - Short Stories.
I. Title.

2012

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2515-9
ISBN-13: 978-969-35-2515-1

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

ابتدا

خالق کائنات کے نام سے

جس نے زندگی کے ساتھ موت تخلیق کی

جو واحد راستہ ہے وصال کا 'نروان کا

اور

تمام تر جسمانی دکھوں اور روحانی صدموں سے

نجات کا۔

حشر کی اُس عظیم گھڑی کے نام

جب ہر بالادست کو حساب دینا ہو گا

ایک ایک ظلم کا

جو زیر دستوں پر روا رکھا گیا۔

اور

ہر اُس دیانتدار پولیس افسر کے نام

جو بدعنوان حکمرانوں کے عہد میں بھی

ثابت قدم رہا۔

فہرست

"دوزخ میں ایک پہر" - مطالعہ

ملا مصلح الدین بردسوی کا یہ قول میرا عمل ہے۔ کہ

"جب تک مطالعہ نہ کیا ہو تو میرے جیسا ڈرپوک کوئی نہیں اور جب مطالعہ کرلوں تو مجھ جیسا نڈر کوئی نہیں"

اور اب اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی دلیر لوگ گزارتے ہیں بزدل تو فقط زندگی کے وہم میں مبتلا رہتے ہیں۔ شجاعت ہمیشہ سے میری خواہشوں کی قیادت کرتی آئی ہے سو مطالعہ میری حیات کا لازمہ ہے اور اچھی کتاب مجھے آکسیجن فراہم کرتی ہے۔ اچھائی میرے نزدیک سچائی کا نام ہے۔ اور ادب صدق نصیب حرفوں کا دوام ہے جس سے زیست کا ہر طلسم کھلتا ہے اسی لیے مجھے سچ لکھنے والے ہمیشہ مرغوب رہے ہیں اور ان محبوب قلمکاروں میں محمد الیاس کا نام بھی شامل ہے۔ اس نے بہت کم عرصہ میں سادہ اسلوب اور پرتاثیر تخلیقی عمل کے توسط سے معاشرتی صداقتوں کو زبان دے کر ادبی دنیا میں ایک مقام بنالیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اس کی افسانوی کتاب کا انتظار رہتا ہے۔ ابھی اس کی تازہ ترین کتاب "دوزخ میں ایک پہر" آئی ہے۔ جس کے مشمولات ہمارے زوال یافتہ حالات کی عکاسی ہی نہیں، نشتر زنی بھی کرتے ہیں! پہلا افسانہ "روزن گریہ" بے درد ماحول کے شکنجے میں کسے جاتے انسانوں کے گمشدہ ارمانوں کا نوحہ ہے۔ مکافات عمل کے عکس میں رقص کرتے لمحوں کا گداز دردیلی ساعتوں کا جواز بنتا ہے تو آنسوؤں کے ہالے ماں کی گود کے پالے جذبوں کے امین بن جاتے ہیں۔

"تحفہ" وابستگیوں اور محبتوں کی علامتوں میں شمار ہوتا ہے۔ دلدار جذبوں کی سفارتیں صادق لمحوں کی بشارتیں بنتی ہیں تو نسبتوں کے سہانے نور کا سرور ایک مطمئن و مسرور کیفیت سے سرشار کردیتا ہے۔ یہی وہ نادر لمحہ ہوتا ہے کہ جب من کی ثروت دھن دولت کی چکاچوند شکست فاش دے دیتی ہے......!

''حیا'' انسانی تمدن کی ضیا کا نام ہے۔ فکر ونظر میں روشنی ہو تو معاشرت ایک بشارت بھری صبح بن جاتی ہے لیکن جب رہنما کا عمل مستوجب سزا ٹھہرے تو لفظوں کے مفہوم منہ چھپانے لگتے ہیں اور بہادری کے اطوار اور اہداف بدل جایا کرتے ہیں۔ یہ افسانہ ہماری بے طور ثقافت وسیاست کے برہنہ بدن پر ایک تازیانہ ہے جس کی ٹیسیں اہلِ احساس دیر تک اٹھتی دیکھتیں گے!

''چوہدری'' ذات پات اور اونچ نیچ بھرے معاشرے کی گھات بیان کرتی ہوئی وہ کہانی ہے جس میں صادق عشق کی جولانی اپنے صدق کی شہادتیں خود رقم کرتی ہے۔ عشق جس کی مہک میں سدا بہار رتوں کا شمار ہے۔ جس کی چمک میں کامران زمانوں کا نکھار ہے۔ جس کے ہر عمل میں جاوداں جذبوں کی بہار ہے اور جس کے ہر لمحہ میں سربلند ارادوں اور سرخرو عملوں کا وقار ہے۔ یہ پُر اثر افسانہ اسی عشق کی سرشار مگر اُداس کن کیفیتوں کی دھوپ چھاؤں سے عبارت ہے۔ سرشاری جذبوں کی اور اُداسی ناساز تمدن کی...... اسی امتزاج نے تو المیہ کو ہمارے معاشرے کا بے طلب رواج بنا دیا ہے!

محمد الیاس کا تخلیقی اختصاص یہ ہے کہ وہ ہمارے اردگرد موجود سچائیوں کو موثر لفظوں کا اعتبار عطا کر دیتا ہے۔ یہ ہمارے اپنے دُکھ ہیں جنہیں وہ ایک آفاق گیر سکھ کی جستجو اور عالمگیر مسرت کی آرزو میں تحریر کرتا ہے تو اس کے من کی سچائی تخلیقی توانائی کی رفاقت میں پڑھنے والوں کے دلوں پر راج کرنے لگتی ہے خلیل جبران نے شاید ایسی ہی کسی صورتِ حال میں کہا تھا کہ...... ''جو لوگ قلم کا علم تھام کر سچے لفظوں اور صدق نصیب منظروں کے عساکر تیار کرتے رہتے ہیں...... دل ہمیشہ وہی فتح کیا کرتے ہیں''......

محمد الیاس نے جس کم عرصہ میں مقبولیت کے جہان تسخیر کیے ہیں...... اسے فاتحِ زمانہ کے منصب پر فائز ہونے کے لیے اور کسی قوت ودلیل کی حاجت ہی کیا ہے۔ وہ افسانہ لکھتا ہے تو اپنے عہد کی تہذیب وتاریخ رقم کر دیتا ہے یہ اعزاز قدرت کا ایک راز ہے جس کی گرہ بہت کم فنکاروں کے مقدر پر کھلتی ہے!

''مجبور'' ملک لوٹنے والے ''خادمانِ قوم'' کا فسانہ ہے۔ دولت جن کا قومی ترانہ اور شہرت وحکومت کی آرزو جن کے ہر عمل کا آشیانہ ہے۔ ایک کاٹ دار گہرے طنز کے نشتر سے

محمد الیاس نے ہمارے معاشرے کے اس ناسور کا آپریشن کیا ہے جو قوم اور ملک کے وجود کو ذاتی نام ونمود کی آلائشوں سے بھرتا جا رہا ہے اور دُکھ کا اصل ماجرا یہ ہے کہ احساسِ زیاں بھی جاتا رہا ہے......

"شاعر" بے علم اور بے ادب تمدن میں سانس لینے والے اس تخلیق کار کا دُکھ بیان کرتا ہے جو اپنے ماحول کے پرہول کو زبان دیتا ہے جس کا ہاتھ عصر کی نبض پر ہوتا ہے اور جس کی آنکھوں میں آنے والے زمانوں کا عکس تیرتا ہے مگر وہ ساعتِ موجود میں بے نمود رہتا ہے۔ ثروت مند رعونت اس کی تخلیقی متاع کی قدر افزائی یوں کرتی ہے کہ ثمر شیریں اپنے دامن میں ڈال لیتی ہے اور خزانہ جس کا ہوتا ہے وہ زمانہ کا منہ دیکھتا پھرتا ہے......

"تجربہ" زندگی کو شرمندگی بنتے دیکھنے والوں اور اس کا حصہ بن جانے والوں کا اظہاریہ ہے۔ ناسوروں پر نشتر لگانے کا یہ انداز اب محمد الیاس کا اختصاص بنتا جا رہا ہے۔ ہم نے اپنے اردگرد کی کثافت اور غلاظت کو رنگین پردوں میں ڈھانپ دینے کا جو رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ ایک روز اچانک تیز آندھی چلنے پر سارے تمدن کو متعفن کرنے کا باعث بن جائے گا۔ شاید اسی حقیقت کے پیشِ نظر محمد الیاس تلخ حقائق سامنے لاتا ہے تاکہ انہیں جڑوں سے اکھاڑ پھینک دیا جائے...... مگر میں سوچتا ہوں اس کے طرزِ فکر کو ہمارا طرزِ عمل کب اپنا رہنما بنائے گا...... یوں ہو جائے تو یہ زندگی اور زندگی ہو......

محمد الیاس کے افسانوی اسلوب کا سب سے مرغوب موضوع ہماری فضا اپنی دھرتی اور اپنے رسم و رواج ہیں جو ہمارے معاشرتی مزاج کا اس طرح حصہ بن گئے ہیں کہ اب ہم بلا سوچے سمجھے ان کی پیروی کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک ذہین اور مدبر قلمکار کی حیثیت میں محمد الیاس ہمارے معاشرتی رویوں سے دُکھوں اور بیماریوں کی شناخت کرتا ہے اور پھر انہیں تخلیقی دیانت کے ساتھ قرطاس وقلم کے حوالے کر دیتا ہے۔ تحریر میں صداقت ہو تو ایسا ہر حوالہ آنے والے دنوں کا اُجالا بن جاتا ہے اور اس میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ محمد الیاس کی پہلی اور والہانہ وابستگی سچ کے ساتھ ہے۔ اسی لیے میں اس کی تحریروں کو ادب کے اس زمرے میں شامل کرتا ہوں جس میں بالزاک کے ناول موجود ہیں، جن کے بارے میں اینگلز نے کہا تھا "فرانس کی تاریخ کا سچا گیان تاریخ فرانس کی کتابوں سے نہیں بالزاک کے ناولز سے ہوتا ہے۔"

سارتر بھی ایسی ہی کیفیت کا اظہار چاہتا تھا جب اس نے کہا تھا۔"ادیب اپنے عہد کے دُکھ سُکھ کا سچا اظہار اپنے تخلیقی عمل کے ذریعے کرتا ہے۔"میں اسی لیے ادیب کو اپنے عہد کا طبیب کہا کرتا ہوں اور محمد الیاس ایسے اہلِ قلم میرے ان لفظوں کا بھرم رکھتے ہیں۔ان کے افسانے "نیلام"، "بیگا"، "مراجعت"، "بازگشت"، "اتارو"، "ہیرو" اور "غنڈہ راج" ہماری معاشرت کے جسدِ لاغر پر نشتریت کا وہ عمل سرانجام دیتے ہیں جو صحتِ عامہ کے لیے لازم ٹھہرتا ہے۔"بے نوا" وہ افسانہ ہے جو بے نوا کی انا کو تکبر کی فلک بوس فصیل سے ٹکرا کر اسے ریزہ ریزہ کر دینے کے اہلِ عزم کا عکس کار ہے۔کوئی ظلم کوئی جبر اس کی آنکھ میں آنسو اور زبان پر فریاد نہیں لا سکتا۔یہ اور بات کہ جب کسی بہت اپنے کی صدا آغوش کشا ہوتی ہے تو آنسوؤں کے تار گلے کا ہار بن جاتے ہیں۔

"دوزخ میں ایک پہر" کتاب کا سرنامہ ہے اور افسانہ کا عنوان بھی۔جس معاشرہ میں بنیادی قدر علم کی بجائے پیسہ اور عہدہ ہو جائے اسے عذاب کا مستحق ہوتے دیر نہیں لگتی۔ایسی دیر جس کی کوئی سویر نہیں ہوتی۔"بے غیرتی"، "کفایت"، "سانولی سلونی" اور "دعا" محمد الیاس کے مخصوص تیر و نشتر سے آراستہ افسانے ہیں جو بے حس معاشرے کے بدن پر تازیانے کی طرح برستے ہیں......شاید کسی زخم سے رستا لہو غیور جذبوں کی خوشبو بن کر انسانیت کو سرخرو کر دے۔ہم سب اسی "شاید" کی آرزو میں جی رہے ہیں۔آرزو جب تک جستجو نہ بنے، بے نمود رہتی ہے۔محمد الیاس نے "اِک بات بہت ضروری" میں وہ بات کہہ دی ہے جو ہر دور کی ضرورت ہے اور جس کا اظہار بہت ضروری ہے ورنہ زندگی اور موت میں کوئی فاصلہ نہیں رہ جاتا......محبت اور صرف محبت...... جو زندگی کو تابندگی بھی دیتی ہے اور پائندگی بھی!!!

پروفیسر محمد فیروز شاہ

روزنِ گریہ

کنویں خشک ہو جاتے ہیں۔ زمین کے نیچے پانی کے ذخائر ہیں اور سطح پر سمندر۔ لیکن پھر بھی کنویں خشک ہو جاتے ہیں۔ آنسو خشک نہیں ہوتے۔ رات ڈھل جاتی ہے۔ انسان کے جسم کا حجم ہی کتنا ہے۔ اتنے آنسو کہاں سے آ جاتے ہیں۔ دل اس قدر گداز کیوں ہے۔ ہر لمحہ رونے پر آمادہ۔ شاید اسی لیے وہ زندہ ہے۔ رات سونے کے لیے بنی ہے لیکن وہ رو لیتا ہے۔ تنہا الگ تھلگ۔ گویا یہی بہترین وقت ہے جو اس کا اپنا ہوتا ہے۔ رات کی تاریکی بہت کچھ چھپا لیتی ہے۔ آنسوؤں کو بھی۔ آنسو گناہ نہیں ہوتے۔ چھپ کر کیوں بہائے جاتے ہیں۔

کم و بیش پچاس سال کا عرصہ گزر چکا ہوگا۔ وہ ساتویں میں پڑھتا تھا۔ اُسے یاد ہے جب اپنے ابا سے ملنے گیا تھا۔ وہ بہت بڑی کنسٹرکشن کمپنی کے ایم ڈی تھے۔ پراجیکٹ پر ایک پہاڑ جیسی پتھروں کی بنائی گئی Retaining Wall دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا' جس میں ان گنت سوراخ تھے۔ اُس نے ابا سے پوچھا کہ یہ سوراخ کس لیے رکھے گئے ہیں۔ اسے بتایا گیا کہ یہ Weap Holes ہیں۔ دیوار کو جب رونا ہوتا ہے تو ان سوراخوں سے آنسو بہا لیتی ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو پانی اندر ہی اندر سے مار کرتا رہتا ہے اور دیوار ڈھے جاتی ہے۔ یہ دیوار کی آنکھیں ہیں گویا زندگی کی علامت۔

لیکن اسے اب زندہ رہنے کی تمنا نہیں رہی۔ چہرے پر لگی آنکھیں دھندلا گئی

ہیں۔ پہلے پہل وہ سمجھتا تھا کہ آنسوؤں کی چادر تنی رہتی ہے' شاید اس لیے صاف دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن جب وہ تنہا نہیں ہوتا اور رونے کے لیے وقت غیر موزوں ہوتا ہے' تب بھی منظر صاف دکھائی نہیں دیتا۔ وہ فکرمند نہیں ہوا کہ بصارت کمزور پڑ گئی ہے۔ اب کیا دیکھنا ہے؟ دل و دماغ میں ایک جہاں آباد ہے۔ بہت سی یادیں ہیں۔ جب چاہتا ہے' ایک طلسم ہوشربا کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ یادوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

فارغ التحصیل ہونے پر اس نے خواہش ظاہر کی تو باپ نے بڑی خوشی سے معزول ہونا قبول کر لیا۔ ساری کاروباری سلطنت اس کے زیر نگیں ہو گئی۔ سینکڑوں کارکن' مشینری' ٹرانسپورٹ' دفاتر اور بینک اکاؤنٹس۔ وہ فطرتاً محنتی' انتھک اور بہت ہی متحرک شخص تھا۔ زندگی بھر باپ کی خدمت کی۔ اُن کی ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ احترام سے پیش آیا۔ لیکن خود اپنے بیٹے کے ہاتھوں معزول ہونے کے بعد یاد آتا ہے کہ اس کے مرحوم باپ کو اچھے لباس اور خوراک کی تمنا نہیں ہوتی تھی۔ وہ بات کرنے کے بہانے تلاش کرتے تھے۔ پاس بیٹھنے اور ہر لمحہ قریب آنے کے' لیکن اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ یہ چند لفظوں میں بات سمیٹ دیا کرتا تھا۔

وہ اپنے ماضی میں اور بھی بہت دور نکل جاتا' نوجوانی کے دور میں۔ ماں کا خوبصورت چہرہ اس کے سامنے روشن ہو جاتا۔ اُن کی باتیں یاد آ جاتیں۔ وہ اس کے بارے میں کہا کرتیں۔ ''اللہ نے بیٹا تو عطا کر دیا لیکن فطرتاً خودمختار ہے۔ اسے جی بھر کے گود میں کھلایا نہیں۔ یہ تھا ہی اپنی مرضی کا مالک۔ پتا ہی نہیں چلا' کب گود سے کھسک گیا۔ پاؤں پاؤں چلا پھر ہاتھ ہی نہیں آیا کہ اس سے باتیں کرتی۔ دل چاہتا ہے کہ وہ اولین وقت پھر لوٹ آئے' جب یہ ننھا بچہ تھا۔ میں اس سے خوب پیار کروں۔ سینے سے لپٹا کر لوریاں دوں۔ گود میں بھر کر منہ چوموں اور بازوؤں پہ

جھولا جھلاؤں۔"

ماں اسے جلد ہی چھوڑ کر دارِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔ باپ نے کاروبار کے فروغ میں پناہ حاصل کر لی اور یہ خود اپنی دھن میں مگن تعلیم کے سفر پر گامزن رہا۔ لیکن آج اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ ماں کی گود سے نکلا تو کرال کرتا ہوا دور چلا گیا۔ بہت ہی مختصر عرصے کے لیے شاید پاؤں پاؤں چلا ہو؟ اسے یاد نہیں۔ اسے اتنا یاد ہے کہ وہ دوڑا ہی نہیں پرواز کرتا رہا۔ تاہم جب کبھی مختصر دورانیے کے لیے پرواز کو موقوف کیا کرتا تو ایک گیت گایا کرتا' جس سے اسے بہت سکون محسوس ہوتا تھا۔

"Oh Mom! Put me in your arms and rock the baby."

وقت گزر گیا ہے۔ یہ واپس نہیں آ سکتا۔ مرنے والے کفارہ ادا کرنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔ کاش وہ اب زندہ ہوتے۔ یہ اُن کے سامنے پہروں بیٹھا رہتا' باتیں کیا کرتا' ابا بولتے رہتے اور یہ سنتا اور جو کچھ وہ پوچھتے یہ سب کچھ بتایا کرتا۔ اتنا زیادہ کہ ابا اس کی بات قطع کرتے اور کہتے۔ "بس کرو بیٹا! اتنا زیادہ نہ بولا کرو۔ تم بہت باتیں کرتے ہو۔" پھر وہ موضوع بدل دیتے۔

اس کے دل سے پکار اُٹھتی۔ "اے اللہ! کوئی ایک ساعت ایسی نصیب ہو' جس میں اپنے ابا سے اتنا استفسار کر لوں کہ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتے تھے۔ کس موضوع پر بولنا چاہتے تھے۔ زندگی کا یہی بڑا المیہ ہے کہ کفارہ ادا کرنے کا موقع نہیں دیتی۔ گئے دن اور لمحے پلٹ کر نہیں آتے۔

تغیر کو ہی ثبات ہے۔ ایک سلطنت کی سرحدیں سمٹتی چلی جاتی ہیں اور وہ قلعہ کے اندر تک محدود ہو جاتی ہے۔ ٹکسال ہوتا ہے لیکن سکے ڈھالنے کے لیے دھات ہی دسترس میں نہیں رہتی۔ دنیا میں آنے والا ہر انسان جدید خیالات کا حامل ہوتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دقیانوسی قرار پاتا ہے۔ اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے اور

کوئی افادیت نہیں رہتی۔ موجودہ عہد کا یہ اعزاز ہے کہ بیٹے ناخلف نہیں ہوتے' اس لیے شاہجہانوں کو قید کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ ہر کوئی اپنے اپنے ولی عہد کے ہاتھوں از خود ہی معزول ہونے پر آمادہ ہوتا ہے۔ شاید یہی وہ رشتہ ہے' جس سے مات کھانے میں بھی کوئی ان کہی خوشی پنہاں ہے۔ تاہم معزول ہونے والے آسائشوں میں قید ہو کر تنہا ہو جاتے ہیں۔

آج پھر اس نے گھر میں بیٹے کی آواز سنی تھی۔ وہ جلدی میں تھا۔ اُسے کسی بہت دور کے سفر پر جانا تھا۔ وہ سب کو بڑی سختی سے کہہ رہا تھا۔ "ابا جان کا خیال رکھنا ہے۔ خبردار! اگر کوئی کوتاہی ہوئی تو میں معاف نہیں کروں گا۔ چاہے کوئی مر رہا ہو یا قیامت ٹوٹ رہی ہو' ابا جی کی خدمت میں غفلت نہیں ہونی چاہیے۔" اس نے جواب میں کسی کو کہتے ہوئے سنا۔ "آپ ایک بار خود بھی اُن سے مل لیں۔" بیٹے نے کہا۔ "واپسی پر ملوں گا۔ اس وقت انہیں آرام کرنے دو۔"

وہ آرام ہی کر رہا تھا۔ ماں کی آغوش سے نکلا تو جدید آسائشوں کے لامتناہی سلسلے میں کہیں کھو گیا۔ بس ایک ہی ملال ہے' رہ رہ کر قلق گزرتا ہے۔ بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ اپنے حصے کا پیار اور بوسے مع سود وصول کرنا تھے لیکن اس کے لیے عہدِ رفتہ میں پھر سے لوٹ کر جانا ہو گا۔ جوانی کے دور میں۔ پہروں باتیں کرنے کے لیے اور پھر اس سے بھی بہت پیچھے کرال کرتے ہوئے' آغوش میں سما جانے کے لیے۔

کچھ عرصے سے عظیم الشان حفاظتی دیوار کے روزنِ گریہ شاید بند ہو چلے ہیں۔ فرسودگی اندر سے نقب لگا رہی ہے۔ کسی بھی لمحے اسے ڈھے جانا ہے۔ آزاد ہونا ہے۔ یہی رہائی ہے اور نجات کی راہ۔ اُس پار جانے کا راستہ۔ جہاں اس کی محبتیں بس گئی ہیں۔ اب اُنہیں وہاں تا ابد رہنا ہے۔ درمیان میں ایک خفیف سا پردہ ہے۔ یہ

دوری بھی کوئی دوری ہے۔ وہ اس دُھندلے پردے کے پار جا سکتا ہے۔ واپس کبھی نہ لوٹنے کے لیے۔ کاش! مہربان موت اسے اپنے گداز بازوؤں میں بھر کر پار لے جائے' جہاں وہ کراں کرتا ہوا بچھڑی ہوئی آغوش میں سما جائے۔''

موت سے اس کے رومانس کا آغاز ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ وہ ذہنی طور پر اپنی اس نئی محبوبہ کے بہت قریب ہو گیا۔ ہر وقت دل ہی دل میں اس سے راز و نیاز کرتا رہتا۔ آج تک اس نے جتنی محبتیں کیں' ان سب میں سے یہ انوکھی تھی۔ بہت دل آویز' غم گسار اور ہم دم۔ جس کے ہم راہ اس نے ایک بڑے دل فریب سفر پر جانا تھا' جس کی تکمیل کے بعد تا ابد ایک سکوت کا سا سماں اس کا مقدر ٹھہرنا تھا۔ اپنے خالق کے حضور تمام تر روحانی کرب و الم کے ساتھ پیش ہونا تھا۔ اس دھندلے خفیف سے پردے کے پار' جہاں اس کی گم گشتہ محبتیں آباد ہیں۔

نہ جانے رات کا کون سا پہر ہے' اس نے محسوس کیا کہ گھر میں زندگی بیدار ہو گئی ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ تمام رونقیں اس گھر کے محور و مرکز کے دم سے لوٹ آئی ہیں۔ اس کی سماعت سے الفاظ ہم کنار ہوئے۔ ''ابا جی کیسے ہیں؟'' ایک اور آواز سنائی دی۔ ''وہ ٹھیک ہیں۔ آپ خود جا کر مل آئیں۔'' ...... ''ابھی وہ آرام کر رہے ہوں گے۔ صبح ملوں گا۔''

رات گہری نیند سو گئی ہے۔ سناٹا چھایا ہوا ہے۔ کامل سکوت۔ جیسے اذن ہوا ہو کہ روئے زمین پر زندگی سانس بھی نہ لے۔ اسے تنہائی کا احساس ہونے لگا ہے۔ آنکھوں میں دھند چھانے لگی ہے لیکن روزنِ گریہ شاید بند ہو چکے ہیں۔ اس کی ہستی کے نہاں خانے میں اُفق تا اُفق گھنگھور گھٹا چھانے لگی ہے۔ تیور بتا رہے ہیں کہ ٹوٹ کر برسے گی اور بہت بڑے بڑے عظیم الشان حفاظتی بند خس و خاشاک کی مانند بہہ جائیں گے۔

روح کے ایک ایک پرت میں سے درد کی لہر اٹھی ہے۔ وہ بے قرار ہو کر دل ہی دل میں اپنی محبوبہ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ "میں ناتواں ہوں۔ خفیف سی جنبش کی بھی سکت نہیں لیکن مجھے نروان کے سفر پر نکلنا ہے۔ جس کی منزل بڑی دل فریب ہے۔ آ! مجھے اپنے مہربان بازوؤں میں بھر لے اور دھندلے پردے کے اُس پار لے چل۔"

محبوبہ آہستگی سے اس کی جانب بڑھتی ہے۔ وہ ایک خوابناک سے کہر یلے ہالہ میں لپٹی ہوئی ہے۔ قریب پہنچ کر اپنے بازو پھیلا دیتی ہے۔ اس کے لبوں سے ایک خفیف سی مسکان جھلکتی ہے۔ وہ آگے بڑھ کر بازوؤں میں سما جاتا ہے تو اس پر ایک روح پرور سرشاری طاری ہونے لگتی ہے۔ برسوں سے بھولے ہوئے گیت کے بول اس کی سماعتوں میں رس گھولنے لگتے ہیں۔

"Oh Mom! Put me in your arms and rock the baby."

تحفہ

دوپہر ڈھلنے کو تھی اور چارپائی پر لیٹے ہوئے وہ گہری سوچ میں گم تھا کہ کسی طرح کچھ معقول رقم ہاتھ لگے' تا کہ ساجدہ بہن کے لیے شادی کا کوئی شان دار تحفہ خرید سکے۔ مالک مکان کو وہ سُدھ کر ہی چکا تھا۔ کرائے کی مد میں سابقہ تمام واجبات معاف کروانے کے علاوہ اگلے سفر پر نکلنے کے لیے زادِ راہ کے طور پر کچھ نقد رقم ملنے کا عندیہ بھی مکمل چکا تھا۔ حالانکہ شروع میں وہ گرجا برسا اور چھری ہاتھ میں لہراتے ہوئے واضح الفاظ میں دھمکی دے ڈالی کہ اگر مکان اسی وقت خالی نہ کیا تو اس کا پیٹ پھاڑ ڈالے گا۔ مسکین نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو ڈھانپتے ہوئے بڑی عاجزی سے التجا کی۔ "انہیں جناب! خدا کے لیے ایسا نہ کیجیے گا۔ اس طرح آنتیں زمین پر گرنے سے مٹی میں لتھڑ جائیں گی اور میں انہیں کہاں دھوتا پھروں گا۔ میرے گھڑے میں بمشکل دو گلاس پانی ہو گا"...... بیچ بچاؤ کرانے والوں میں سے کئی ایک کی ہنسی چھوٹ گئی اور مالک مکان خجل ہو کر وہاں سے کھسک لیا۔

مسکین کا مسئلہ صرف یہ نہیں تھا کہ گزشتہ سات ماہ کا کرایہ معاف ہو اور شفٹنگ کا خرچہ مل جائے۔ بات تب بنتی جب اگلے مکان کے لیے بھی چند ماہ کا کرایہ ایڈوانس دینے کا معقول بندوبست ہو جاتا' تا کہ نیا مالک مکان اسے ہاتھوں ہاتھ لیتا۔ اور ایک آدھ ماہ کا جیب خرچ بھی وصول ہو سکتا۔ لیکن موجودہ مالک مکان حد درجے کا کیچڑ ثابت

ہوا تھا۔ حالانکہ اس سے پیشتر، مسکین کو بعض ایسے ایسے فراخ دل مالک مکان ملے تھے جو سفید پوش ہونے کے باوجود نہ صرف سابقہ بقایا جات معاف کر دیتے بلکہ معقول مالی مدد بھی کر دیا کرتے اور حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے۔ جب کہ موجودہ مالک بیس دکانوں اور اتنی ہی تعداد میں فلیٹ اور مکانات کا کرایہ مزے سے کھا رہا تھا لیکن ذرا سے مالی خسارے پر اُسے غشی کے دورے پڑنے لگتے تھے۔ مسکین کا یہ مؤقف تھا کہ مکان سے بے دخل ہونے پر جو آزار اسے پہنچا ہے' اس کی تلافی کچھ معقول طور پر ہو۔ اُس نے مالک کو خوفِ خدا سے ڈرانے اور اُس کے جذبۂ ترحم کو جگانے کے لیے تمام حربے آزما ڈالے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور اپنی حقیری پیش کش پر نظرِ ثانی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ مسکین نے اُسے ایسی مرغی کی مثال بھی دی جو خوب موٹی تازی ہونے کے باوجود کمزور کے مقابلے میں انتہائی چھوٹا سا انڈہ چیخ چلا کر دیتی ہے۔ تاہم کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی۔

ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ مالک مکان کا بلڈ پریشر لمحہ بھر میں آسمان کو چھونے لگتا۔ مسکین جس قدر بھی دھیمے اور میٹھے لہجے میں بات کرتا' وہ تیز تر ہوا جاتا۔ مسکین فطرتاً ایک صلح جو شخص تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ بھاگتے چور کی لنگوٹی سے دست بردار نہیں ہونا چاہیے اور مالک جس طرح فوراً ہی تیخ پا ہو جاتا ہے' اس طرح ذہنی دباؤ کے زیرِ اثر وہ راہیِ عدم بھی ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں لواحقین یقیناً معقول ترکے کے وارث ٹھہریں گے مگر خود مسکین بے چارے کو بطورِ تلافی پیش کردہ حقیر سی رقم سے بھی محروم ہونا پڑے گا۔ جب کہ موجودہ حالات میں وہ کسی مالی خسارے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

مسکین کی مجبوری یہ تھی کہ چند روز میں اس کی منہ بولی بہن کی شادی ہو رہی تھی۔ جب کہیں بھی کوئی پناہ نہ ملتی تو ابتلا کے ایسے دور میں وہ اپنے بچپن کے

دوست ساجد کے ہاں چلا جایا کرتا' جہاں ساجدہ سگی بہنوں سے بھی بڑھ کر خوش دلی سے اُس کی خدمت کیا کرتی۔ مسکین نے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ اس کی شادی پر کوئی بہت ہی شاندار تحفہ ضرور دے گا۔ کئی ایک بار اس نے اس امر کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ وعدہ نبھانے اور بہن کی خدمت کا صلہ چکانے کا یہ نادر موقعہ رائگاں چلا جائے' یہ اسے گوارا نہیں تھا۔ جب کہ موجودہ اسامی انتہائی تھڑدلی ثابت ہوئی تھی۔ گرہ ڈھیلی کرنے کی بجائے خطرناک نتائج سے دوچار کرنے کی دھمکیاں دینے پر ساری توانائی صرف کر رہی تھی۔

گرمی زیادہ ہونے کے باعث باہر گلی میں سناٹا تھا۔ تاہم وقفے وقفے سے کسی راہ گیر کے قدموں کی چاپ سنائی دے جاتی۔ ابھی تک وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پایا تھا کہ ساجدہ کے لیے کوئی اچھا اور قیمتی تحفہ کیسے اور کہاں سے حاصل کرے۔ اسی ادھیڑبُن میں اس کے کانوں میں صدا آئی۔ ''قرآن شریف اور سیپارے لے لو۔'' چند ساعتوں تک وہ ساکت پڑا رہا۔ اس اثنا میں آواز دوبارہ سنائی دی۔ لیکن بہت قریب سے۔ ''قرآن شریف سیپارے اور دینی کتابیں لے لو۔'' اگلے ہی لمحے وہ چارپائی سے اُٹھا اور لپک کر گلی میں سے گزرتے کتب فروش کو اندر بلا لایا۔

بہت بڑی تختی' شاندار گیٹ اَپ' اعلیٰ چھپائی' معیاری کاغذ والا عکسی قرآن مجید دیکھ کر مسکین کی آنکھیں روشن ہو گئیں اور دل خوشی سے جھوم اُٹھا۔ آج پہلی بار اُسے قرآن پاک کا ایسا نظر نواز نسخہ دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ہدیہ ایک ہفتہ کے بعد ادا کرنے کا وعدہ کر کے کرۂ ارض پر موجود اعلیٰ ترین تحفہ حاصل کر چکا تو اسے چین آ گیا۔

فرنیچر کی دکان پر مسکین نے سب سے بڑھیا رحل پسند کی' جس پر انتہائی نفیس کندہ کاری کی گئی تھی۔ بلاشبہ وہ کسی ماہر فن کے دستِ ہنر کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ مسکین اپنے فطری وصف کو بروئے کار لاتے ہوئے مطالعۂ قرآن اور اس کے فیوض و برکات پر

بڑے اعتماد سے بچی تلی اور پرکشش گفتگو کرتا رہا۔ دکاندار بھی آخرکار ایک از ان ہی ہوتا ہے۔ وہ کسی ایسے دل آویز کردار سے متاثر کیوں نہ ہو جس کا طرزِ عمل ہر لحاظ سے ایک مرنجان مرنج شخص کا سا ہو۔ ایسے ہی ایک نازک لمحے میں مسکین نے رحل گھر لے جا کر دکھانے کے لیے بیس پچیس منٹ کی مہلت طلب کی تو دکاندار نے خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا۔ "It's my pleasure."

مسکین نے گھر پہنچنے سے پیشتر ہی فیصلہ کر لیا کہ آج کا کام کل پر چھوڑنا دانش مندی نہیں اور جو خوشی کسی کو جس قدر جلد دی جا سکے اتنا ہی بہتر ہے خواہ وہ مالک مکان جیسا کوئی خسیس شخص ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا وہ سیدھا اُس کے پاس گیا اور مکان اسی وقت خالی کرنے کی نوید سنائی۔ مالک کی باچھیں کھلنے کے ساتھ ساتھ ہاتھ جیب میں چلا گیا۔ حقیری رقم بطور زادِ راہ وصول کر کے مسکین گھر آیا اور اطمینان سے سامان سمیٹنے میں مصروف ہو گیا۔

حیا

نام تجی دلیر تھا' لیکن اُس کے پاس سخاوت کرنے کو پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ تاہم وہ دلیر یقیناً تھا۔ مدِمقابل سے بے خطر بھڑ جایا کرتا اور پلک جھپکتے ہی گرفت میں لے کر چت کر دیتا۔ اسی لیے وہ صوفی جپھا کے نام سے مشہور تھا۔ اپنے لیڈر کی قیادت میں وہ بے حیائی اور فحاشی کے خلاف جہاد کر رہا تھا۔ اس نیک مقصد کے لیے قائم سماجی اور نیم سیاسی تنظیم کا وہ سب سے فعال اور جوشیلا کارکن تھا' جس نے ساتھی ارکان کی کمان کرتے ہوئے کئی بار شہر میں مختلف مقامات پر آویزاں عریاں فلمی ہورڈنگز اور فحش پوسٹرز تلف کیے تھے۔ کئی وڈیو سینٹرز اور پوشیدہ امراض کے معالجین اپنے شیشے کے گھر بھی اسی تنظیم کے کارکنان سے تڑوا بیٹھے تھے۔ کبھی کبھار صوفی جپھا دھمکی آمیز بیانات بھی داغ دیتا کہ بے پردگی کے ذریعے اخلاقی اور اعلیٰ معاشرتی اقدار پامال کرنے والی مغرب زدہ خواتین نے روش نہ بدلی تو انتہائی اقدام کے طور پر اُن کے چہرے تیزاب پھینک کر مسخ کر دیے جائیں گے۔

صوفی جپھا حیا کے تقاضوں پر بڑی گہری نظر رکھتا تھا۔ لیکن بعض معاملات میں تمام تر احتیاط بالائے طاق رکھی رہ جاتی۔ بیوی کو اکثر ہسپتال جانا پڑتا لیکن سڑک سے ہسپتال تک سوزوکی وین کے علاوہ کوئی سواری نہیں ملتی تھی۔ پیچھے بیٹھنے سے سامنے والی سواریوں کے ساتھ گھٹنے بھڑ جاتے اور سانسیں بھی باہم بغل گیر ہونے لگتیں۔ جب کہ

ڈرائیور کے ساتھ دو خواتین کو بیٹھنا پڑتا اور گیئر لیور کو آزاد رکھنے کے لیے ساتھ بیٹھنے والی کو اپنا دایاں گھٹنا اُٹھا کر بائیں پر رکھنا پڑتا' تب کہیں ڈرائیور کو دست درازی کے بغیر گاڑی کو پہلا اور دوسرا گیئر لگانا آسان ہوتا۔ لیکن یہ ڈرائیور کا صوابدیدی اختیار تھا کہ گیئر بدلتے ہوئے ہاتھ کو قابو میں رکھے یا بہک جانے دے۔ صوفی چھا بڑا دانش مند تھا۔ اُس نے بیوی کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ جوان سوزوکی ڈرائیور کے ساتھ سفر نہ کرے۔ خود پہلے بیٹھے تاکہ بیٹی کو کھڑکی والی نشست مل سکے۔ بیوی اور بیٹی برقعوں میں ملفوف ہوتیں اور خوب سمٹ کر بیٹھا کرتیں۔ لیکن اس طرح سفر کرتے ہوئے شوہر کی تمام ہدایات پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا۔ بیوی کا تجربہ مختلف تھا۔ جوان ڈرائیور پھر بھی قدرے جھجک محسوس کرتے' جب کہ بوڑھوں میں سے بعض ایسے بے باک اور خرانٹ تھے کہ گیئر لیور کی تلاش میں کہیں سے کہیں جا نکلتے۔ کئی ایسے بھی تھے جو اپنا ہاتھ پہلے اور دوسرے گیئر کے لیے وقف کر دیتے' گویا تیسرا اور چوتھا لگانے کو دل بے ایمان آمادہ ہی نہ ہوتا ہو۔

صوفی چھا کی بیوی متوازن ذہن کی خاتون تھی اور اس حقیقت سے آگاہ کہ ایک اخلاق باختہ اور جنسی مریض معاشرے میں رہتے ہوئے قدم قدم پر لڑائی مول نہیں لی جا سکتی' اس لیے ڈرائیور کی ہاتھ چالاکی حد سے بڑھنے لگتی تو چپکے سے جھٹک دیتی۔ وہ معمول کے گانوں کو بھی درخور اعتنا نہ سمجھتی لیکن اگر کوئی ڈرائیور ایسی کیسٹ لگا دیتا' جیسے کسی بلیو فلم کی آواز اور صوتی اثرات ریکارڈ کیے گئے ہوں تو وہ اتنا ہی کہتی۔ ''بھائی جان! یہ گھر جا کر سن لیجیے گا۔'' یا وہ بہانہ بناتی کہ بیمار ہوں' سر درد ہے۔ مہربانی کر کے اسے بند کر دیں۔

صوفی چھا کل وقتی سماجی و نیم سیاسی کارکن تھا۔ درحقیقت وہ اپنے لیڈر کا ایک ایسا مشقتی تھا' جس سے کئی طرح کے کام لیے جاتے تھے۔ احتجاج اور جلسے

جلوسوں کے زمانے میں وہ دن رات مصروف رہتا لیکن معمول کے حالات میں بھی وہ لیڈر کے آس پاس اور اُس کی نظروں کے سامنے رہا کرتا' چونکہ لیڈر کی نظرِ عنایت سے اس کے دن گزر رہے تھے' ورنہ حالت یہ ہوتی کہ "چولہے آگ نہ گھڑے پانی۔" اس لیے چھا کے ہاتھ سے کلاشنکوف لے کر جھاڑو تھما دیا جاتا' تب بھی وہ ذرا تامل نہ کرتا۔ اس کے فرائضِ منصبی میں سب سے زیادہ مرغن اور لذیذ فرض یہ تھا کہ وہ دن بھر لیڈر کے حصے کی خوراک جزو بدن بناتا رہے۔ لیڈر ہاؤس میں اور جہاں کہیں بھی دعوت ہوتی' لیڈر ماسوائے پرہیزی غذا' سلاد اور چند ہلکی پھلکی اشیا کے اور کچھ نہیں لیتا تھا۔ میٹھے اور نمکین سے بھی منع تھا۔ صوفی چھا کا بدن اسی لیے بھینسے کی طرح گٹھا ہوا تھا۔

لیڈر خواب گاہ میں جاتے ہوئے صوفی کو گھر جانے کا اشارہ دے دیا کرتا تو وہ اپنے بال بچوں میں لوٹ آتا' جہاں اسے صرف رات گزارنا ہوتی تھی۔ مختصر مکانیت پر مشتمل گھر میں بہت سے سربستہ راز ازخود ہی طشت از بام ہو جایا کرتے۔ یہاں کسی ایک کے شکم میں ہونے والی گڑگڑاہٹ بھی دوسروں کو متوجہ کر لیتی۔ بوڑھے نابینا اور نحیف و نزار والدین نے باغ ہستی سے تقریباً اسّی اسّی پھول توڑ رکھے تھے لیکن اب ان کے خمیدہ جسم پھولوں سے بھرے بھاری ٹوکرے اُٹھانے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ ہر مکالمہ ایک ہی جملے پر اختتام پذیر ہوتا۔ "ہائے! کب مریں گے؟" جی جی کر تھک جانے کے باوجود تجسس میں کمی نہیں ہوئی تھی۔ گھر میں وقوع پذیر ہونے والی ہر سرگرمی کا بچشم خود نظارہ کرنے کے لیے ہر وقت بے چین رہتے اور آنکھوں پر دھرے ہاتھ کے چھجے سے بھی مطلوبہ منظر بصارت میں نہ اُترتا تو منہ پورے کا پورا کھول دیتے اور سوال پر سوال کرنے لگتے۔ "کیا ہوا ہے؟ کون ہے؟ کیا بات ہے؟ کوئی ہمیں بھی بتائے کیا ہو رہا ہے؟" ضعفِ بصارت نے دونوں بزرگوں کی فطرت میں جاسوسی عنصر کوٹ کوٹ کر بھر دیا لیکن

ستر پوشی اور حیا کی مروجہ حدود و قیود فہم و ادراک کی سکرین پر دھندلا چکی تھیں۔

والدین کے علاوہ گھر میں صوفی چھا کی بیوی تھی' جس سے نصف درجن بچے پیدا ہو چکے لیکن اضافے کا عمل بدستور جاری تھا۔ بیٹی سب سے بڑی تھی اور محض تجربے کی بنیاد پر آدھی یونی دائی بن چکی تھی۔ ضرورت صرف اس امر کی تھی کہ محکمۂ صحت کے حکام اس کا پریکٹیکل اور ٹیسٹ انٹرویو لے کر مڈوائف کی سند عطا کر دیتے۔ صوفی چھا کو نہ جانے کیا مسئلہ درپیش تھا کہ ہڑک ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ ماں باپ رات بھر کھانستے جاگتے اور ذرا ذرا سے کھٹکے پر انکوائریاں کرتے۔ "کیا ہوا ہے؟ کون ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟" بچے بھی کروٹیں بدل بدل کر خفتہ گھڑیوں کو جھنجھوڑ ڈالتے۔ صرف بیٹی کا طرزِ عمل ہی موافق تھا' جو سخت حبس کے باوجود چادر اوڑھے ساکت و جامد پڑی رہتی۔

صوفی کے لیے گھر کے اندر' چھت پر یا گلی میں سونا ایک ہی طرح کا پیچیدہ عمل تھا۔ چونکہ اردگرد دو دو تین تین منزلہ مکان تھے' جن سے روشنی کی کرنیں مسلسل اس کی نگرانی کیا کرتیں۔ لیکن در پہ آزار ان تمام عوامل کو وہ جُل دے جاتا تو سکون سے چھت صحن یا گلی میں چارپائی ڈال کر صرف دھوتی اڑسے سو جایا کرتا۔ صبح منہ اندھیرے دھوتی سنبھال کر باندھتا اور اندر آ کر بے چھت اور بے در کی بیت الخلا کی کوتاہ قامت دیوار پر پانی سے بھرا لوٹا رکھ کر کچھ اصلی نقلی کھانسی کے ملغوبے سے غلغلہ بلند کرنے لگتا۔ گویا Toilet in use ہونے کا سندیسہ نشر کر رہا ہو۔

بیت الخلا سے استفادہ کرنے والے کے لیے دیوار پر دھرا بھرا ہوا لوٹا ایک خاموش چوکیدار کا کردار ادا کیا کرتا۔ ویسے بھی اہلِ خانہ نے یہ وصف اپنا رکھا تھا کہ لیٹرین کی طرف بڑھتے ہوئے پاؤں سے آہٹ اور حلق سے خرخراہٹ بلند کیا کرتے' تاکہ لوٹے کی دوہری افادیت کا کوئی منکر اگر اندر جانے کی غلطی کر چکا ہے تو جواباً کھنکار کر اپنی موجودگی کا اعلان کر سکے اور اچانک چھاپا مار کر اُسے چھوٹی سی غلطی کی اتنی بڑی

سزا نہ دی جائے۔

گھر کے بیشتر افراد خاصے ٹرینڈ تھے' اس لیے بیت الخلا کے معاملے میں کسی بے احتیاطی کا ارتکاب کبھی کبھار ہی ہوا کرتا تھا۔ تاہم مہمان آ جانے کی صورت میں بعض اوقات گھپلا ہو جاتا' جب ان میں سے کوئی کوتاہ اندیش' لوٹا دیوار پر رکھنے کی بجائے اپنی آسان دسترس میں رکھنا زیادہ ضروری خیال کر لیتا۔ انجام کار اچانک چھاپا پڑ جانے پر رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا۔ ہر کوئی ایسے گھپلوں کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس لیے محتاط فطرت مہمان صرف لوٹے پر بھروسا کرنے کی بجائے کسی ہوشیار بچے کی خدمات بطور گارڈ مستعار لے لیا کرتے' جو باہر چوکنا کھڑا رہتا اور محض شک بھی گزرتا کہ کوئی اس طرف بڑھ رہا ہے تو بلند آواز سے انتباہ کرنے لگتا۔ ''ادھر مت آئیں۔ خبردار۔ اندر فلاں ہے۔''

لوٹا اس گھر کی دوہری خدمت سرانجام دے رہا تھا۔ طہارت کے ساتھ ساتھ وہ چوکیدارہ بھی کیا کرتا۔ لیکن اس بے جان شے کے علاوہ دوہئی والے پڑوسیوں کا لڑکا بھی بیشتر وقت اپنے گھر کی چھت پر سے بیت الخلا پر نگاہ رکھا کرتا۔ صوفی جیھا چونکہ بے حیائی کے خلاف جنگ لڑ رہا تھا' اس لیے بیوی نے بیٹی کو سختی سے منع کر دیا کہ خبردار' باپ سے ایسی کوئی بات نہ کرے۔ وہ جوشیلا ہے' خواہ مخواہ طبلِ جنگ بجا دے گا اور پڑوس میں ہی خون خرابہ ہو جائے گا۔ بیٹی سمجھدار تھی' اس لیے حتی الوسع کوشش کرتی کہ رات کے اندھیرے میں ہی جملہ فطری مراحل سے گزر لیا جائے۔ اگر دن کو افتاد آن ہی پڑتی تو بیت الخلا پر اُلٹی چارپائی کی چھت ڈال لی جاتی۔

صحن کے دوسرے کونے میں رسّی باندھ رکھی تھی' جس پر بستر کی چادر ڈال کر تکون نما غسل خانہ تیار کر لیا جاتا۔ گھر کے چھوٹے بڑے مرد حضرات' جب جی چاہتا بالٹی بھر کو کونے میں رکھتے اور چادر تان کر فرحت بخش غسل کے مزے لوٹ لیا کرتے۔

لیکن ہر عمر کی خواتین زیادہ تر اس نعمت کے لیے ترسا ہی کرتیں۔ تاہم بیگم صوفی کو فوقیت حاصل تھی۔ حبس اور پسینے سے جامہ بدن سے چپک جایا کرتا اور انسانی گوشت کے گلنے کی سی بدبو کئی گز دور تک مار کرنے لگتی تو نمک اور قلمی شورے سے پوتے ہوئے لباس سے نجات حاصل کرنے کا حتمی فیصلہ کرلیا جاتا۔ رات کے کسی پہر گھر میں ہنگامی صورتِ حال نافذ ہو جاتی اور پُر اسرار سرگرمیوں کا آغاز ہو جاتا۔ صحن کے کونے میں چادر تن جاتی اور نفیس طبع صنفِ نازک بدن کی مکمل صفائی ستھرائی کے جملہ مراحل سے شاداں و فرحاں ہو کر نکلتی تو صحن میں گندھک پوٹاش کی سی ہلکی بُو پھیل جاتی۔ گویا بامراد ہونے پر پھلجھڑیاں چھوڑی گئی ہوں۔ بزرگِ محترم کی تفتیشی حس بیدار ہو جاتی۔ پوچھتے۔ ''یہ کیسی بُو ہے؟'' بہو جواب دیتی۔ ''ابا جی! دوائی کی ہے'' ...... ''کون سی دوائی؟ کہاں چوٹ لگی؟ کس نے لگائی ہے دوائی' کون بیمار ہے؟'' بزرگ تفتیش کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے مزید سوال کرنے لگتے۔ ساس حواس میں ہوتی تو سرتاج کو بُری طرح ڈانٹ کر کہتی۔ ''چپ کر۔ ہر بات پوچھتا ہے۔ مت ماری گئی ہے۔'' اس طرح بہو کی خلاصی ہو جاتی۔

دوبئی والوں کے لڑکے کو دیوار پر رکھا لوٹا مرغوب تھا لیکن یہ دغا باز بعض اوقات مغالطے میں ڈال دیا کرتا اور زمانے بھر سے چھپ کر لگائی گئی ٹکٹکی اکثر رایگاں چلی جاتی۔ اُسے رات کے اندھیرے میں بالٹی سے مگ کے ٹکرانے کی آواز اور پانی کی ہلکی پھلکی شرشر بھی بے چین کر دیا کرتی۔ وہ اپنی نوجوان پڑوسن کی فریب کاریوں کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ رات پردہ پوش ہوتی ہے۔ یہ نسلِ انسانی میں سے بیشتر کے لیے ایک ایسی نعمت ہے کہ اگر خالق کائنات نے عطا نہ کی ہوتی تو حیا جیسی کسی معاشرتی قدر کا تصور بھی نہ ہوتا اور کوئی بھی ''صوفی چھما'' فحاشی کے خلاف فعال تنظیم چلانے میں اس قدر سرگرم نہ ہوتا۔

تنظیم کے دفتر میں چائے پانی کے علاوہ قومی و علاقائی اخبارات و جرائد پڑھنے کو ملتے۔ لیڈر کی سرپرستی میں باقاعدگی سے شائع ہونے والا ہفت روزہ ''حیا'' بھی سب کارکنوں کی توجہ کا مرکز بنا رہتا' جس میں تنظیم کے کارہائے نمایاں کو تصاویر کے ساتھ بھرپور کوریج دی جاتی۔ صوفی جھما کے انفرادی کردار کو زیادہ اُجاگر کیا جاتا۔

مطالعہ کے بعض سائیڈ ایفیکٹس بھی ہوتے ہیں جو صوفی جھما پر خصوصاً بُری طرح اثر انداز ہو رہے تھے۔ کچھ کالم نگار اور صحافی حضرات نام لیے بغیر اکثر ہرزہ سرائی کیا کرتے۔ آج بھی صبح صبح ایک ایسی ہی تحریر زیرِ بحث رہی۔ لکھا تھا کہ ملک و قوم کو لوٹ کر حرام کی دولت کے انبار لگانے والے سب سے بڑے بے حیا ہیں۔ فحاشی اور بے حیائی کا قلع قمع کرنے کے لیے اشد ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے چند ہزار بے حیاؤں کو گرفت میں لے لیا جائے' جنہوں نے کروڑوں عوام کے سر سے چھت' تن سے مناسب لباس اور منہ کا نوالہ چھین لیا ہے۔ لیڈر کی زیرِ تکمیل محل نما کوٹھی کا ذکر تھا' جس پر لاگت کا تخمینہ سوا دو کروڑ کے لگ بھگ بتایا گیا۔ ماسٹر بیڈ سے متصل باتھ روم کے بارے میں تفصیلات درج تھیں کہ کم و بیش دو لاکھ روپے کی رقم سے اس کی تزئین و آرائش مکمل ہوئی ہے۔ پچھتر ہزار روپے کی گولڈ کروم ٹونٹیاں نصب کی گئی ہیں۔ مزید لکھا گیا کہ ان لوگوں کی لوٹ مار کی یہ ایک ادنیٰ سی مثال ہے جو آزادی سے پہلے ساڑھے چار مرلہ پر بنے معمولی مکان میں رہائش پذیر تھے۔

لیڈر کے ذاتی باتھ روم میں لگی ٹونٹیوں میں سے صرف ایک کی جتنی قیمت بتائی گئی تھی' صوفی جھما اسے دل ہی دل میں دہرا کر حیران ہو رہا تھا۔ اُس کے گھر میں لگی پلاسٹک کی واحد ٹونٹی پانچ روپے میں ملتی تھی' جس سے ڈرم' ٹب اور دیگر برتنوں میں جمع کیا ہوا پانی بذریعہ بالٹی اور لوٹا اوپن ایئر باتھ روم اور بیت الخلا تک سفر کیا کرتا۔ صوفی

نے کئی بار تخمینہ لگوایا تھا۔ غسل خانے کے لیے ایک اینٹ کی دو دیواریں اور لیٹرین پر چھت اور صرف دروازہ لگوانے پر جتنی لاگت بتائی گئی تھی' وہ لیڈر کے ماسٹر باتھ کی ایک ٹونٹی کی قیمت سے کہیں کم تھی۔

سوا دو کروڑ روپے میں صرف ایک گھر' جس میں چند نفوس پر مشتمل کنبے نے خادموں کی فوج کے ہم راہ رہنا ہے۔ سوا دو کروڑ روپے کی خطیر رقم' جس سے کم از کم اتنے غسل خانے بن سکتے تھے کہ جوان بیٹیوں کے تقریباً پچیس ہزار باپ زندہ درگور ہونے سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

آج صبح ہی صوفی کے ساتھ ایسا حشر ہوا کہ مر جانے کو جی چاہ رہا تھا۔ جس بنی نے پورا گھر سنبھال رکھا تھا' بے دام اور بے زبان انتھک غلام کی طرح خدمت کرتی' اندر ہی اندر سے بنی کے ساتھ بے پناہ محبت ہونے کے باوجود صوفی کا دل چاہا کہ کاش وہ دنیا میں نہ آئی ہوتی۔ صبح وہ پانی سے بھری بالٹی آگے رکھے نہا رہا تھا تو بنی ناشتا تیار کرنے کے لیے صحن میں آ جا رہی تھی۔ پتا ہی نہیں چلا کہ رسّی پر تنی چادر کب زمین بوس ہو گئی۔ وہ اطمینان سے چوکی پر بیٹھا سر چہرے اور بدن پر صابن کا ڈھیروں جاگ چڑھائے مگ کے لیے ہاتھ بڑھا رہا تھا کہ بیوی نے آ کر بری طرح سرزنش کی اور چادر دوبارہ تان دی۔ قریب ہی اُونگھتا ہوا بوڑھا جوڑا چونکا ہو کر بیٹھ گیا اور سوال پر سوال کرنے لگا۔ ''کیا ہوا ہے؟ کس کو ڈانٹ رہی ہو؟ ہمیں بھی بتاؤ۔ کوئی تو ہمیں کچھ بتائے۔'' بہو نے واضح جواب دینے کی بجائے ٹال دیا تو واویلا کرنے لگے۔ ''ہمیں نہ کبھی کچھ بتانا۔ ہر بات ہم سے چھپاتی ہو۔ ہائے اللہ جی! اُٹھا لو ہمیں۔ تاکہ اِن کی خلاصی ہو۔''

لیڈر کو دیکھتے ہی صوفی کی رگوں میں خون کے بہاؤ کے ساتھ آگ کی تپش محسوس ہونے لگی۔ چہرہ لال بھبوکا ہو گیا' جیسے بلند فشارِ خون کے باعث دماغ

کی رگ پھٹنے لگی ہو۔ کسی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیسے اور کیوں ہو گیا۔ لیڈر گاڑی سے اُترا ہی تھا کہ صوفی چھا کارکنوں کے استقبالی ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ سیدھا بازو لیڈر کی دونوں ٹانگوں کے درمیان ڈالا اور اُلٹا ہاتھ گردن پر جما کر آن واحد میں اوپر اُٹھا لیا اور گاڑی کی پچھلی سکرین پر پٹخ ڈالا۔ ایک چھناکے سے لیڈر کا آدھا دھڑ گاڑی کے اندر گھس گیا اور بقیہ ڈکی پر پڑا رہ گیا۔ باہر نکالا گیا تو حواس باختہ اور چہرہ لہو سے تر۔ لرزتے ہوئے بولا۔ ''اوئے نمک حرام بے حیا! میرا قصور کیا ہے؟''

چوہدری

بعض لوگ اتنے غریب ہوتے ہیں کہ اس ناکردہ گناہ پر نادم سے ہوئے رہتے ہیں۔ ایلزبتھ کا گھرانا بھی جرمِ غریبی پر شرمندہ شرمندہ رہا کرتا۔ گویا کسی پہلے جنم وہ چھوٹی سی ریاست کے حاکم ہوا کرتے تھے لیکن موجودہ زندگی میں لوگوں کی نجاستیں دھو کر دو وقت کی روٹی کمانے پر مجبور ہو گئے ہوں۔ ایلزبتھ کی ماں قصبے کے کئی گھروں میں کام کرتی تھی۔ قصبہ بھی ایسا' جسے سکندرِ اعظم نے پہلی جھونک میں تباہ تو کر دیا لیکن دمِ واپسی اسے از سرِ نو تعمیر کرنے کے بارے میں نہ سوچا اور یہ دوبارہ آباد ہوا تو بڑا بے ترتیب اور ٹیڑھا میڑھا۔ شاید اسی فاتح کا کوئی آفیسر یہاں مستقلاً بس گیا ہوگا' ایلزبتھ جس کی آخری اولاد تھی۔

دنیا میں ہر آنے والا بچہ اپنے والدین کے حضور نئی طرح کے سپنوں کا گلدستہ پیش کرتا ہے۔ شاید اسی لیے بیٹی نے جنم لیا تو خداوند کا نام لے کر اسے ایک بہت بڑے ملک کی ملکہ سے موسوم کر دیا گیا۔ بچی ذرا بڑی ہوئی تو دل کے نہاں خانوں میں کروٹیں لیتے سہانے خواب کی تعبیر پانے کی نیت سے اسے سکول میں داخلہ دلا دیا' تاکہ پڑھ لکھ کر کسی بہت بڑے ملک کی نہ سہی' چھوٹی سی ریاست کی ملکہ ہی بن جائے۔

اللہ بادشاہ بھی بڑا غنی اور بے پرواہ ہے۔ جب نوازنے پر آتا ہے تو دریا بہا دیتا ہے۔ ایلزبتھ کو ایسا حُسن عطا کر دیا کہ قصبے میں فتنہ بپا ہو گیا۔ ایک نظر دیکھنے سے

یوں گمان گزرتا کہ کوئی یونانی شہزادی قتل ہو جانے کے خوف سے بیابانوں میں بھٹکتی رہی اور روپوشی کے عرصہ میں ذرا سی سنولا گئی ہو۔ لیکن جان بچانے کے لیے اب مفلسی کا بھیس بدل کر قصبے کے مضافات میں چوہدریوں کی زمینوں پر ایک کچے کوٹھے میں مقیم ہو گئی ہو۔ ہر قصبے کے مضافات میں زمینیں چوہدریوں' ملکوں اور خانوں کی ملکیت ہوتی ہیں۔ ایسے ہی چوہدریوں کے ایک گھرانے کا بیٹا سمیع اللہ آٹھویں جماعت تک الزبتھ کے ساتھ پڑھا تھا۔

سمیع اللہ ذات کا سماں تھا اور عرفِ عام میں سمی کہلاتا۔ اس کے ڈیرے پر محفلیں جما کرتیں۔ بانسری کی مدھر تانیں سنائی دیا کرتیں۔ تفسیر یوسف' سیف الملوک اور ہیر وارث شاہ بڑے اہتمام سے گائی جایا کرتی۔ سمی چوہدری کے من کی دنیا میں اُفق تا اُفق رومان پرور ہوا اٹھکیلیاں کیا کرتی۔ شاید یہ صوفی شعرا کے کلام کا فیض تھا کہ سمی کے مزاج کو عاشقانہ رنگ میں پوری طرح رنگ دیا لیکن کسی الائش سے داغ دار نہیں ہونے دیا۔

جن معاشروں کے پاس کوئی حقیقی وجہِ افتخار نہ رہے' اِن کے افراد اپنی بے مقصد زندگیوں کو حقیقی معنویت سے سرفراز کرنے کے لیے کارہائے نمایاں سرانجام دینے کی بجائے عصبیتوں کے بلند و بالا اور تاریک قلعے تعمیر کرتے ہیں اور از خود اِن میں محصور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان قلعوں میں لسانی' نسلی اور مذہبی نفرتوں کے عفریت پروان چڑھنے لگتے ہیں۔ ہر قلعہ بند گروہ' غضب ناک غنیم کی طرح مخالف پر عصبیت کے زہر میں بجھے تیروں کی بارش کرتا ہے۔ ایسی بستیوں کے مکین روحانی طور پر مر جاتے ہیں اور اُن قبرستانوں کا منظر پیش کرتے ہیں جن کی مسمار قبروں کے تابوتوں میں سے خون آشام ڈریکولے بیدار ہوتے ہیں اور محبت کے ہر جذبے کی رگ رگ سے لہو نچوڑ کر پی لیتے ہیں۔ انجام کار ان مردہ بستیوں میں انسانی عظمت کے بچے کھچے نشان بھی منہدم ہو

جاتے ہیں اور کوئی پورس زندہ نہیں بچتا' جو باہر کی کسی مقدونیہ سے آئے ہوئے طالع آزما کا راستہ روک سکے۔

تعصب کی آگ میں خوش نما جذبوں کے سبزہ زار اور گل و گلزار جھلس جایا کرتے ہیں اور نفرتوں کے موسم میں حسد اور بغض کی بدنما فصل ہی اُگتی ہے۔ تی کے گھر والوں کے پاس سوائے چوہدراہٹ کے کچھ باقی نہیں بچا تھا اور چوہدراہٹ بھی ڈیرے تک سمٹ کر رہ گئی۔ سب کچھ دشمنیوں کی نذر ہو چکا تو ان کے لیے سر اُٹھا کر چلنا محال ہو گیا اور ایک وہ لمحہ بھی آیا کہ کسی ساہوکار نے اعلیٰ حسب نسب کو گروی رکھنے کی حامی نہ بھری۔ تی نے کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور رزق کی تلاش میں اپنے ہی وطن میں پردیسی ہو گیا۔

ایلزبتھ کے پاس عہد و پیمان کے علاوہ کچھ نشانیاں بھی بچی رہ گئی تھیں۔ جن میں سے محبوب کے پھونکے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑے' سر کے بال اور تراشے ہوئے ناخن زیادہ اہم تھے۔ وہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ ہم دم زمین کے کسی ٹکڑے پر قدم جما لے تو اسے اپنے پاس بلا لے گا۔ وہ میٹرک پاس کر چکی تھی لیکن کوئی شہزادہ اس کے والدین کے حضور عرض داشت پیش کرنے حاضر نہ ہوا تو کٹیا میں جلتا آرزوؤں کا چراغ بجھنے لگا۔ تاہم ایلزبتھ کے دل کی مقدونیہ ابھی آباد تھی۔ اُسے یقین تھا کہ اس نُو نے شہر کی گلیوں کو من کا سکندر اپنے دم قدم سے آباد کرے گا تو ہر سُو جشن کا سا سماں ہو گا اور آسمانوں میں بھی چراغاں ہو جائے گا۔

رزق کی تلاش تی کو ایسے مقام پر لے آئی جہاں ایک غیر ملکی کمپنی زیرِ زمین تیل کے خزانے کھوجنے کے لیے ڈرلنگ (Drilling) کر رہی تھی۔ سائٹ پر موجود سب سے اہم شخصیت مسٹر فُرشا کی تھی جو رگ (Rig) انجینئر تھا۔ سبز آنکھوں والا ان تھک اور انتہائی مضبوط جسم کا مالک تیس بتیس سالہ وہ خوش باش امریکن اکثر مسکراتا ہوا دکھائی

دیتا۔ پہلی ہی ملاقات میں بے تکلف ہو جاتا۔ تمی حیرت زدہ تھا کہ مسٹر فروشا صرف چھ گھنٹے میں جتنا معاوضہ لیتا ہے' اتنا یہاں کا ڈپٹی کمشنر ضلع بھر کی حکمرانی کر کے مہینے بعد بھی سرکاری خزانے سے وصول نہیں کرتا۔ اسلام آباد میں کمپنی نے ہیڈ آفس کے قریب مسٹر فروشا کو محل نما کوٹھی لے کر دے رکھی تھی اور سفر کے لیے ہیلی کاپٹر ملا ہوا تھا۔ سائٹ پر بھی دیگر تعمیرات کے علاوہ اس کے لیے رہائش گاہ تکمیل کے آخری مراحل میں تھی۔ میٹنگ کے سلسلے میں ہیڈ آفس ہیلی کاپٹر سے جاتا اور جلد ہی واپس لوٹ آتا۔ وہ جینز پہنے ہاتھوں سے سر کو سہارا دیئے کھلے آسمان تلے ریت پر لیٹ جایا کرتا۔

مسٹر فروشا کو اردو اور مقامی زبان کے الفاظ بولنے اور سمجھنے کا بہت شوق تھا۔ تمی کا انٹرویو کرتے ہوئے اُس نے اس کے نام کے لاحقے ''چوہدری'' میں زیادہ دلچسپی لی۔ تمی نے وضاحت کی کہ وہ ایک باعزت لینڈ لارڈ فیملی کا چشم و چراغ ہے اور ''چوہدری'' اس کا خاندانی ٹائٹل ہے۔ گو زمینیں باقی نہیں رہیں لیکن ٹائٹل بدستور قائم و دائم ہے۔ مسٹر فروشا نے ایک بھرپور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ اُس کے والد بھی امریکا میں بہت بڑے فارم کے مالک ہیں لہٰذا وہ بھی اس حوالے سے چوہدری ہوا۔ ''فروشا چودری''۔ "We both are chodaries"

ڈرلنگ سائیٹ پر زندگی ابھی خیموں میں بسر ہو رہی تھی۔ مسٹر فروشا صبح اُٹھ کر نیکر پہنے' بیلچہ کندھے پر رکھے سیٹیاں بجاتا ہوا دور نکل جاتا۔ وہ عجیب شخص تھا۔ تمی سوچتا کہ اس سرزمین پر آباد کروڑوں لوگوں میں سے کسی نے ایسا تکلف کرنے کا کبھی سوچا بھی نہ ہوگا جس قدر فروشا تردد کیا کرتا۔ وہ خیمہ بستی سے دور نکل جاتا۔ بیلچے سے زمین میں چھوٹا سا گڑھا کھودتا اور بطور سنڈاس استعمال کرنے کے بعد مٹی سے پاٹ دیا کرتا۔ تمی کو بھی اُس نے ہدایات دے رکھی تھیں کہ جرمن شیفرڈ جوڑا تقریباً نصف کلومیٹر کی دوڑ مکمل کر لے تو فوراً ایک ڈیڑھ فٹ گہرے دو الگ الگ گڑھے کھود دے۔ تمی

جوں ہی بیلچہ چلا کر پیچھے ہٹتا تو جرمن شیفرڈ جوڑا اپنے مالک کی تقلید کرتے ہوئے فراغت پالیتا۔ بعد میں تنی یہ گڑھے مٹی سے پاٹ دیتا۔

تنی کی برادری میں کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ چوہدریوں کا بیٹا کسی گورے کی نجی خدمات پر مامور ہے جس میں اُس کا اوّلین فرض جرمن شیفرڈ جوڑے کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ اُس کی مجبوری یہ تھی کہ دور دراز شہروں کی خاک چھان کر کہیں کلرکی بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ جب کہ یہاں اُسے کمپنی کی طرف سے جتنی تنخواہ مل رہی تھی وہ چار سرکاری کلرکوں کی مجموعی ماہانہ آمدنی سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ اِسی لیے اُس نے سب باتیں گھر میں نہیں بتا رکھی تھیں۔ لیکن ماں کو اِس قدر آگاہی ضرور تھی کہ بیٹا کوئی ایسا کام نہیں کر رہا جو چوہدریوں کے شایانِ شان ہوتا ہے۔ تاہم یہ امر اطمینان بخش تھا کہ بیٹے کے کام کی نوعیت جیسی بھی ہے، وہ برادری اور قصبے والوں کے علم میں نہیں اور اگر چوہدراہٹ کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لگی روزی کو لات ماردی جائے تو نوبت کشکول پکڑنے تک پہنچ سکتی ہے۔

اِدھر ایلزبتھ تصور کیے بیٹھی تھی کہ اُن موسموں کی مہک ہر سُو رچ بس گئی ہے، جس میں وعدے ایفا ہوا کرتے ہیں۔ عشق اور مُشک چھپا نہیں کرتی۔ ماں نے بیٹے کو نصیحت کی کہ پگڈنڈی کی راہ ترک کرنے سے دامن جھاڑ جھنکاڑ میں الجھ کر تار تار ہو سکتا ہے اور حشرات الارض سے گزند نہ بھی پہنچے تو پاؤں کیچڑ میں پڑنے کا احتمال رہتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو پاؤں دھو کر لباس بدل لیتا اور تب بستی کی گلیوں کا رُخ کرتا۔

تنی نے موقع غنیمت جان کر دل کا مقدمہ ممتا کی عدالت میں پیش کر دیا لیکن ابتدائی سماعت پر ہی خارج کر دیا گیا۔ اعلیٰ نسب اور مذہب کی دفعات لاگو ہوئیں اور آئندہ محتاط رہنے کے لیے سخت تنبیہہ کر دی گئی۔ حالانکہ مسلمان ہونے میں اس گھرانے کو کوئی خاص تردّد نہیں کرنا پڑتا تھا۔ جب یہ پیدا ہوئے تو کان میں اذان دے دی گئی

اور مرنے والوں کی نمازِ جنازہ ادا کر دی جاتی۔ اس کے علاوہ کچھ رسومات بصورت عید شب برات منائی جاتی تھیں۔ تاہم جب مفاد پر زد پڑتی تو اسلام کو ڈھال کے طور پر ضرور استعمال میں لایا جاتا۔ بیٹا تعلیم یافتہ تھا۔ اُس نے نظرِ ثانی کے لیے اپیل داخل کر دی اور اسلامی اصولوں کے تحت اپنے مقدمے کی پیروی کی۔ جب یہ ثابت کر دیا کہ مسلم گھرانے میں اہلِ کتاب کی آمد پر کوئی قدغن نہیں تو مقدمہ اس دلیل پر خارج ہو گیا کہ اسلام اگر مانع نہیں تو خاندانی وقار اس امر کی اجازت نہیں دے سکتا کہ "چوہڑی" ایک چوہدرانی کی بہو بنے۔

دراصل فاضل عدالت نے نسلی عصبیت پر مبنی جو فیصلہ صادر فرمایا تھا' اس کے پس پردہ کچھ اور عزائم تھے۔ جوان بیٹے کی صورت میں بہت سے خواب شرمندۂ تعبیر ہونے کی تدبیر بن رہی تھی۔ عہدِ رفتہ کی عظمت لوٹنے کے امکانات تھے۔ ڈیرے کی حدود سے کچھ آگے تک چوہدراہٹ وسعت پذیر ہو سکتی تھی۔ گویا شاہی قلعے میں مقید قلم رو آزاد ہونے کے آثار نمایاں تھے۔

ایلزبتھ کے دل میں ایک ہی سودا سمایا ہوا تھا کہ کسی نہ کسی صورت میں محبت کا بھرم رہ جائے۔ اُس نے کبھی سے ایسے دور میں بھی کبھی ترکِ محبت کا نہ سوچا جب وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح بے رحم ہواؤں کے تھپیڑوں کی زد پر تھا۔ جذبے توانا ہوں تو فاصلے سمٹ جاتے ہیں۔ شام گہری ہونے کو تھی کہ ایلزبتھ تقریباً دو سو میل کی مسافت طے کر کے ڈرلنگ سائیٹ سے قریبی بستی "جھوک سیال" کے سٹاپ پر لاری سے اتری۔ اردگرد نگاہ دوڑا کر کچھ سوچتی رہی' تب ایک فیصلے پر پہنچ گئی اور مسجد کے پہلو میں مولوی ربّ نواز سیالوی کے گھر میں داخل ہو گئی۔ اہلِ خانہ گھر آئی مہمان کی آؤ بھگت سے فارغ ہو چکے تو ایلزبتھ نے بلا جھجک کہا کہ وہ تعلیم یافتہ ہے اور بالغ بھی۔ اپنی مرضی سے اسلام قبول کرنے کا عزم رکھتی ہے۔

اگلے روز نماز جمعہ کے بعد مولوی صاحب نے بستی کی بہت سی خواتین اور بزرگوں کی موجودگی میں ایلزبتھ کو چادر اوڑھائی۔ کلمے پڑھائے اور سر پر دست شفقت رکھتے ہوئے اپنی بیٹی قرار دیا اور اتفاق رائے سے کنیز فاطمہ نام رکھا۔ اردگرد کی بستیوں سے خواتین کئی روز تک طرح طرح کے تحائف کے ساتھ کنیز فاطمہ سے ملنے آتی رہیں۔ سائیٹ پر بھی یہ خبر پہلے ہی روز ہر ملکی اور غیر ملکی فرد تک پہنچ چکی تھی۔ سمی کی ہستی اندر سے تہہ و بالا ہوگئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ماضی کی ایلزبتھ جو کم سنی سے ہی اس کی چاہت رہی تھی اور نوجوانی میں محبت بن کر دل میں سمائی رہی' اپنے عشق میں اس قدر ثابت رہے گی۔ اپنا سب کچھ نچھاور کردے گی اور ماضی پر خط تنسیخ کھینچ کر عشق کا نیا عہد نامہ تحریر کرے گی۔

سمی اور کنیز فاطمہ کا نکاح ہوا تو کمپنی کے بیشتر ملازمین نے نوبیاہتا جوڑے کو خوب تحائف دیئے۔ مسز فُروشا نے حسب عادت زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک لفافہ سمی کو تھمایا اور کہا۔

"فرام چودری فُروشا ٹو چودری سامی اللہ دی ہزبینڈ آف این ایلی گینٹ لیڈی۔"

دو ماہ بعد سمی کو ماں کا خط ملا' جس کا مضمون کچھ اس طرح کا تھا۔"اس خط کو تار سمجھو۔ بیٹھے ہوئے ہو تو اُٹھ کھڑے ہو اور کھڑے ہو تو چل پڑو۔ اُڑ کر گھر پہنچو۔ اگر دیر کرو تو میرا مرا ہوا منہ دیکھو۔" کنیز فاطمہ نے سمی کو رخصت کرتے ہوئے اتنا کہا کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے یہی سنتے آئے ہیں کہ جٹ چوہدری سے بڑا راٹھ کوئی نہیں ہوتا۔ قول دے کر نبھانا جانتا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ اصل اور نقل کیا ہے۔ کون کتنا سچا ہے۔ پیٹھ کون دکھاتا ہے۔

سمی گھر پہنچا تو کہرام مچ گیا۔ ماں اور بہنوں نے باقاعدہ سینہ کوبی کرتے ہوئے بین کیے کہ وہ لٹ گئے۔ پہلے تقدیر نے ٹھوکریں ماریں اور اب بیٹا ذلت کے

گڑھے میں دھکیل رہا ہے۔ سارے خواب چکنا چور کر ڈالے۔ چوہدری خانوادے کی ناک کاٹ ڈالی۔ کمی کمینوں سے بھی بدتر گھرانے کی لڑکی کو بہو بنا دیا۔ تمی نے دہائی دی کہ اُس نے عورت ہوتے ہوئے بھی لاج نبھائی اور میں مرد ہو کر پیچھے ہٹوں' کیا یہی مردانگی ہے؟ اور پھر جس پیشے کی بنا پر اتنی نفرت...... وہی کام اب قدرت ان کے راٹھ بیٹے سے کروا رہی ہے...... فرق صرف اتنا ہے کہ میں انسانوں کی بجائے اپنے امریکی آقا کے کتوں کا فضلہ ٹھکانے لگاتا ہوں اور کنیز فاطمہ کی ماں بھی روزی کمانے کے لیے کچھ ایسا ہی کرتی رہی۔

چوہدرانی تضحیک برداشت نہ کر سکی۔ گو وہ بیٹے کے کام کی نوعیت کو کچھ نہ کچھ سمجھتی تھی لیکن اس ذلت اور دکھ کو سربستہ راز کی طرح سینے میں چھپائے رکھنا چاہتی تھی۔ واشگاف الفاظ میں تلخ حقیقت سنی تو وحشت اچھلنے لگی۔ آنا فانا مٹی کا تیل اپنے اوپر انڈیل لیا اور دونوں جوان بیٹیوں کو بھی تر کر ڈالا۔ ماچس کی تیلی جلانے لگی تو بیٹے نے آگے بڑھ کر بانہوں میں جکڑ لیا۔

نہ جانے اس مٹی میں کیا تاثیر ہے کہ اس کے بیٹے کسی اور سے ایفائے عہد کریں نہ کریں' ماؤں سے بے وفائی نہیں کرتے۔ تریاہٹ پر بھی قربان ہو جاتے ہیں۔ چوہدری سمیع اللہ پھر لوٹ کر جھوک سیال کبھی نہ گیا۔ لیکن مولوی صاحب کو باقاعدہ رجسٹریاں وصول ہوتی گئیں اور کنیز فاطمہ کو قانونی طریقے سے طلاق ہو گئی۔ تمی ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔ بجھے ہوئے چراغ کی مانند اس میں کوئی رمق باقی نہیں رہی تھی۔ مفلوج ذہن اور بدن کے ساتھ گھر میں پڑا رہتا۔ پانچ چھ ماہ کا عرصہ اسی طرح بیت گیا۔ گھر میں کچھ نہیں بچا تھا جسے بیچ کر گزر بسر کی جا سکتی۔ صدقہ خیرات کے لیے ہاتھ نہیں اٹھتا تھا۔ تاہم فاقہ کشی کا مرحلہ آ جاتا جب در پردہ کہیں سے کوئی مدد پہنچتی۔

بعض روحیں اپنی ذات میں بڑی سچی اور کھری ہوتی ہیں۔ عشق کے اپنے ہزار

رنگ ہیں۔ یہ تہہ در تہہ کھلتا چلا جاتا ہے تو نئے نئے در وا ہونے لگتے ہیں۔ کنیز فاطمہ پر نمی کی جانب کھلنے والا ایک روزن کیا بند ہوا' بہت سی چاہتوں کے چراغ روشن ہو گئے۔ وہ عشق کی اگلی منزلوں کی جانب گامزن رہی۔ اُس کی ہستی کی ہر پرت میں پختگی سما گئی۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ذرا نہیں لڑکھڑائی۔ ہر آنے والے لمحے میں اپنے روحانی والدین اور بہن بھائیوں سے محبت سوا ہوتی گئی۔ تصوف کے بڑے گہرے راز منکشف ہوئے تو دل کو قرار آ گیا اور نہاں خانے میں ہر سُو ہوائے بسیط چلنے لگی۔ مولوی صاحب نے اُس کے اصل والدین سے رابطہ رکھا اور بیٹی سے اِس انداز میں ملاقات کروائی کہ سارے گلے شکوے آنسوؤں کے پہلے ہی ریلے میں بہہ گئے اور دل آئینے کی طرح شفاف ہو گئے۔

مسٹر فُروشا کو جس طرح سے ذہن نشین کرایا گیا' وہ ان ہدایات کی روشنی میں دو مقامی ساتھیوں کے ہم راہ عین روایت کے مطابق مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور فطری خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ اُسے فرزندی میں قبول کیا جائے۔ اُسے یہ علم ہو چکا تھا کہ ماضی کی ایلزبتھ عشق کے جس سفر پر گامزن ہے' کسی اگلی منزل پر پڑاؤ تو کر سکتی ہے' واپس لوٹ آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن کیا خبر؟ امریکہ میں بھی کہیں کوئی تخت ہزارہ ہو' جہاں کا رانجھا محض بانسری پر سُر الاپنے کی بجائے رگ انجینئر کا روپ اپنا کر جھوک سیال آن پہنچا ہو اور گرو بال ناتھ کا چیلا بننے پر مولوی رب نواز کے روبرو اسلام قبول کرنے کو ترجیح دی ہو۔

❀❀❀

مجبور

افسری کی پہلی سیڑھی سے آخری تک کا سفر مرحلہ وار طے کرتے ہوئے وہ انتہائی بلندی پر پہنچا تو ریٹائر کر دیا گیا۔ تب بھی وہ آرام سے نہیں بیٹھا۔ جن اہم سیاسی شخصیات سے مراسم بنا رکھے تھے' اُن کے لیے خوب کام کیا اور بالآخر ٹیکنو کریٹ کی نشست پر پارلیمنٹ میں جا پہنچا۔ وزارت کا مزہ بھی دو بار چکھ لیا۔ گویا اُس نے ملک و قوم کی جی بھر کے خدمت کی۔ انتظامی عہدوں پر فائز رہا اور پالیسی ساز اداروں میں بھی خدمات سرانجام دیں۔ وہ کئی کارپوریشنوں کا سربراہ رہا۔ غرض کہ حکمرانی کا کیک اُس نے کئی کئی زاویوں سے کھایا اور چکھا۔ جس کے ہر flavour اور ذائقے سے وہ پوری طرح آشنا تھا۔

زندگی بھر ملک اور قوم کی خدمت کرنے کے صلے میں جو دولت اکٹھی کی تھی' وہ اُس نے بدخواہوں کی نظروں سے چھپا کر رکھی۔ وہ اس راز سے بخوبی آگاہ تھا کہ تھڑدلے معاشرے میں اصل مالی حیثیت ظاہر کرنا خطرے سے خالی نہیں' اس لیے زیادہ تر دولت محفوظ جنت میں منتقل کر رکھی تھی۔ چونکہ اپنے وطن کے مستقبل کے بارے میں اُسے ہمیشہ ایک کھٹکا سا لگا رہا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ بہت عمیق اور بے کراں سمندر میں تیرتے ایک ایسے جہاز میں مطمئن بیٹھا رہے' جس کے بیشتر ملاح اس میں مسلسل سوراخ کیے جا رہے ہوں۔ لہٰذا صاحب نے بیک وقت کئی کئی لائف بوٹس اور جیکٹس اپنی

آسان دسترس میں رکھ چھوڑی تھیں۔

صاحب کی اولاد نے تعلیم مغربی ممالک میں حاصل کی اور وہاں ہی اپنے ہم پلہ لوگوں میں شادیاں کر کے سکونت اختیار کر لی تھی۔ بیرونی ممالک میں سرمایہ کاری کرنے کے علاوہ یہاں دارالحکومت میں ایک پلازہ اور چار کنال قطعۂ اراضی پر شایانِ شان کوٹھی بنا رکھی تھی۔ تاہم آبائی شہر کے مضافات میں چار سو کنال رقبے پر ایک باغ تھا' جس کے وسط میں شان دار گھر تعمیر کروایا تا کہ عزیز و اقارب اور برادری والے بھی اس کی شان و شوکت کے بارے میں کچھ جان پائیں۔ موسمِ گرما کے دو تین ماہ آرام سے گزارنے کے لیے سطحِ سمندر سے ساڑھے آٹھ ہزار فٹ بلند ایک خوبصورت صحت افزا پہاڑی مقام پر بنگلہ تھا۔ سمندر کے حسن کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس کے کنارے چھوٹا سا ہٹ اور ساحلی شہر میں لگژری اپارٹمنٹ خرید رکھا تھا۔

آبائی شہر میں خالصتاً جذبۂ حب الوطنی کے تحت ایک بہت ہی معیاری تعلیمی ادارہ قائم کر رکھا تھا' جس میں فیس صرف دو ہزار روپے ماہانہ تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اپنے وطن کی نوجوان نسل کو عصرِ جدید کے تقاضوں کے عین مطابق زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا جائے اور بعض منہ پھٹ لوگوں کو بک بک کرنے کا موقع بھی نہ ملے کہ ریٹائر ہونے کے بعد صاحب کا ذریعۂ معاش کیا ہے۔ ویسے اب اُسے وطن میں رہتے ہوئے ایک دھڑکا سا لگا رہتا۔ وقفے وقفے سے خواہ مخواہ کی ہاہا کار مچنے لگتی' جیسے پاگل پن کا دورہ پڑتا ہو کہ ''پکڑو جانے نہ پائے' فلاں فلاں ملک کو لوٹ کر کھا گیا۔ خزانہ خالی ہو گیا۔''

ایک طوفان بدتمیزی مچا رہتا ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ آخر جس نے عمر بھر ملک و قوم کی بھرپور خدمت کی ہے' اتنے بڑے بڑے اداروں کو چلایا ہے' کیا وہ اتنا بھی پس انداز نہ کرے کہ بڑھاپا آرام سے گزرے اور اس کی آئندہ نسلیں آسودہ زندگی بسر کر سکیں؟ ویسے اب یہاں صاحب کا دل نہیں لگتا تھا لیکن وطن کی خدمت کا جذبہ ہمیشہ توانا

رہا اور وہ سوچتا کہ نہ جانے کب قوم کو پھر سے اس کی خدمات کی ضرورت پڑ جائے' اس لیے وہ ناتا جوڑے رکھنا چاہتا تھا۔ جب بھی ملک میں کوئی سیاسی تبدیلی رونما ہوتی' وہ ایک نئے جذبے سے اس کی خدمت کرنے کے لیے غیر ارادی طور پر ہی Stand by پوزیشن میں آ جاتا۔

ان دنوں بھی صاحب ملک میں اسی لیے موجود تھا کہ کیا خبر کس لمحے اعلیٰ قیادت کو اس کی غیر معمولی صلاحیتوں اور متنوع نوعیت کے بے پناہ تجربات سے استفادہ کرنے کا خیال آ جائے۔ وہ وزیر سفیر بننے کے لیے مطلوبہ تمام تر خوبیوں کا حامل تھا اور پابہ رکاب' لیکن حکمران طبقے کی بے حسی حد سے بڑھ رہی تھی اور کسی کو ناک کے عین نیچے ایسی نابغۂ روزگار شخصیت کی موجودگی اپنی طرف متوجہ نہیں کر رہی تھی۔ وہ دارالحکومت میں کئی طرح کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ سیمنارز میں حاضر رہتا۔ مقالے پڑھتا اور تقریریں کرتا۔ ہمہ وقت خبروں میں رہنے کے لیے کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن ایوانِ اقتدار تک راہ ہموار نہیں ہو رہی تھی۔

اسی دوران تاریخ کی بدترین خشک سالی نے ملک کے کئی حصوں کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ انسانی بستیاں پانی کی ایک ایک بوند اور روٹی کے نوالے کو ترس گئیں۔ لاکھوں کی تعداد میں مال مویشی مر گئے اور انسان محض پنجر بن کر رہ گئے۔ آٹے کے ایک ایک تھیلے کے لیے انسانیت کی سرِ عام تذلیل ہونے لگی۔ غذا کے چھوٹے چھوٹے پیکٹ تقسیم کرتے ہوئے ہشاش بشاش چہرے الیکٹرانک سکرین پر روشن ہونے لگے۔ بنی نوع انسان کی بے توقیری' بے بسی اور ذلتوں کی نئی کہانیاں رقم ہونے لگیں۔

صاحب ٹی وی پر خشک سالی کے رُوح فرسا مناظر دیکھ کر تڑپ اُٹھا۔ اُس کا دل مچلنے لگا کہ کاش اسے ریلیف کمشنر بنا دیا جائے اور تمام تر امدادی رقوم اور وسائل اس کے حوالے کر دیئے جائیں تا کہ وہ ایک نئے ولولے سے اپنے مظلوم ہم وطنوں کی

خدمت کا بیڑا اُٹھا لے۔

ڈنر کے لیے وہ بیگم کے ہم راہ طعام گاہ میں داخل ہوا۔ کھانے کی میز پر حسب معمول انواع و اقسام کے ماکولات اور مشروبات سجے ہوئے تھے۔ فضا پکار رہی تھی۔ ''تم اللہ کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔'' قحط کی تصویر نے صاحب کے ذہن کو اُلجھا رکھا تھا اور وہ دل ہی دل میں مختلف منصوبے بنا تا رہا۔

بیگم سے مشورہ کیا کہ وہ اپنی مشکل کی کمائی میں سے چند لاکھ روپے کی رقم کا ڈرافٹ لے کر حاکمِ وقت کی خدمت میں حاضر ہو جائے۔ ممکن ہے اسی بہانے اسے اپنی منفرد خدمات ملک وقوم کو پیش کرنے کا نادر موقع ہاتھ آ جائے لیکن بیگم نے اتفاق نہیں کیا۔ وہ ایک ذہین اور زمانہ شناس بیگم تھی۔ اُس نے صاف صاف کہہ دیا کہ موجودہ حکمرانوں سے وہ خیر کی توقع نہ رکھے۔ لالچ بری بلا ہے۔ کیا خبر یہ مہم جوئی ''آ بیل مجھے مار'' کے مصداق اختتام پذیر ہو۔ حکمران طبقے کی نیت ابھی آشکار نہیں ہوئی لہٰذا چپکے بیٹھے رہنے میں عافیت ہے۔ کروڑوں کے سرمائے سے باغ' پلازہ اور سکول سے ہر ماہ پندرہ سولہ لاکھ سے زیادہ آمدنی نہیں ہو رہی اور مالیاتی اداروں میں پڑی رقوم پر منافع بھی سکڑ گیا ہے۔ ہمارے پاس اب دینے کو کیا رکھا ہے؟ بیگم نے بڑی رسان سے صاحب کو دیکھتے ہوئے مزید کہا کہ وہ دونوں میاں بیوی حساس طبیعت ہیں اس لیے دماغ پر زیادہ بوجھ ڈالنا مناسب نہیں۔ صحت پر بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں لہٰذا کسی خوش آئند موضوع پر گفتگو کی جائے۔

صاحب نے کچھ سوچ کر تجویز پیش کی کہ زیادہ نہ سہی' دس بیس ہزار روپے کی رقم ہی امدادی فنڈ میں جمع کروا دی جائے تا کہ قسم تو دی جا سکے کہ مصیبت کی گھڑی میں اپنے ہم وطنوں کی حسبِ توفیق مالی مدد سے گریز نہیں کیا۔ لیکن بیگم نے یہ کہہ کر تجویز مسترد کر دی کہ اتنی سی رقم سے بے چارے بدحال لوگوں کو بھلا کتنا سکھ مل جائے گا۔ اس

لیے ہمیں صرف اللہ سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ خزانہ غیب سے تباہ حال انسانوں کی مدد کرے۔ صاحب نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اُٹھائے اور بولا۔ "اے ربّ العالمین! ہم تیرے عاجز بندے بہت مجبور ہیں۔ ہمارے پاس کیا رکھا ہے؟ تو قادرِ مطلق ہے۔ میرے غریب وطن کو بارانِ رحمت عطا فرما۔ پورا بلوچستان' تھر اور چولستان جل تھل ہو جائے۔ کاریزیں اور ٹوبے اُچھلنے لگیں۔ باغات' کھیت اور چراگاہیں سرسبز و شاداب ہو جائیں۔" گھر رزق سے بھر جائیں۔ مال مویشی فربہ ہو جائیں اور مور دیوانہ وار رقص کرتے پھریں۔ بیگم نے مسکرا کر کہا۔ "ہاں! یہ ہوئی ناں بات۔ مصیبت کی ایسی قیامت خیز گھڑی خدا کے حکم سے ہی ٹل سکتی ہے۔ ہمارے دس بیس ہزار روپے سے کیا سنور جائے گا؟"

فاقہ زدہ ہم وطنوں کا غم غلط کرنے کے لیے وہ بیگم کے ساتھ درآمد شدہ تقویت بخش مشروب سے شغف کرنے لگا۔ ٹی وی پر غیر ملکی چینلز سے قحط سالی کے روح فرسا مناظر پیش کیے جا رہے تھے۔ مفلوک الحال بچے' عورتیں' مرد اور بوڑھے۔ نیم مردہ مویشی' بنجر بنی ہوئی بھیڑیں اور بکریاں۔ خصوصاً ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی ایک گائے کو کئی بار دکھایا گیا جو گردن جھکائے' پوری لمبائی تک زبان تھوتھنی سے باہر لٹکائے زمین چاٹنے لگتی۔ گویا مٹی پھانک کر معدے میں لگی آگ بجھانا چاہتی ہو۔ پھر اُسے اُن مویشیوں کی المناک موت کا سن کر بڑا دکھ ہوا جو زہریلا پودا کھا کر خودکشی کر رہے تھے۔ وہ تڑپ اٹھا۔ غم غلط کرنے کے لیے تقویت بخش مشروب کے دو تین بڑے بڑے گھونٹ حلق سے نیچے اتارے۔ بالآخر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اُسے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔ ذاتی تعلیمی ادارے کے ایڈمنسٹریٹر سے فون پر رابطہ کر کے حکم دیا کہ بچوں سے دردمندانہ اپیل کی جائے کہ وہ قحط زدہ لوگوں کے لیے دل کھول کر عطیات دیں۔

بیگم اور صاحب کے خیالات میں حیرت انگیز حد تک ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔

کئی روز کے تبادلۂ خیالات کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ غریب عوام کی وہ پہلے ہی بہت خدمت کر رہے ہیں۔ پلازہ بنا کر کم از کم اڑھائی سو خاندانوں کو براہِ راست اور ہزاروں کو بالواسطہ روزگار مہیا کر رکھا ہے۔ یہ بالائی قیادت کی کمزوریوں کا شاخسانہ ہے۔ اگر کالے سفید دھن کا بکھیڑا کھڑا کرنے والوں کی گردنیں دبوچ سکتے ہوتے تو وہ چاروں صوبوں اور آزاد کشمیر میں بھی سرمایہ کاری کر سکتا تھا' جس سے لاکھوں لوگوں کا بھلا ہو جاتا۔ معاشی بدحالی کی تمام تر ذمہ داری ٹٹ پونجیے اہل قلم پر آتی ہے۔ اب سرمایہ تو Shy ہوتا ہے۔ یہ ایسے ماحول میں پھلتا پھولتا ہے' جہاں اس سے کوئی چھیڑ خانی نہ کرے۔ ہم نے پھر بھی حب الوطنی کا دامن نہیں چھوڑا۔ کوٹھیوں میں کئی کئی ملازم بیکار بیٹھے روٹیاں توڑ رہے ہیں۔ باغ اور سکول سے سینکڑوں روزی کما رہے ہیں۔ مختلف مالیاتی اداروں میں قلیل شرح منافع پر ایک کروڑ سے زائد رقم فکس ڈیپازٹس کی صورت میں رکھ کر ملکی معیشت کو سنبھالا دیے ہوئے ہیں۔ ملکی دفاع کے معاملے میں بھی غافل نہیں رہے۔ پچاس لاکھ روپے کے ڈیفنس سیونگز سرٹیفکیٹس خرید رکھے ہیں۔ کئی طرح کے ٹیکس ادا کر رہے ہیں۔ دورانِ سروس تنخواہ میں سے پائی پائی کے حساب سے انکم ٹیکس منہا ہو کر قومی خزانے میں جمع ہوتا رہا۔ گذشتہ برسوں میں بلیک مارکیٹ سے ڈالر اور پاؤنڈ خرید کر فارن کرنسی اکاؤنٹ کھلوایا۔ ہنڈی کے ذریعے ایک کروڑ روپے کے لگ بھگ رقم بیرونِ ملک مقیم بیٹوں کو بھجوائی اور اس کے بدلے میں ڈالر بذریعہ بینک منگوائے اور اس طرح قانونی طریقے سے پلازہ کی تعمیر میں ہونے والی سرمایہ کاری کو سفید کیا۔ کرنسی کے اُلٹ پھیر میں نقصان برداشت کیا۔ گویا ذاتی خسارے پر ملکی زرِمبادلہ کے ذخائر میں اضافہ کرتے رہے۔ لیکن صلہ یہ ملا کہ فارن کرنسی اکاؤنٹ منجمد کر کے اس کے بچے کھچے ڈالر بھی دبا لیے گئے۔ اب حکومت بدلی تو کراچی والی تھوڑی سی جائیداد بھی خفیہ نہیں رکھی۔ ٹیکس ایمنسٹی کے تحت اڑھائی لاکھ روپے کی خطیر رقم قومی

خزانے میں جمع کروا دی۔ لہٰذا ملک و قوم کے لیے اس سے زیادہ مالی بوجھ برداشت کرنے کی ان میں سکت نہیں رہی۔

سکول میں زیر تعلیم پونے دو سو بچوں میں سے نوے فیصد امیر گھرانوں کے چشم و چراغ تھے۔ جن میں سے کم از کم پینتیس بچوں کے بارے میں صاحب ذاتی طور پر جانتا تھا کہ وہ کروڑ پتی گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ توقع کیے بیٹھا تھا کہ لگ بھگ ڈیڑھ دو لاکھ روپے کی رقم آسانی سے جمع ہو جائے گی۔ لیکن تین ہفتوں کی بھرپور مہم کے بعد بھی صرف تینتیس سو اکیاون روپے اکٹھے کیے جا سکے۔ صاحب کو لوگوں کی بے حسی پر رونا آ گیا۔ وہ اتنی رقم لے کر خود کس منہ سے کہیں جا سکتا تھا۔ ایڈمنسٹریٹر نے عذر پیش کیا کہ یہ رقم بھی بچوں نے اپنے ذاتی جیب خرچ سے دی ہے۔ والدین نے کوئی معقول پیش کش نہیں کی۔ سب نے یہی جواب دیا ہے کہ وہ پہلے ہی ملک و قوم کی بہت خدمت کر رہے ہیں اور بڑی بھاری قربانیاں دیتے چلے آ رہے ہیں۔ صاحب نے مایوس ہو کر ایڈمنسٹریٹر کو ہدایت کی کہ رقم امدادی فنڈ میں جمع کروا کر پریس میں خبر لگوا دے۔

اگلے روز تقریباً ساڑھے دس بجے صاحب نے باہر لان میں آ کر دیکھا کہ مالی نے کئی مزدوروں کی معاونت سے کوٹھی کے چاروں طرف کتر بیونت کر کے فالتو گھاس اور پودوں کے ڈھیر لگا رکھے تھے۔ سرسبز اور رس بھری گھاس کے ڈھیر دیکھ کر صاحب کی نظروں میں خشک سالی سے متاثرہ ڈھانچہ بنے بکروں دنبوں اور بھیڑوں کی تصویر متحرک ہو گئی۔ ایک بڑی ہی فراخ دلانہ سوچ ذہن میں اُمنڈ آئی اور وہ خود کلامی کرنے لگا۔ ''اے کاش! فاقہ زدہ بھیڑ بکریاں اس وقت یہاں ہوتیں۔''

شاعر

آج وہ جلد ہی یہاں پہنچ گیا تھا کہ پبلشر کہیں چلا نہ جائے۔ دروازہ کھول کر ہال میں داخل ہوا اور دیکھا کہ عملے کے بیشتر ارکان اپنے کام میں مگن ہیں۔ بائیں جانب شیشے کے کیبن میں سیکرٹری بھی اپنی سیٹ پر موجود ہے۔ اس کیبن سے گزر کر پبلشر کے دفتر میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ پبلشر کے دفتر کی جہازی سائز کھڑکی باہر سڑک پر کھلتی تھی؛ جس میں ایک ایسا شیشہ نصب کیا گیا تھا جس میں سے بیرونی منظر بخوبی دیکھا جا سکتا تھا لیکن باہر سے اندر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

سیکرٹری حسبِ سابق سرد مہری سے پیش آیا۔ اُس کا لب و لہجہ بظاہر مہذب ہی ہوا کرتا تھا لیکن رویہ اور انداز ایسا جیسے روبوٹ بول رہا ہو۔ وہ اپنے طرزِ عمل سے یہ عندیہ دے دیا کرتا کہ جب کہہ دیا کہ صاحب اس وقت دفتر میں موجود نہیں تو بس وہ نہیں ہیں، اس لیے مزید ایک لمحہ کے لیے بھی یہاں ٹھہرنے کا جواز نہیں رہا۔ براہِ کرم آپ تشریف لے جائیں۔ ہمیں بہت کام کرنا ہے۔ ہمارے پاس مزید ایک جملہ بولنے اور سننے کا وقت بھی نہیں۔ گو یہ الفاظ وہ منہ سے ادا نہیں کیا کرتا تھا' لیکن چہرے پر لکھے صاف پڑھے جا سکتے تھے۔

آج بھی سیکرٹری نے اپنے مخصوص انداز میں بتا دیا تھا کہ صاحب اندر موجود نہیں۔ شاعر نے محسوس کیا کہ اگر وہاں آدھا لمحہ بھی رُک گیا تو مہذب سیکرٹری کے کیبن

میں چھائی نقطۂ انجماد سے بھی کہیں کم درجے کی سرد مہری میں منجمد ہو کر ڈھٹائی کے مجسمے میں بدل جائے گا۔ وہ فوراً باہر نکل آیا اور درخت کے چھدرے سائے میں کھڑا ہو گیا۔ آج وہ تہیہ کر کے آیا تھا کہ پبلشر سے ضرور ملے گا۔ بہت بڑے درخت کے نیچے پہلے ہی خاصی بھیڑ تھی۔ موچی اور نائی کے علاوہ ایک پھل والے کا ٹھیلا تھا۔ نان کباب والے کے ساتھ ایک عورت پراٹھے بنائے جا رہی تھی اور اردگرد بیٹھے لوگ گرم گرم نوالے توڑ کر نگل رہے تھے۔ درخت کے تنے سے لگے میز پر بڑا سا آئینہ اور اُسترے قینچیاں سجی ہوئی تھیں۔ دائیں بائیں سبزی ترکاری پھل کریانہ خیاری کپڑا فرنیچر اور الیکٹرانکس کا سامان دکانوں میں بھرا پڑا تھا۔ سڑک کے پار کیپٹل پلازہ میں بینک اور کرنسی ایکسچینج کے دفاتر تھے' جن میں ملکی اور غیر ملکی سکہ رائج الوقت ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ ساتھ ہی ایک بہت بڑے جیولری ہاؤس میں سونے کے زیورات سجائے گئے تھے۔ غرض کہ ہر وہ شے جس کی کوئی تمنا کرے' بازار میں برائے فروخت رکھ دی گئی تھی۔

فٹ پاتھ پر ایک لمبی قطار میں راج مستری' ترکھان' الیکٹریشن اور رنگ ساز بیٹھے تھے' جنہوں نے اپنے اپنے ہنر کا ثبوت مہیا کرنے کے لیے اوزاروں' برشوں' کوچیوں اور شیڈ کارڈز کی نمائش کر رکھی تھی۔ غیر ہنر مند مزدور اپنے اپنے جسم لیے منتظر نگاہوں سے ماحول کا جائزہ لے رہے تھے۔

بھکاریوں نے اپنی اپنی سپیشل آئیٹم خاص طور پر نمایاں کر رکھی تھی۔ کندھوں تک پھیلا اور سینے پر لٹکا ہوا گلہڑ' کٹا ہوا ہاتھ' سوکھا ہوا بازو' کوڑھ زدہ عضو یا مسخ شدہ چہرہ قریب لا کر متوجہ کرتے اور بھیک نہ ملنے پر تحقیر آمیز نظروں سے ذلیل کر کے آگے بڑھ جاتے۔ ایک قبول صورت نوجوان بھکارن نے پوسٹ کارڈ سائز کا اپنا مخصوص وزٹنگ کارڈ شاعر کو تھمانے کی کوشش کی' جس پر حرمین شریفین کی شبیہہ کے علاوہ عبارت بھی چھپی ہوئی تھی۔ شاعر نے ہاتھ پشت پر باندھ لیے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ صدا سنائی

دی۔ ''بابو! دے اللہ کے واسطے اپنی جوانی کا صدقہ۔'' شاعر دو چار اُلٹے قدم پسپا ہو گیا۔ بھکارن ملامت آمیز لہجے میں بڑبڑاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ ''روئے فیشن کو...... بھوکا ٹھسرا۔''

شاعر نے سیاہ رنگ کے چمکتے ہوئے شیشے کے پار دیکھنے کی کوشش کی کہ پبلشر اگر واقعی اپنی سیٹ پر موجود ہے تو اسے دیکھ کر کچھ خیال کرے اور اندر بلا لے۔ لیکن اسے اپنا ہی عکس دکھائی دے گیا تو پیچھے ہٹ گیا۔ پبلشر کی نئی گاڑی بڑی شان سے کھڑی تھی اور دفتر کا AC فضا میں سے عوام الناس کے حصے کی بچی کھچی ٹھنڈک جذب کر کے جھلسا دینے والی ہوا کی صورت میں لوٹا رہا تھا۔

پہیوں والے تختوں پر بیٹھے سات آٹھ بوڑھے معذوروں نے سُر اور لَے میں یک زبان ہو کر صدا بلند کی۔ ''اللہ کے نام پر محتاجوں کی مدد کرو بابو۔''

موچی کے پاس کھڑی عورت نے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے زیرِلب تبسم کے ساتھ پرس میں سے بال پین نکالا اور بائیں ہاتھ میں لیے ہوئے میگزین پر ''پانچ سو روپے صرف'' کے الفاظ لکھے۔ شاعر کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ ہزار پانچ سو کا نوٹ وہ تب ہی دیکھا کرتا جب کہیں دُور دراز کسی صاحبِ ثروت سخن نواز کے ہاں مشاعرے کا انعقاد ہوا کرتا اور دعوت نامے کے ہم راہ یہ نوید بھی ملتی کہ اعزازیہ کے علاوہ قیام و طعام کا بھی معقول انتظام کیا گیا ہے۔ عورت ایک پاؤں سے سینڈل اتارے مخصوص تجارتی مسکراہٹ سجائے اسے دیکھ رہی تھی۔ جب کہ موچی گردن نیہوڑائے سینڈل مرمت کر رہا تھا۔ وہ اس دوران بھی گویا بزنس پروموشن سے غافل نہیں تھی۔ موچی کو اجرت ادا کر کے پشت شاعر کی جانب موڑ لی اور جھک کر تسمہ باندھنے لگی۔ بعض کاروباری لوگ یہ گُر خوب جانتے ہیں کہ سفری دکان میں سجے سودے کو کس انداز سے نمایاں کیا جائے کہ گاہک فوراً متوجہ ہو۔ لیکن محض ونڈو شاپنگ کرنے والے اور جینوئین

گاہک میں تمیز کرنے کی صلاحیت سے یکسر محروم ہوتے ہیں۔

وہ سوچنے لگا کہ یہ دنیا ایک بھری پڑی منڈی ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی دکان سجائے ہوئے ہے۔ جو بھی مال جس کے پاس ہے سرِ بازار لے آیا ہے۔ ہر طرح کے سامانِ تجارت کے علاوہ ذہنی صلاحیتیں، ہنر، جسمانی توانائیاں، رعنائیاں، حتیٰ کہ معذوریاں بھی برائے فروخت رکھ دی گئی ہیں۔ وہ کیا فروخت کرے؟ قدرت نے اسے ایک ہی سوغات عطا کی ہے۔ وہ شبنم کے قطرے کی مانند شفاف پاکیزہ اور نازک خیال کو لفظوں کی جادوگری سے مجسم صورت میں بدل سکتا ہے لیکن جو سخن فہم ہے وہ تہی دامن ہے۔ جس عہد میں وہ جی رہا ہے، اس میں اقتصادی سرگرمیاں عروج پر ہیں۔ عظیم الشان تجارتی مراکز اور شاپنگ پلازوں کا دور ہے۔ مٹی سے لے کر ہیرے تک ہر شے کی قیمت لگتی ہے لیکن زرداروں کو شعر سننے کا یارا نہیں۔ مروت میں سن لیں تو وقت کی قلت کا عذر پیش کر کے نقد داد دینے سے بھی معذرت کر لیتے ہیں۔ گویا ادھار مانگ لیا گیا ہو۔ اس دنیا کے بازار میں سخن ور ایک کھوٹے سکے سے زیادہ کچھ نہیں رہا۔

کبھی کوئی پھیری والا اپنا پراڈکٹ اسے دکھا کر خریدنے کی ترغیب دیتا تو اگلے لمحے کسی فلاحی ادارے، مسجد یا درس کے لیے چندہ جمع کرنے والا زچ کرنے لگتا۔ اس نے ایک بار پھر پبلشر کے دفتر کی جانب نگاہ دوڑائی۔ AC چل رہا تھا۔ نئی گاڑی باہر کھڑی تھی، جس پر امپلائیڈ فار کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس کا شک یقین میں بدل رہا تھا کہ پبلشر اندر ہی ہے لیکن سیکرٹری نے اسے ٹرخا دیا۔ وہ بظاہر خاصا معتبر دکھائی دیتا ہے لیکن اس کا باس جیسا بھی سفید جھوٹ بولنے کا حکم دے، بغیر کسی احساسِ ندامت کے عمل درآمد کر گزرتا ہے۔ گویا ایک معقول تنخواہ اسے جھوٹ بولنے کے عوض ہی ملتی ہے۔

پبلشر کا دفتر اس نے اندر سے دیکھ رکھا تھا۔ بہت آراستہ، کشادہ اور آرام دہ۔ باہر چلچلاتی دھوپ کے باوجود اندر گلابی جاڑوں کی سی رُت کا لطف محسوس ہوتا ہے۔

جہازی سائز کی کھڑکی میں نصب شیشے کے پار باہر کا منظر ایسے دکھائی دیتا ہے جیسے سرمئی بادل چھائے ہوئے ہوں۔ پبلشر ایک ماہر بیوپاری کی طرح ہر وقت اعلیٰ معیار کا مال بن مول حاصل کرنے کے لیے سرگرداں رہتا ہے۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں میں شریک ہوتا ہے اور جہاں کہیں کوئی ٹٹ پونجیا شاعر اچھا کلام پیش کرے' کھل کر داد دیتا ہے۔

شاعر سے پبلشر کی پہلی ملاقات گزشتہ سال یونیورسٹی کالج کے مشاعرے میں ہوئی تھی' جہاں لڑکیوں اور لڑکوں نے اس کے کلام پر خوب بڑھ چڑھ کر داد دی تھی۔ مشاعرے کے اختتام پر پبلشر نے شاعر سے اپنا تعارف کروایا اور کار میں بٹھا کر ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں لے آیا۔ خوب تواضع کی اور اس کے کلام کی توصیف میں بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ اپنے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ وہ ادب کے فروغ کے لیے کس طرح رات دن محنت کرتا ہے۔

دوسری اور تیسری ملاقات پبلشر کے دفتر میں ہوئی اور پہلے سے بھی بڑھ کر شاعر کی آؤ بھگت کی گئی۔ پبلشر نے معاشرے کی بے حسی کو موضوع بنایا۔ شاعر کی کسمپرسی پر کفِ افسوس ملتا رہا اور ادب کی ترقی و ترویج کے لیے اپنی بے مثال خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنی جیب سے مال و دولت خرچ کرنے کے ساتھ ساتھ اَن تھک محنت ہی نہیں کرتا بلکہ ایک ایک کتاب بیچنے کے لیے بک سیلرز کے نخرے برداشت کرتا ہے۔ لیکن حوصلہ نہیں ہارتا۔ پھر اس نے کتب فروشوں کی مجبوریوں کا بھی ذکر کیا کہ ادب اور خاص طور پر شاعری کا قاری چونکہ ناپید ہو گیا ہے' اس لیے شعری مجموعہ فروخت کرنا امرِ محال ہے۔ تاہم اُس نے اپنے بلند عزم و ہمت کا حوالہ دیا اور شاعر کے زرد چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا کہ وہ اُس کے کلام کو ہر صورت کتابی شکل میں محفوظ کر کے رہے گا' خواہ کتنا ہی مالی نقصان برداشت کرنا پڑے۔ شعری مجموعے کی اشاعت کا دیرینہ شوق پورا ہونے پر جو تازہ ولولہ بیدار ہوا' اس کے ساتھ ساتھ رائیلٹی کی

صورت میں حاصل ہونے والی رقم کی آس از خود دم توڑ گئی۔ گویا اُس کے دل میں پھوٹنے والی خوشی کو غم نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

اسٹام پر دستخط کر کے بیاض پبلشر کے حوالے کی اور خالی ہاتھ گھر لوٹ آیا۔ اپنی روحانی اولاد کو خوبصورت پیرہن میں دیکھنے کی آس میں وہ ایک ایک دن گن کر گزارنے لگا۔ اس دوران وہ پبلشر سے ملاقات کی کسی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جب بھی کبھی کرائے کے لیے دس بیس روپے کسی ذریعے سے حاصل کر کے پہنچتا تو سیکرٹری سے معلوم ہوتا کہ صاحب کہیں کام سے گئے ہوئے ہیں۔ وہ انتظار کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا تو اُسے بڑی سرد مہری سے جواب دیا جاتا کہ آج وہ سیدھے گھر چلے جائیں گے۔ کئی بار اس کا دل چاہا کہ وہ سیکرٹری کی پرواہ کیے بغیر آگے بڑھ کر پبلشر کے دفتر کا دروازہ کھول کر اندر جھانک لے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا اور ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ لوٹ آتا۔ اگر کہیں سے فون ملا کر پبلشر سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو سیکرٹری اس کی آواز پہچان کر صاحب کی عدم موجودگی کی خبر سنا دیا کرتا۔ کتاب کی اشاعت کے بارے میں استفسار کرنے پر اسے بتایا جاتا کہ کام ہو رہا ہے اور تکمیل پر اطلاع دے دی جائے گی لہٰذا وہ پریشان نہ ہوں۔

خوبصورت سرورق، مضبوط جلد اور اعلیٰ کاغذ پر معیاری چھپائی کی صورت میں اپنا شعری مجموعہ شاعر نے ہاتھوں میں لیا تو دنیائے دنی سے اُٹھ کر ایک عالم فخر و انبساط کی فضاؤں میں پرواز کرنے لگا۔ اپنے انمول سرمایۂ حیات کے حقوق بن مول پبلشر کو تفویض کرنے کے عوض اسے اپنی کتاب کی ایک سو جلدیں بھی گویا ایسے عطا کی گئیں جیسے بڑھے ہوئے بدنما کشکول کو فوری طور پر منظر سے ہٹانے کی غرض سے جیب کی کل ریزگاری کا بوجھ ہلکا کر کے بڑی بے زاری سے منہ دوسری جانب موڑ لیا جائے۔

اشاعتِ اوّل کے ذیل میں کتاب کی تعداد ایک ہزار ظاہر کی گئی تھی۔ لیکن

جوں جوں وقت گزرتا گیا تو اسے مختلف ذرائع سے معلوم ہوا کہ کتاب کی ریکارڈ سیل ہوئی ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء اور طالبات میں شاعر کا کلام بہت مقبول ہوا۔ نوجوان نسل محبت بھری تحریروں میں اس کے اشعار quote کرنے لگی۔ کتاب کی دنیا میں یہ خبر گشت کرتی رہی کہ تقریباً دس ہزار جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ لیکن شاعر کے تن پر وہی لباس تھا جو کم وبیش سات آٹھ سو مرتبہ ڈھل چکا ہوگا۔ ہر صبح اس کے کف کالر اور پتلون کی سلائی سے چھوٹے ہوئے دھاگے قینچی سے کاٹنے پڑتے تھے۔ دن بھر لباس کے مسکنے کا دھڑکا لگا رہتا۔ پبلشر نے وعدہ نہ کیا تاہم اتنا ضرور کہا تھا کہ اگر اس کی لاگت پوری ہوگئی تو معاہدہ سے قطع نظر وہ شاعر کی مالی معاونت ضرور کرے گا۔ آج بھی شاعر درحقیقت اسی نیت سے آیا تھا۔ اس کی جیب خالی تھی اور درپیش سفر کے لیے صرف یک طرفہ کرایہ درکار تھا۔ لیکن دل میں چوری خواہش چھپی بیٹھی تھی کہ پبلشر نے خوب کمایا' ممکن ہے اپنے کہے ہوئے الفاظ یاد آ جائیں اور محض سفر خرچ کے لیے قلیل رقم کا مطالبہ کرنے پر اس کے مرتبہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک بھاری بھرکم لفافہ پیش کردے۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ ایک چالیس پینتالیس سالہ شخص عجیب سی چال چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور اپنی خوفناک بیماری کا تذکرہ کر کے سو دو سو روپے کی امداد کے لیے اپیل کی۔ شاعر نے رُخ دوسری جانب موڑ لیا مگر سوالی سامنے آ گیا۔ ٹانگیں پھیلائیں' ذرا سا جھکا اور چادر کی اوٹ سے انسانی جلد میں لپٹا لجلجا سا فٹ بال ہاتھوں میں بھر کر اسے دکھایا اور زہر آلود لہجے میں بولا۔ "یہ دیکھو! اور خدا کا خوف کرو۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ انکار مت کرو۔ زیادہ کی توفیق نہیں تو دس بیس روپے ہی دے دو۔" شاعر نے جھرجھری لی اور بڑبڑایا۔ "اس حالت میں بھی چھوٹے چھوٹے بچے؟" وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔ "اپریشن کیوں نہیں کرواتے' سرکاری ہسپتال تو ہیں ناں۔" سوالی نے تپ کر جواب دیا۔ "مفت مشورے دیئے جاؤ۔ پلے سے کچھ نہ دینا۔"

اس اثنا میں قریب ہی ٹھیلے پر سے فروٹ خریدتے ہوئے ہشاش بشاش اور خوش حال سی وضع قطع والے شخص نے سو روپے کا نوٹ سوالی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ ٹانگیں قدرے وا کیے اس احتیاط سے آگے بڑھا کہ فٹ بال کو گزند نہ پہنچے اور نوٹ اُچک کر نعرہ ہائے داد و تحسین بلند کرنے لگا۔ ''جی او جواں مردٗ خوش رہ۔ جی او داتا۔ خدا دیتا ہے ایسے سخی مردوں کو۔ بخیل کو کیا دے؟'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اُس نے شاعر کے چہرے پر ملامت آمیز نگاہوں سے ایسے چوکے لگائے کہ وہ تاب نہ لا سکا۔

فٹ پاتھ پر چھتری تلے بیٹھے عامل نجومی نے اپنے سامنے تختی لگا رکھی تھی۔ ''فیس مشورہ پچیس روپے۔'' پبلشنگ ہاؤس کے اوپر والی منزل پر مشیر انکم ٹیکس کا بورڈ لگا ہوا تھا اور ساتھ ہی معالجِ خاص کا کلینک تھا جس کی کھڑکی اور دروازے کو بھاری پردوں سے ڈھانپ کر کسی سیکرٹ ایجنٹ کے دفتر کا سا روپ دیا گیا تھا۔ باہر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ''مشورہ کے لیے اندر تشریف لائیں۔'' شاعر سوچنے لگا کہ عصرِ حاضر میں کوئی شخص مفت میں بات کرنے کا روادار نہیں۔ فٹ پاتھ پر بیٹھنے والا بھی روپے لے کر لب کھولتا ہے۔ ایک شاعر ہی اتنی ارزاں جنس کیوں ہے کہ اظہار کے لیے کسی سامع کی تلاش میں رہتا ہے۔

شاہ دولہ کا عمر رسیدہ چوہا رال ٹپکاتا مختلف لوگوں کو زوردار ٹھپکیوں سے نوازتا اس کے قریب آ رہا تھا۔ یہاں کھڑے رہ کر وہ مزید اذیت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ٹانگیں شل ہو رہی تھیں۔ جس فارم ہاؤس پر آج رات اسے مشاعرہ میں شرکت کے لیے جانا تھاٗ وہاں طعام و قیام کے علاوہ اعزازیہ ملنے کی نوید بھی سنائی گئی تھی لیکن زادِ راہ کے طور پر درکار پچاس ساٹھ روپے کی قلیل رقم بھی جیب میں نہیں تھی۔ وہ ایک بار پھر دفتر کی کھڑکی کے قریب آیا۔ سیاہ شیشے کے پار کچھ دکھائی نہیں دیا۔ AC کی گرم ہوا چہرے پر محسوس ہوئی۔ بے چینی دو چند ہو گئی۔ دروازہ کھول کر ہال میں چلا آیا اور مردہ قدموں

سے سیکرٹری کے کیبن میں داخل ہوا تو اس پر ایسی نگاہیں ڈالی گئیں جیسے کھانے کی میز پر چھپکلی دیکھ لی گئی ہو۔ پیشتر اس کے کہ مؤدب سیکرٹری کے لبوں سے تہذیب و شائستگی میں ڈھلے ہوئے ٹھنڈے الفاظ ادا ہوتے' انٹرکام کی گھنٹی بڑے مدھر سروں میں بجی۔ اُس نے ریسیور کان سے لگایا۔ ایک لحظے کو شاعر کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور دھیمے لہجے میں کہا۔ ''اندر تشریف لے جائیں۔ صاحب بلا رہے ہیں۔''

پبلشر نے ہاتھ کے اشارے سے کرسی پیش کی اور ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو' کیسے کیسے لوگ آ جاتے ہیں۔ شاعر دل کی بات لبوں پر نہ لا سکا' تاہم درپیش سفر کا حوالہ دے کر ایک طرح سے اپنی مالی حالت کی عکاسی کر دی۔ پبلشر نرم لہجے میں بولا۔ ''آپ نے اس لیے صبح سے دفتر کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔ یوں تو قرض وصول کرنے والے بھی نہیں کرتے۔'' قدرے توقف سے دوبارہ بولنے لگا۔ ''ہم Committed لوگ ہیں۔ خلوصِ دل سے ادب کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ گم نام گوشوں سے بوریوں میں بند پڑے ایک طرح سے مردہ تخلیق کاروں کو نکال کر زندہ کیا ہے۔ لیکن ہمارا یہ جنون اُلٹا بار ثابت ہوتا ہے تو دل جلتا ہے۔ خیال آتا ہے کہ جتنی جان مارتے ہیں اور سرمایہ لگا رکھا ہے' کیوں نہ کوئی منفعت بخش کاروبار کریں۔ اسی اثنا میں اُس نے دراز کھولا' دس دس روپے کے کچھ نوٹ شاعر کی طرف بڑھائے اور کہا۔

''یار کوئی کام وام...... میرا مطلب ہے کچھ نہ کچھ کیا کرو۔''

***

تجربہ

''رنگ رلیاں مناتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے' پولیس کا کامیاب چھاپا۔'' تھانیدار شہباز عرف رنگیلا کے جاری کردہ پریس ریلیز تقریباً ایک ہی طرح کے متن پر مشتمل ہوا کرتے۔ وضاحت یوں کی جاتی کہ کچھ عرصہ سے علاقے میں غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث سماج دشمن عناصر کے خلاف شکایات مل رہی تھیں' جن کا نوٹس لیتے ہوئے ایس پی سٹی نے معاشرے کے ناسوروں کی بیخ کنی کرنے کے لیے انسپکٹر شہباز کو سپیشل ٹاسک سونپا۔ انہوں نے پولیس فورس کو چوکس رہنے کا حکم دیا۔ سادہ لباس اہل کار کئی روز سے مشکوک مقامات کی نگرانی کر رہے تھے۔ مخبر کی اطلاع ملتے ہی انسپکٹر شہباز نے بذاتِ خود ریڈ پارٹی کی قیادت کرتے ہوئے کامیاب چھاپا مارا اور ملزموں کو رنگ رلیاں مناتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا۔

''رلیاں'' خواہ کتنی ہی معصوم اور بے رنگ کیوں نہ ہوتیں' رنگیلا تھانیدار ان میں ازخود منکوں رنگ انڈیل کر رنگین بنا لیا کرتا۔ اُس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ رنگ رلیاں منائی جا چکی ہوتیں یا ابھی زیرِ غور ہی کیوں نہ ہوتیں' پریس ریلیز وہی پروفارما ٹائپ ہی ہوا کرتا' جو غالباً سرکاری پیسہ اور وقت بچانے کے لیے اس نے ایک بار ڈھیروں سائکلو سٹائل کروا رکھا تھا اور بوقتِ ضرورت وحسبِ موقع' نام مقام تاریخ اور وقت کا اندراج کر کے جاری کر دیا جاتا۔ گویا رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا رنگ دینا اُسے بہت مرغوب تھا۔ بلکہ وہ کچھ ایسا بے صبرا ثابت ہوا تھا کہ بے وقت راہ چلتے' بظاہر

بے وقعت دکھائی دینے والے انجام سے غافل کسی جوڑے کو روک کر اپنا پسندیدہ الزام دھر دیتا تو شرعی میاں بیوی ہونے کے باوجود اُن کے چہروں کا رہا سہا رنگ بھی اُڑ جاتا۔

رنگ رلیاں منانا شاید رنگیلے تھانیدار کا اپنا پسندیدہ مشغلہ تھا' اس لیے ادھوری یا زیرِ غور خالی خولی مجوزہ رلیوں میں بذاتِ خود حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے ہمہ وقت کمر بستہ ہوا رہتا اور اگر یہ فی الحقیقت منائی جا چکی ہوتیں تو وہ توسیع پروگرام پر عمل پیرا ہونے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ انہی رنگ رنگیلی خصوصیات کے باعث وہ رنگیلا تھانیدار کے نام سے مشہور تھا اور اپنی اس ''شہرت'' پر کبھی شرمندہ نہیں ہوا' بلکہ بے تکلف حلقوں میں اُسے اسی نام سے پکارا جاتا' جس پر وہ خوش ہوا کرتا۔ لیکن جب وہ خالص پاک میڈ تھانیداری کا مظاہرہ کرنے پر اُتر آتا تو رنگیلا سے یکسر جلاد کا روپ اختیار کر لیتا۔

مصورِ کائنات نے انسانی چہرے پر ''منہ'' کھانے پینے اور گفتار کے لیے تخلیق کیا ہے۔ نظامِ تنفس بھی کم و بیش اسی کا مرہونِ منت ہے۔ گویا یہ انسانی زندگی کی بقا کی علامت ہے۔ لیکن شہباز تھانیدار جب فحش گالیاں اُگلنے لگتا تو یوں گمان گزرتا کہ اس کا منہ صرف اور صرف مغلظات کا مخرج ہے اور اس کا اور کوئی مصرف نہیں۔ انسانی منہ نہیں بلکہ عرصے سے بلاک ہوئی بڑی موری کا دہانہ کھل گیا ہے۔ اُس نے یہ علت کچھ اس سنجیدگی سے اپنی شخصیت کا حصہ بنا رکھی تھی' جیسے پولیس سروس کے لیے حقیقی قوت کی مظہر اور تھانیدار کے بہادر ہونے کی ناقابلِ تردید دلیل ہو۔ ملزم یا مظلوم کو پاؤں کی ٹھوکروں میں رکھ کر سینہ پھلا لیتا اور غلیظ پر غلیظ ترین گالی کا مسلسل اضافہ کرتا چلا جاتا۔ تفتیش کے سلسلے میں صفائی طلب کرنے کی غرض سے وہ سرے سے کوئی سوال ہی نہ کرتا۔ مغلظات کی بوچھاڑ میں ایسی ہیبت چھا جاتی کہ دشنام گزیدہ کی زبان گنگ اور جسم شل ہو جاتا۔ وہ دل ہی دل میں اس کارساز کے حضور سجدہ ریز ہو کر فریاد کرتا کہ تھانیدار کی گالیوں کا سناک کسی طور ختم ہو تو اصل معاملے پر بات کا آغاز ہو سکے۔

حضرتِ انسان کی ماں بہن اور بیٹی جیسے ہر مقدس رشتے کا نچا ہوا جسد برہنہ منظر نامے پر نمایاں ہو جاتا۔ شرفِ انسانیت کو ایسے پامال کیا جاتا کہ دھجیاں فضا میں بکھر جاتیں۔ ہر سُو تعفن پھیل جاتا۔ ابلیس شرمسار ہو کر الامان الحفیظ کا ورد کرنے لگتا۔ ملائکہ دل گرفتہ ہو کر رُخ موڑ لیتے اور عرشِ بریں کی جانب ملتجی نگاہوں سے دیکھنے لگتے۔ مسخ شدہ آدمیت آرزو کرتی کہ آسمان ٹوٹ پڑے۔ ذلت و رسوائی سے ابدی نجات حاصل ہو۔ لیکن آگ برستی اور نہ ہی اوپر سے کوئی عذاب نازل ہوتا۔ تھانیدار کا تکبر مزید توانا ہو جاتا اور الف ننگا ہو کر بے ہنگم انداز میں ناچنے لگتا۔

چیونٹی کی جان پر بھی بن جائے تو وہ اپنی سی کر گزرتی ہے۔ شہباز نے تھانیداری کے زعم میں کسی کی ایک نہ سُنی۔ اہلِ خانہ نے لاکھ منت سماجت کی کہ وہ سوئی ہوئی ہے۔ اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں لیکن وہ گالیاں بکتا ہوا اندر گھستا چلا گیا۔ کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑایا اور پھر اس قدر زور سے دھکا دیا کہ چٹخنی اُکھڑ گئی۔ گُڈی ایسے بے سدھ ہوئی پڑی تھی جیسے مر چکی ہو۔ شہباز گرجنے برسنے لگا۔

''اُٹھ تیری...... نواب زادی۔ نیند کے مزے لوٹ رہی ہے۔ گھر والے دتے رکھوالی کر رہے ہیں۔ ان کی ماں...... میرا راستہ روکتے ہیں۔ حرام کی نسلیں...... اُٹھ تیری...... تین گھنٹے پہلے کہہ دیا تھا تیرے بھائی دتے کو۔ کیا سمجھ رکھا ہے مجھے۔ میں تھانیدار ہوں۔ تمہاری ماں کا کھسم، خاکروب نہیں ہوں اس گلی کا۔ کہاں گیا ہے وہ بھڑوا۔ اُسے وارننگ دی تھی کہ تمہیں رنگ محل پہنچائے۔ اُس نے اپنے یار ''چمکی'' کے بھائی سے عبرت نہیں پکڑی۔ نخرہ دکھایا تھا انہوں نے تو کیا حشر ہوا۔ پورے محلے نے سٹوری اُٹھائے رکھی۔ کدھر گیا ہے وہ بہن کی دلالی کرنے؟''

شہباز نے گُڈی کو بازو سے پکڑ کر بڑی بے دردی سے کھینچا تو وہ دھم سے نیچے گر گئی۔ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی لیکن اگلے ہی لمحے اس پر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا۔ تاہم

مدہوشی کے عالم میں چہرے پر سے بال ہٹائے اور نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ رت جگے اور نشے سے آنکھیں خون آلود پانی میں ڈوبی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ تھانیدار کو سامنے پا کر بھی اس کے حواس بحال نہیں ہوئے۔ خمار آلود لہجے میں بڑبڑائی۔ ''سونے دے ناں ں ں ں۔'' اور وہاں نیچے ہی دراز ہو کر کروٹ بدل لی۔ شہباز نے پشت پر ہلکی سی ٹھوکر لگائی اور بولا۔

''اُٹھ تیری...... رات بھر رنگ رلیاں منائی ہیں تو میرے باپ پر کون سا احسان کیا ہے۔ مال کمایا ہے ناں۔ کنجری کے نخرے تو دیکھو۔'' اُس نے گُڈی کو بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھایا اور بیڈ پر بٹھا دیا۔ گال پر ہلکی سی چپت لگائی۔ اُس نے آنکھیں پوری طرح کھول دیں اور کھڑی ہو گئی۔ لیکن لڑکھڑا کر بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ جسم سنبھالا نہیں گیا۔ دونوں ہاتھوں سے بیڈ کی پٹی کو تھام لیا اور تھانیدار کو غور سے دیکھا تو ہوش میں آ گئی۔ تلخ لہجے میں بولی۔ ''کیا بات ہے؟ ایسے کیوں گھس آئے ہیں میرے کمرے میں؟''

''چل اُٹھ...... تیری...... بڑی آئی سوال کرنے والی' لاٹ صاحب کی بچی...... ماں کی...... اُٹھو! جلدی تیار ہو کر رنگ محل پہنچو۔ جانتی نہیں ہو مجھے؟...... اِدھر ہی طبیعت سیٹ کر کے رکھ دوں گا راج کماری کی۔'' تھانیدار نے دانت پیستے ہوئے انتباہ کیا...... تھانے سے کچھ ہی فاصلے پر اُس نے ایک عمارت حاصل کر رکھی تھی جو اس کا نجی عقوبت خانہ تھا اور ساتھ ہی ساتھ عشرت کدہ بھی' جسے رنگ محل کا نام دے رکھا تھا۔

گُڈی کے گھر والے دروازے سے باہر دیوار سے لگے سہمے پڑے تھے۔ ماں خوف سے کانپ رہی تھی لیکن بھائی غائب تھا۔ گُڈی نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ ''رنگیلا جی! آج معافی دے دو۔ مجھ میں رتی بھر ہمت نہیں۔ مر جاؤں گی۔ بیگانے پُوت ایک ایک پیسہ وصول کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اِشتوری رات بھر نیچے نہیں آئی۔ میں انسان ہوں۔ پہلے کبھی انکار کیا ہے؟''

تھانیدار نہیں مانا اور بضد رہا کہ وہ انکار سننے کا عادی نہیں' اس لیے کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ لہٰذا ایک دو گھنٹے میں نہا دھو کر رنگ محل چلی آئے ورنہ اگلی چند راتیں حوالات میں گزارنے کے لیے تیار رہے۔ پیشتر اس کے کہ وہ واپسی کے لیے مڑتا' گُڈی نے ہاتھ پکڑ کر روک لیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

''شہباز خان! یہ مصیبت اگر خدا نے میرے ساتھ لگا دی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ شہر بھر میں اکیلی گُڈی ہی نہیں۔ اللہ کے واسطے میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ آج مجھ میں ذرا سکت نہیں۔ خواہ مخواہ میرا خون اپنے سر نہ لیں۔''

''چل تیری...... ایک پدی کے خون سے شہباز خان تھانیدار کا کیا بگڑ جائے گا۔ زیادہ نخرے نہ دکھا۔ اتنی نازک بھی نہیں ہو۔ تم نے وہاں کچھ نہیں کرنا۔ کوئی کنگرہ نہیں گرے گا تمہارا۔ کل پوری کی پوری گھر واپس آ جاؤ گی۔ چلو! شاباش جلدی تیار ہو جاؤ۔ تندوری ران کے ساتھ وائٹ ہارس چڑھاؤ گی تو نئی نویلی جوان گھوڑی کی طرح چھلانگیں لگاتی پھرو گی۔'' مصالحانہ انداز میں گُڈی کے گال تھپک کر کہا اور کمرے سے باہر آیا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ دروازے سے باہر ڈیوڑھی میں اس کے سینئر افسر نہ جانے کب سے کھڑے سب کچھ سن اور دیکھ رہے تھے۔ ساتھ ہی گُڈی کا بھائی موجود تھا اور اُس کے چہرے سے فتح مندی کا تاثر جھلک رہا تھا۔

شہباز عرف رنگیلا پرلے درجے کا بدنہاد اور فاسق شخص تھا' جس کا سروس ریکارڈ پہلے ہی اطمینان بخش نہیں تھا۔ اُس نے اوپر سے نیچے کی سطح تک بدکردار ساتھیوں کا حلقہ قائم کر رکھا تھا' جس کی معاونت سے ماضی میں ہر گرفت سے بچ نکلتا رہا۔ لیکن اس مرتبہ بُرا پھنسا۔ اسے نہ صرف پولیس سروس سے ہاتھ دھونے پڑے بلکہ سزا بھی ہو گئی۔ جو بھی دولت سمیٹ رکھی تھی پانی کی طرح بہا دی۔ گویا کنویں کی مٹی کنویں پر لگا دی لیکن کنواں پھر بھی بیٹھ گیا۔ صرف چوری کی ایک گاڑی اتفاق سے بچی رہ گئی جو پکڑ

دھکڑ اور خواری کے سارے عرصے میں آٹو میکینک کے پاس کھڑی رہی تھی۔

طاقت کا نشہ ہرن ہوا تو شہباز نے باقی ماندہ زندگی بسر کرنے کے لیے لائحہ عمل مرتب کرنا چاہا۔ مختلف جاننے والوں کا خیال آیا۔ پی ڈبلیو ڈی کا ایکسین رشوت اور غبن کے جرم میں پکڑا گیا تو اُس نے سزا کاٹ کر تعمیراتی کمپنی کھڑی کر لی۔ جج ریٹائر ہو کر وکالت کرنے لگا۔ سالا فوج سے ڈسچارج لے کر بینک میں سیکورٹی گارڈ بھرتی ہو گیا۔ سگے چچا ہائی سکول ٹیچر تھے۔ ریٹائر ہوئے تو ٹیوشن سینٹر کھول لیا اور دو سال کی محنت کے بعد ہی اپنا سکول قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھوپھی زاد بھی پولیس انسپکٹر تھا۔ صرف اس بنا پر استعفا دے دیا کہ زیادہ شریف شخص کو یہ سروس راس نہیں آ سکتی۔ لیکن بیس دن سے زاید عرصے تک بے روزگار نہیں رہا۔ محض اعلیٰ سروس ریکارڈ کی بنیاد پر بہت بڑی تنخواہ اور شان دار مراعات کے ساتھ ملٹی نیشنل ادارے میں سیکیورٹی آفسر کی پوسٹ حاصل کر لی۔ شہباز کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے سروس ریکارڈ کا حوالہ کہیں بھی دے کر سرخرو نہیں ہو سکتا تھا۔ تب اُس نے اپنے تجربات اور صلاحیتوں کا بھرپور جائزہ لینا چاہا تو جو فلم اس کے دماغ میں چلنے لگی' اس میں جوا خانے' منشیات کے اڈے' قبضہ گروپ' جیب کتروں اور لفنٹدروں کی آماجگاہیں اور فحاشی کے ٹھکانے بہت نمایاں طور پر نظر آئے۔ گویا اُس کی زندگی کا کل اثاثہ جو بچا رہ گیا' وہ ان معلومات پر مبنی تھا جن کا تعلق شہر کے طول و عرض میں مقیم جرائم پیشہ عناصر سے تھا۔

قسمت آزمانے کے لیے شہباز میدانِ عمل میں کودا تو اسے زمانے بھر کی ابن الوقتی کا بڑا تلخ تجربہ حاصل ہوا۔ وہ جوا خانوں' منشیات فروشوں اور بدمعاشوں کے اڈوں پر گیا مگر کسی نے چائے کی پیالی بھی پیش نہیں کی۔ جہاں اُس نے چھنی ہوئی تھانیداری کے زعم میں تڑی لگائی وہاں سے دھکے پڑے۔ مزید غور و خوض کرنے کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ کسی بھی ایسے شخص کو بلیک میل نہیں کیا جا سکتا' جس کا ظاہر و باطن ایک سا ہے۔ خواہ وہ

بدمعاش ہو یا شریف۔ گُڈی کے بھائی سے مات ہونے کی اصل وجہ بھی یہی تھی کہ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق وہ خم ٹھونک کر مقابلے پر اُتر آیا اور اُس کے بجے سجائے کندھے نوچ ڈالے۔ شہباز نے اُس روز گُڈی کی ناسازیٔ طبع کا عذر رد کرتے ہوئے سخت الفاظ میں حکم دیا تھا کہ وہ ہر صورت میں دو تین گھنٹوں تک رنگ محل پہنچ جائے۔ بھائی نے اپنے ذرائع سے اعلیٰ حکام کے ساتھ قبل از وقت ہی رابطہ کر کے تھانیدار کی جانب سے دی گئی خطرناک دھمکیوں سے آگاہ کر دیا تھا۔

شہباز فطرتاً بھی شیطان کا چیلا ہی تھا' لہٰذا اِسی ہستی کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت کی اور اشیر باد حاصل کر کے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ پولیس نیٹ میں پھانسے گئے بے شمار شکار اسے یاد تھے۔ تاہم ٹیسٹ کیس کے طور پر مسعود پرویز کا انتخاب کر لیا جو تھانیداری چھوٹنے سے صرف ایک ماہ پیشتر ہی خاصے دلچسپ انداز میں دریافت ہوا تھا۔ وہ کسی نیک نام دیہاتی زمیندار خاندان کا فرد ہونے کے علاوہ بے ضرر سے سرکاری محکمے میں اوسط درجے کا افسر بھی تھا۔ ہوٹل کے کمرے سے سستی سی شراب اور گئے گزرے شباب کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تو غلیظ گالیوں کی پہلی ہی بوچھاڑ پر اس قدر خوف زدہ ہوا کہ بے عزت ہونے کی نسبت مر جانے کو ترجیح دی۔ چوتھی منزل کی بالکونی سے کود ہی گیا ہوتا۔ بھلا ہو ویٹر کا کہ لپک کر ٹانگ سے پکڑ لیا اور سب نے مل کر واپس گھسیٹ لیا ورنہ خواہ مخواہ کا بکھیڑا گلے پڑ جاتا کہ تھانیدار نے تشدد کر کے قتل کر ڈالا اور لاش ہوٹل کی عمارت سے نیچے پھینک دی۔ ملزم کی حالت کچھ ایسی ہو گئی کہ اگر اسے خودکشی کرنے کا موقع نہ دیا جاتا تو وہ دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا ہوتا۔ شہباز نے ذرا نرم رویہ اختیار کرتے ہوئے معافی دینے کا اشارہ دیا تو وہ پاؤں سے لپٹ کر رونے لگا۔ اس طرح کے کیس میں ایک ڈیڑھ ہزار روپے کی رشوت خاصی بھاری تصور کی جاتی تھی۔ لیکن شہباز کو چھ سو موقع پر ہی اور دو ہزار روپے کی خطیر رقم چوبیس گھنٹے کے اندر اندر رات

کی تاریکی میں بڑی رازداری کے ساتھ بصد شکریہ پیش کر دی گئی۔

مسعود پرویز کے ٹھکانے کا علم شہباز کو پہلے سے تھا لیکن وہ اسے کچھ اس انداز سے ملا جیسے خفیہ سرکاری مشن کی بجا آوری کے دوران اتفاقاً سامنا ہو گیا ہو۔ یہ جان کر اطمینان ہوا کہ وہ ایک خاصے محفوظ اور آرام دہ گھر میں تنہا رہائش پذیر ہے۔ بیوی بچے کبھی کبھار ہی گاؤں سے مختصر دورانیے کے لیے ملنے آتے ہیں۔ شہباز نے ماضی میں اس سے روا رکھے گئے حسنِ سلوک کا حوالہ دیا اور آئندہ کے لیے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو مسعود پرویز کی جان میں جان آئی۔ وہ اندر سے ایک کمزور انسان تھا۔ رنگیلا تھانیدار جیسے زبردست شخص کی دوستی کو باعثِ تقویت جان کر پھولا نہ سمایا۔ اُس نے یہ بھی باور کر لیا کہ عام پولیس کی بجائے شہباز اب کسی اہم خفیہ ادارے میں پوسٹ ہو گیا ہے۔ باتوں باتوں میں مسعود پرویز کو رات بھر کی میزبانی کا شرف بخشنے کی نوید سنائی تو اُس نے خوش دلی سے خوش آمدید کہا۔

شہباز نے بڑی بے تکلفی سے کہہ دیا کہ ہوٹل کے کمرے سے برآمد ہونے والی تھرڈ کلاس قسم کی بوتل نہیں ہونی چاہیے۔ وہ ہنس کر بولا۔ ''میرے چپڑاسی نے نہ جانے کہاں سے ولایتی کی قیمت پر لا کر دی تھی اور اسی نے مشورہ دیا تھا کہ ہوٹل میں کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ اسی کے ایک بیرا دوست نے بقیہ اہتمام کر دیا تھا لیکن ہوٹل کے عملہ میں سے اُن کے کسی بدخواہ نے مخبری کر دی۔ شہباز نے اُسے فاتحانہ انداز میں ہنستے ہوئے بتایا کہ مخبروں کو باقاعدہ حصہ ملتا ہے اور اگر وہ خود اسی نوعیت کی کارستانی کریں تو انہیں تحفظ دیا جاتا ہے۔ ولائتی کے حصول کے لیے اُسے بیش بہا معلومات بہم پہنچائیں اور جھجک دور کرنے کی غرض سے ہم راہ لے کر صدر آ گیا جہاں مختلف پارکنگ لاٹس میں مخصوص کار کو تلاش کرتا رہا۔ جلد ہی ایک ریستوران کے باہر سرخ کرولا کھڑی دیکھ لی تو اس پر ہاتھ رکھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں ایک ایسا شخص قریب آ گیا' جس

کی قلمیں اتنی بڑی بڑی تھیں کہ ان کی دست برد سے تھوڑی بمشکل ہی بچ پائی تھی۔
شہباز نے مسعود پرویز سے مخاطب ہو کر کہا۔

''اس سے ملو۔ یہ مسٹر ڈرم ہے۔ نام چنگا بھلا ہے لیکن یہ ڈرم کہلوانا ہی پسند کرتا ہے۔ شاید اس لیے کہ ڈرموں کی مقدار میں بھی سپلائی کر سکتا ہے۔ سارا کاروبار موبائل ہے۔ خود وائن مرچنٹ ہے اور اس کی سرخ کرونا چلتی پھرتی وائن شاپ ہے۔ یعنی کہ کشتی سے خانہ۔ ویسے یہ خود بھی بڑے پہر قسم کے گھٹے ہیں۔'' مسٹر ڈرم نے شہباز کے ریمارکس پر بُرا نہیں منایا اور مسکراتا رہا۔

ہر کاروبار کا اپنا اپنا سٹائل ہوتا ہے۔ جس طرح بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور ہیں' عام نوعیت کی دکانیں اور پھر ریڑھی یا پھیری والے' اسی طرح میڈموں کے علاوہ قدرے مستحکم حیثیت کی حامل تو کچھ بے چاری پھیری والی۔ جو سر شام حسبِ توفیق بن ٹھن کر روزی کی تلاش میں نکل پڑتی ہیں۔ شہباز کو شہر کی اہم سڑکوں کے وہ تمام سٹاپس اور کونے کھدرے ازبر تھے' جن پر برقعہ پوش پھیری والیاں کسی بھلے مانس کی آس لگائے کھڑی رہتی ہیں۔ وہ گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اپنے گوناں گوں تجربات کی روشنی میں جانتا تھا کہ اس شعبے میں ہارن کی کیا اہمیت ہے اور اس کے ذریعے کیسے متوجہ کیا جاتا ہے۔

ہارن پر لگی ہوئی بیشتر پھیری والیاں جانتی تھیں کہ رنگیلا تھانیدار اللہ کے فضل و کرم سے فٹ کانسٹیبل بھی نہیں رہا۔ لیکن انہیں شبہ تھا کہ اب بھی کہیں مفت کی ٹھگیک نہ بھگتنی پڑ جائے اس لیے صاف کنی کترا کر نکل گئیں۔ سردیوں میں سورج کو غروب ہونے کی بڑی افراتفری پڑی ہوتی ہے۔ لمبا چکر کاٹ کر وہ کمرشل ایریا کے راؤنڈ اباؤٹ کی جانب بڑھا تو تاریکی چھانے لگی تھی اور سٹریٹ لائٹس روشن ہو چکی تھیں۔ دور سے ہی اُس نے دیکھ لیا کہ شاپ سے ذرا ہٹ کر ایک برقعہ پوش کھڑی ہے۔ مخصوص انداز میں ہارن بجایا تو اُس نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ شہباز نے بڑی سرعت سے موڑ کاٹتے ہوئے

گاڑی عین اس کے پاس لے جا کر روک دی اور فرنٹ سیٹ والا دروازہ کھول دیا۔ پہلا گیئر ڈال کر کلچ دبائے رکھا۔ وہ لپک کر اندر بیٹھ گئی تو گاڑی چل پڑی۔

وہ سچ مچ کی اصلی گُڈی تھی۔ پہلے ہی لمحے میں شہباز کو پہچان گئی لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ ایک بے ساختہ قہقہہ بلند کرتے ہوئے وہ بولا۔ ''جی صدقے۔ دشمن کی خیر ہو۔ میرے سوئے بھاگ جاگ گئے۔ چھاج بتاشے بانٹوں۔ کوئی سڑک قلعی کرا دے تو گاڑی بھنگڑہ ڈالے اور میں دشمن پیارے کے سنگ ساری رات ناچوں۔''

گُڈی سنبھل گئی اور کہنے لگی۔ ''گاڑی روک دو نہیں تو میں چھلانگ لگا دوں گی۔''

''کیوں ڈر گئی ہو؟'' شہباز نے نرم اور اپنائیت آمیز لہجے میں پوچھا تو وہ بولی۔

''ہمارے پاس ڈرنے کو کیا بچا رہ گیا ہے؟ اس کام میں لاج رہی نہ پت۔ ایک جسم ہے جسے جلد یا بدیر گلنا سڑنا ہے سو اس کی پرواہ نہیں رہی۔ دوسری جان ہے' وہ کسی کے کس کام کی؟ خواہ مخواہ کوئی لینے پر تل جائے تو جی بسم اللہ۔ ہم کون سے مزے لُوٹ رہے ہیں دنیا میں۔ گٹر سے نکل کر صاف ستھری قبر میں جا سوئیں گے۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ اب مفت بری نہیں چلے گی۔ روزی کمانے نکلی ہوں۔ شریف زادی نہیں جو کسی نیک کام کے بہانے چھپ چھپا کر یار سے موج مارنے آ گئی ہو۔''

شہباز نے دونوں ہونٹ باہم پیوست کر کے تین چار مرتبہ کھولے اور جوڑے تو پپ پپ کی آوازیں برآمد ہوئیں اور وہ کہنے لگا۔ ''اوئے! دشمن جانی! تجھے قبر میں آرام سے کس نے سونے دینا ہے۔ ذرا سوچو' اگر کوئی فرشتہ اس خاکسار جیسا رنگیلا ہوا تو کیا ہوگا۔ یعنی کہ بلے بلے۔''

گُڈی پہلے ہنسی اور پھر روہانسی ہو کر بولی۔ ''چل دفع۔ قبر نہ ہوئی یہاں کا تھانہ حوالات ہو گئی۔ جہاں تیرے جیسے سٹیٹ منٹ پر سٹیٹ منٹ لینے بیٹھے ہوتے ہیں۔ خدا کا خوف کرو۔ تم گناہ گار ہی نہیں' گستاخ اور باغی بھی ہو۔ ایک نہ ایک دن مرو

گے ہی ناں! اگلے جہاں چلو تو سہی' وہاں کسی ظالم تھانیدار کا نہیں میرے مولا کا راج ہو گا۔ ہم تو ہیں ہی دوزخی لیکن جس طرح سے تمہارے کڑاکے نکلیں گے ناں' لگ لو جائے گی۔ وہاں جابر سے جابر تھانیدار بھی......"

شہباز نے قطع کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تھانیدار تھانیدار کی رٹ لگا رکھی ہے۔ یہ دور ہے ہی بڑا بھاری تھانیداروں کے لیے۔ امریکہ پوری دنیا کا تھانیدار بنا پھرتا تھا۔ پدی جتنے ویت نام نے ناک رگڑ وادی اور تم نے میرا دھڑن تختہ کروا کر رکھ دیا۔" گڈی بیچ میں ہی بول پڑی۔

"کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔ تکبر لے ڈوبتا ہے اور پکڑ ہو جاتی ہے۔ ویسے رنگیلا جی! آپ لوگ بڑے بے فیض ہو۔ نیکی برباد گناہ لازم۔ اتنی خدمت کی' وہ یاد نہ رکھی اور ذرا مجبوری ظاہر کی تو گھر میں گھس کر ماں بہن ایک کر کے رکھ دی۔ مردار خور ہو تم لوگ۔ بدبو کے بھبکے بھی اُٹھ رہے ہوں ناں' قسم سے تم لوگ پھر بھی چونچ مارنے سے باز نہیں آتے۔ کسی بھی مخلوق کا نر اتنا ظالم نہیں ہوتا۔ دو ٹانگوں والے کی کھوپڑی میں بھرا گندہ پانی ہر وقت اتھل پتھل ہوتا رہتا ہے۔ حضرت کو من میں آئی طغیانی کی موجوں سے بس کھیلنا ہے۔ بھلے یک طرفہ ہی سہی...... بڑا افسوس ہوتا ہے۔ بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ گھر میں بیری کا درخت لگانا اور پلیسے سے دوستی پالنا ضرور دُکھ دیتا ہے۔" قدرے توقف کر کے گڈی دوبارہ بولنے لگی۔

"شرافت سے گاڑی روک دیں۔ یہاں کوئی کمی نہیں۔ آپ کو کوئی اور مل جائے گی اور جو میرا مقدر ہے وہ مجھے مل کر رہے گا۔"

شہباز نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اوئے گڈی رانی! مقدر ہی ملا ہے ناں۔ قسم سے بہت خوب ملا ہے۔ لوگ ایسے ہی بھونکتے ہیں کہ پولیس والے اوّل و آخر بُرے ہوتے ہیں۔ حالانکہ ثابت ہو گیا

ہے کہ ہم بھی کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی نیکی ضرور کر گزرتے ہیں۔ آج یقیناً کوئی بھلائی کام آ گئی ہے جو تم یوں مل گئی ہو۔" گُڈی نے ٹوک دیا اور ذرا آگے کی جانب جھکتے ہوئے اُس کے چہرے پر نگاہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

"ہاں! پہلے تو تھانیداری کا بھتا وصول ہوا کرتا تھا مجھ سے، اب کس کھاتے میں گھسیٹا جا رہا ہے؟"

شہباز نے مسکرا کر جواب دیا۔ "اب تمہارے سارے واجبات لوٹانے ہیں۔ چھوڑو جو ہوا سو ہوا۔ آؤ اب پکی پکی دوستی کر لیں۔ بول! کیا خدمت کروں اپنی گڈو رانی کی؟...... مفت بری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پیشگی لے لو۔ آئندہ کے لیے بھی ساتھ چلنے کی بات کرو۔" اِس اثنا میں شہباز نے ہاتھ بڑھا کر پہلے اُس کے کندھے کو سہلایا اور پھر دائیں شانے میں انگلیاں گاڑ کر دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

"تیری...... ایسی کی تیسی...... تھانیداری گنوائی ہے تیرے پیچھے۔ رنگ محل اُجڑ گیا۔ سب کچھ برباد ہو گیا ایک ہی ہلے میں۔ اب سارے گھاٹے تجھ سے ہی پورے کروں گا۔ میڈم نہ بنا کر رکھ دوں تمہیں، تو میرا نام بدل دینا۔ تجھ جیسی بیس گُڈیاں تیرے انڈر ہوں گی۔ پڑھی لکھی ہو، ڈائیلاگ بولتی ہو، شعر کہتی ہو۔ آخر کمی کیا ہے؟"

نئی صورتِ حال سے گُڈی خوش گوار حیرت محسوس کرنے لگی تھی۔ ملاقات کے آغاز پر جو ایک خوف سا اِس کے دل میں سرایت کر گیا تھا، کافور ہو گیا۔ شانت لہجے میں بولی۔

"ہماری قسمت میں میڈم بننا کہاں۔ چار شریف لوگ ملتے ہیں تو کوئی ایک آدھ ایسا حرامی پھانس لیتا ہے کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے۔ کہتے ہیں پسینا خشک ہونے سے پہلے مزدوری ادا کر دینی چاہیے۔ ہم جیسیوں کی کمائی سے بڑھ کر مشکل اور کسی کی نہ ہو گی۔ عزت اور جان پر ظلم کر کے کماتی ہیں لیکن کئی ٹُچّی کے جنے وہ بھی ہضم کر جاتے

ہیں۔ ہمارے ساتھ جو ہوگا سو ہوگا لیکن ایسی خبیث رُوحیں اُس دربار میں کیا جواب دیں گی اور انہیں دوزخ کے کس حصے میں ڈالا جائے گا؟"

شہباز جھٹ بول اُٹھا۔ "جس حصے میں ہم بدولت رونق افروز ہوں گے۔ سانپوں اور بچھوؤں کے نرغے میں۔ کہاں کہاں سے ڈسے جائیں گے بے چارے رنگ رنگیلے۔ اوخوخوخو۔"

ویران سڑک پر مرغ یخنی والے سٹال سے ذرا آگے لے جا کر گاڑی روک دی اور بایاں بازو گُڈی کے کندھوں پر رکھتے ہوئے شہباز کہنے لگا۔ "یوم حساب کا منظر مت پیش کیا کرو کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ نامۂ اعمال اس قدر سیاہ ہو چکا ہے کہ حسن ابدال کی ساری بھٹیوں کا چونا بھی خان پور ڈیم کے پانی میں گھول کر پوتنے لگوں تو بھی کچھ سفید ہونے کا نہیں۔ خواہ مخواہ ذرا نا دھکا نا نہیں چاہیے کہ اس پر بھی دفعہ لاگو ہو جاتی ہے...... اور ہاں! اب مرنے کی باتیں نہ کیا کرو۔ مریں گے اب تمہاری روزی مارنے والے' تمہارے دشمن' سوائے میرے۔ تم جان لو کہ وہ سے لد گئے۔ ہم سے بڑا حرامی اور کوئی نہ ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ اب کوئی حرامی ضرور ملے۔ اُس کے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو کابلی کے خیمے میں گھسنے والے چور سے ہوا تھا۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں وہ شہباز ہوں جو شکار پر جھپٹنے سے پہلے اُس کی صنف نہیں پوچھتا۔"

گُڈی کی ہنسی چھوٹ گئی اور طبیعت پر چھائی یاس چھٹ گئی۔ خوش ہو کر کہنے لگی۔ "نہیں۔ اُس چوہدری کے جیسا انجام ہونا چاہیے جو ڈھول بجانے والوں کے گھر میں چھپا بیٹھا تھا۔"

شہباز نے قہقہہ اچھالتے ہوئے کہا۔ "بالکل ٹھیک ہے۔ تم پھر اُس وقت تک زور زور سے ڈھول پیٹتی رہنا جب تک چوہدری صاحب کے مزاج ہمیشہ کے لیے ٹھکانے نہ آ جائیں۔"

پونے کلیجی کی فل پلیٹ دونوں نے خالی کی اور یخنی پی چکے تو شہباز نے کہا۔

''ہاں! اب بتاؤ۔ کتنے؟...... پسینا آنے سے بھی پہلے۔ خشک ہوتا تو بعد کی بات ہے۔ ویسے یہ ہے سراسر غریب ماری۔ ایسی سردی میں پسینے کا کیا کام؟''

گڈی نے سیدھا ہاتھ آگے بڑھایا اور بولی۔

''اب زبان سے نہ پھریں۔ لائیں دو سو۔'' ویسے اصول بھی یہی ہے...... ہماری اور وکیل کی فیس پیشگی ادا ہوتی ہے۔'' شہباز نے اسے دھپ مارتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

''کیوں۔ پٹرول مہنگا ہو گیا ہے اس لیے؟ یا تمہاری رنگیں (Rings) گھس گئی ہیں اور پٹرول زیادہ کھانے لگی ہو؟ سو سے یک دم دو سو...... اتنی مہنگائی؟ یہ غریب عوام پر سراسر ظلم ہے۔ میں انجمن صارفین کے صدر کی حیثیت سے احتجاج ریکارڈ کرواتا ہوں۔ مہنگائی کی شہزادی مردہ باد۔ گڈو رانی ہائے ہائے۔''

گڈی نے ردعمل کے طور پر سٹیئرنگ کو مکا مار دیا۔ ہارن بج اُٹھا اور بولی۔

''کچھ شرم حیا کر لیا کریں۔ کبھی سو دو سو دیا بھی ہے؟ ایسے ہی منڈی کا بھاؤ سنانے لگے ہو۔ میں بھنڈیاں نہیں بیچ رہی کہ سینے پر نرخ نامہ آویزاں کر لوں۔ آبرو کا سودا کر رکھا ہے۔''

شہباز نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اوہ ظالم سوداگرانی جی! بھنڈیاں تازہ تو ہوتی ہیں ناں۔ آبرو کب کی باسی ہو چکی۔ ہاں! فریش فریش ٹوکری بھری ہوئی ہو تو کوئی بات بھی ہے۔'' گڈی نے جھٹ تبصرہ کر ڈالا۔

''فریش فریش۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ تھانیداری کی کالی کمائی ڈھیروں کے حساب سے گھر ڈالتے رہے اور اِدھر اُدھر ہر برتن میں منہ مار کر گزارہ کیا...... پتا ہے ناں

فرلیش فرلیش کا بھاؤ۔ پچاس پچاس ہزار میں نوکریاں اٹھی ہیں۔ جنہیں کچھ اعتماد تھا اور سلیقہ۔ نئے بنگلے کی قیمت پر...... چھوڑو ساری باتیں۔ سیدھی طرح کہو کہ پہلے ہی ریلے میں بہہ گئی ساری دریا دلی...... جس نے زندگی بھر لیا ہو دوسروں سے' وہ بے چارہ کیا دے گا؟ تھانیداری چھن گئی لیکن خصلت عمر بھر تیزی کی تیزی ہی رہے گی۔ سچی بات ہے میں بہت ڈر رہی ہوں کہ ابھی دے کر صبح کہیں سارے چھین نہ لو۔ جو ٹیکسی کا کرایہ ہے میرے پاس' وہ بھی۔"

گاڑی چلاتے ہوئے شہباز خالص پولیس مارکہ زبان بولنے لگا۔

"چل تیری...... ماں...... چھین کر کیا لے جاؤں گا...... تیری......" لیکن اس اثنا میں اُس نے سو سو روپے کے تین نئے نوٹ کنارے سے پکڑ کر گلڈی کے چہرے پر پھرائے اور گود میں ڈال دیئے۔ نوٹ سنبھال کر گلڈی نے کچھ الجھے ہوئے سے لہجے میں کہا۔

"یہ ماں ماں کی رٹ کیوں لگائے رکھتے ہو۔ وہ بے چاری گھر میں بیٹھی ہوتی ہیں۔ ہم خود جو حاضر ہیں سُوروں کی خدمت کے لیے۔" جواب دینے کی بجائے شہباز لفنگوں کی طرح بازاری پن کا مظاہرہ کرنے لگا۔ اُس کا انداز خوشی اور ولولے سے معمور تھا' گویا کوئی بہت بڑی کامیابی نصیب ہوئی ہو۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ہی اوپر کا دھڑ ایسے لہرانے لگا جیسے ڈانس کرنا چاہ رہا ہو۔ گاڑی ہچکولے کھانے لگی۔

o

سردیوں کی راتیں بہت جلد ویران ہو جاتی ہیں۔ بڑی طویل اور گھمبیر ہوتی ہیں۔ اپنے دامن میں بہت کچھ سمیٹ لیتی ہیں۔ سسکیاں' آہیں اور سرگوشیاں۔ نیندیں اور رت جگے۔ محبتیں اور نفرتیں۔ عبادتیں اور ریاضتیں۔ آنسو اور مسکراہٹیں۔ فسق و فجور اور نیکیاں...... رات گزر چکی تھی۔ کچھ لوگوں کی زندگیاں بھی پر وقار ماٹائپ ہوتی ہیں۔ سائکلو سٹائل سے نکلی ہوئی۔ ان پر اندراجات دوسرے کرتے ہیں۔ اپنی صوابدید پر۔

ہفتہ وار چھٹی کا دن تھا۔ مسعود پرویز اور دونوں مہمان سہ پہر تک پڑے سوتے رہے۔ میز پر تکے کباب' تلی ہوئی مچھلی اور بالٹی گوشت کی خاصی مقدار گذشتہ رات سے بچی پڑی تھی۔ تاہم بوتل سے آخری قطرہ بھی انڈیل لیا گیا تھا۔ شہباز کو جلدی نہیں تھی لیکن گڈی کو گھر پہنچانا ضروری تھا۔ مسعود پرویز ابھی تک سرمستی کے عالم میں تھا۔ وہ اس طرح کے خواب اکثر دیکھا کرتا تھا لیکن ہوٹل والے سانحہ کے بعد دوبارہ کبھی ہمت نہیں ہوئی کہ انہیں عمل سے تعبیر کرے۔ گڈی تیار ہونے کے لیے واش روم میں چلی گئی۔ مسعود پرویز نے نشاط انگیز نگاہوں سے شہباز کو دیکھتے ہوئے کیف و مستی سے معمور لہجے میں کہا۔ ''تھینک یو سر۔ تھینک یو ویری مچ۔'' شہباز نے اُسے آنکھ مارتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔ ''خوش؟'' مسعود پرویز نے ایک بھرپور انگڑائی لے کے کروٹ بدل لی اور بولا۔ ''زبردست!'' اور پھر تکیے کے نیچے سے پرس نکال کر اُٹھ بیٹھا۔ شہباز کی آنکھوں کے سامنے لا کر اس کی زپ کھولتے ہوئے بڑے والہانہ انداز میں کہنے لگا۔ ''روپیہ پیسہ کبھی بھی میرا مسئلہ نہیں رہا۔ اللہ کا بڑا فضل ہے۔ چار مربع نہری زمین کا وارث ہوں اور اچھی خاصی باعزت سروس بھی ہے...... جتنے چاہیں بلا تکلف لے لیں۔''

شہباز نے پرس میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''یار کمال کے بندے ہو۔ جو جی میں آتا ہے دے دو اُس کے لیے۔ باقی میں جیب سے ڈال دوں گا۔ پیسہ ہاتھ کی مَیل ہے۔ بندہ خوش ہو جائے تو آئندہ بھی کام آتا ہے۔'' مسعود پرویز نے مستانہ انداز میں دائیں بائیں جھولتے ہوئے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا اور پرس مزید آگے بڑھا کر بولا۔ ''نہیں آپ خود دیں۔ جتنے جی چاہتا ہے۔'' شہباز نے قدرے توقف کیا اور ہاتھ بڑھا کر سو سو کے آٹھ نوٹ اُچک لیے لیکن مسعود پرویز سے نظریں ملائے بغیر کہنے لگا۔ ''یار! تم نے حد کر دی ہے میرے ساتھ۔ ایسے کر رہے ہو جیسے میں گڈی کا دلا ہوں۔''

نیلام

میاں بیوی دونوں ذہین تھے اور ان میں بلا کی ذہنی ہم آہنگی بھی تھی۔ بیٹی کو حسن کی وافر دولت قادرِ مطلق نے عطا کی تھی لیکن اس کے ثمرات سب کے سب وہ خود سمیٹنے پر کمر بستہ تھے۔ میاں کی شخصیت پُرکشش تھی اور گفتگو بھی بڑے دل نشین انداز میں کیا کرتا۔ بس ایک ہی کمی تھی کہ ڈھنگ کا کوئی ذریعۂ معاش اختیار نہیں کر رکھا تھا۔ ہر کام باتوں سے نکالنے پر تمام تر صلاحیتیں وقف کر رکھی تھیں۔ پھر خیالات بھی بہت اونچے تھے۔ اچھا کھانے، پہننے اور ڈھنگ سے رہنے کا شوق فراواں اس پر مستزاد۔ بیوی بھی اپنے میاں کی کاربن کاپی تھی۔ اُس کا دل چاہتا کہ کام کاج کی خاطر گھر سے باہر جانے کی بجائے میاں سامنے بیٹھا رہے اور وہ دونوں ایک دوسرے پر صدقے واری ہوتے رہیں۔ حالانکہ اولاد جوان ہو چکی تھی۔ خاص طور پر بڑی بیٹی ثمینہ کی اب شادی ہو جانی چاہیے تھی۔

امورِ خانہ داری میں ماہر، سلیقہ شعار اور انٹر تک تعلیم یافتہ، باکردار، مہذب اور خوش اخلاق شہری لڑکی اگر حسن و جمال میں بھی فسٹ کلاس فسٹ ڈویژن رکھتی ہو تو مناسب رشتوں کی کمی نہیں ہوتی۔ ویسے بھی جب وہ باوقار اور سادہ لباس پہن کر ماں کے ہم راہ باہر نکلتی تو لڑکے کجا، اُن کی مائیں بھی راہ و رسم استوار کرنے کے لیے بہانے تلاش کرتیں۔ لڑکی کی آنکھیں اتنی حسین تھیں کہ "المصور" پر ایمان لے آنے کے لیے

انہیں ایک بار دیکھ لینا ہی کافی تھا۔ اہلِ دل کا بھلا اسی میں ہوتا کہ آنکھ اُٹھا کر ایک جھلک نہ ہی دیکھے کہ اُس طلسم ہوش رُبا کا اسیر ہو کر کوئی عقل و خرد نہ کھوئے تو جانیے کہ کسی ولی کی کرامت کا کرشمہ ظہور پذیر ہوا ہے۔ خالقِ کائنات کو کچھ بھی تخلیق کرتے ہوئے یقیناً کوئی تردّد درپیش نہیں ہوتا لیکن ثمینہ کو دیکھ کر ایسے گمان گزرتا' جیسے لوحِ ازل پر اس کا خاکہ مرتب کرتے ہوئے اُس نے خود ضرور کوئی خاص دلچسپی لی ہو گی۔ تیسرے درجے کے متوسط گھرانے میں جہاں چھ افراد کے لیے ناشتے میں ایک پاؤ دودھ سے چائے بنتی ہو' وہاں یہ ممکن نہیں کہ ایک نوجوان کنواری لڑکی ہر وقت "رائل سلیوٹ" سے مخمور ہوئی رہتی ہو پھر بھی اُس کی حسین آنکھوں میں ہلکے گلابی ڈوروں کے پس منظر میں کیف و مستی کی شفاف تہ سیال چاندی کی مانند جھلملاتی دکھائی دیا کرتی۔

دوسرے اور تیسرے درجے کے رہائشی علاقوں میں کوئی پری بھی مقیم ہو تو اس کے لیے فائیو سٹار رشتے نہیں آیا کرتے۔ نہ ہی ان گلی محلوں میں سے کسی اصلی شہزادے کی سواری کا گزر ہوتا ہے۔ ہاں کبھی کبھار کسی ظالم دیو کی نظر پڑ جائے تو اُٹھا لے جاتا ہے۔ یا پھر خام خیالوں اور خوابوں میں رہنے والے دل کے شہزادے ضرور بھٹکتے پھرتے ہیں' جو سراپا کشکول بنے ہر حُسن کی دیوی کے حضور اِک نظرِ التفات کی بھیک کی خاطر التجائیں کرتے نظر آتے ہیں۔ ثمینہ کے لیے جو رشتے آتے رہے' ان میں آسودہ حال دکاندار' گھریلو سطح کے چھوٹے چھوٹے صنعت کار' کامیاب دست کار' اعلیٰ ہنر مند یا ایسے سرکاری ملازم جن کی تنخواہیں محدود لیکن آمدنیاں لامحدود ہوتی ہیں۔ وہ بھی جو بیرونِ ملک مقیم تھے اور اڑوس پڑوس کی گلیوں میں کئی کئی منزلہ ایسے گھر تعمیر کروا چکے تھے جو رنگ برنگی ٹائیلوں اور پھول بُوٹوں سے سجے ہوئے تھے۔

میاں بیوی انٹرویو لے لے کر تھک چکے تھے لیکن کوئی اُن کے طے شدہ معیار پر پورا نہیں اُتر رہا تھا۔ حالانکہ ان میں سے اکثر' جوان اور قبول صورت ہونے کے ساتھ

ساتھ خوش حال بھی تھے۔ بالآخر ایک ایسا رشتہ برابر آ گیا جو میاں بیوی کو درحقیقت مطلوب تھا۔ طالب حسین کو فرزندی میں لینے سے پہلے فوری طور پر سرپرستی میں لے لیا گیا' چونکہ اس کے والدین بچپن میں ہی داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ سو سب سے پہلے اُسے اس کھوئی ہوئی انمول نعمت کا نعم البدل عطا کرنے کا عندیہ دیا اور تسلی دی کہ اب وہ کوئی فکر نہ کرے' چونکہ اصل ماں باپ سے بھی کہیں بڑھ کر خالص والدین زندہ حالت میں مل گئے ہیں جو اُس کے ہر طرح کے احساسِ محرومی کو یکسر معدوم کر کے رکھ دیں گے۔ حالانکہ خود طالب حسین کو یتیم الطرفین ہونے پر گزشتہ دو اڑھائی عشروں سے کوئی کسک محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ عمر کے ایسے دور میں داخل ہو چکا تھا کہ جب اُس کے ہونے والے سُسر اور ساس اُسے "لڑکا" یا "بیٹا" کہہ کر پکارتے تو وہ اندر سے خفیف ہونے لگتا۔ چونکہ وہ خود اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اگر اپنی خوش دامن سے عمر میں چھوٹا ہوا بھی تو فرق چند سال سے زیادہ نہ ہوگا' تاہم سُسر اُس سے کم و بیش سات آٹھ سال بڑے ضرور دکھائی دیتے تھے۔

طالب حسین کا اپنا ایک ہی سگا بھائی تھا جو اس سے تین سال بڑا تھا۔ لیکن تحریکِ اسلامی کا مخلص اور باعمل رکن ہونے کے ناتے بہت بڑی خوبصورت شرعی داڑھی رکھی ہوئی تھی اور اس سے قطع تعلق کر رکھا تھا' چونکہ بار بار کی سرزنش کے باوجود نماز قائم کر سکا اور نہ ہی شرع کے مطابق داڑھی رکھنے پر آمادہ ہوا۔ گو طالب حسین میں بظاہر کوئی عیب نہیں تھا' لیکن بڑے بھائی کے بقول شعائرِ اسلامی کے برخلاف زندگی بسر کرنا انحراف کے مترادف ہے۔ لہٰذا وہ لاتعلق ہو چکا تھا۔ ویسے بھی گوجرانوالہ اور راولپنڈی کے بیچ جتنا فاصلہ تھا' اس سے کہیں بڑھ کر عقائد کی بنا پر دلوں میں بُعد پیدا ہو چکا تھا۔ بڑے بھائی کا اس بات پر پختہ ایمان تھا کہ ایک ماں کے بطن سے پیدا ہونے والے بھائیوں کے مابین تعلق سے کہیں بڑھ کر یہ امر زیادہ اہم ہے کہ عقیدے کے اعتبار سے

باہمی رشتے استوار ہوں۔

ساس سسر نے طالب حسین کے بڑے بھائی کے رویے کو انتہائی ظالمانہ قرار دیتے ہوئے مولویانہ ذہنیت کو بُری طرح ہدفِ تنقید بنایا اور تسلسل سے اُس کے خلاف پراپیگنڈہ کرتے رہے۔ کئی مواقع پر تسلی چاہی کہ اب جب کہ وہ جلد ہی ایک پرکشش اور قابلِ رشک زندگی کا آغاز کرنے جا رہا ہے تو مستقبل میں کسی موڑ پر بھائی سے سامنا ہونے کی صورت میں پسیج تو نہیں جائے گا۔ طالب نے ہر مرتبہ یقین دہانی کرائی کہ وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ حتیٰ کہ اُس سے بہت بڑی بڑی قسمیں لی گئیں کہ وہ اپنے شقی القلب بھائی کو زندگی بھر منہ نہیں لگائے گا۔

ویسے بھی طالب حسین کو اب کسی رشتے کی کمی نہیں رہی تھی۔ دونوں چاک و چوبند زیرک اور عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ زندہ ماں اور باپ میسّر آنے کے ساتھ ساتھ دو چھوٹے بھائی اور ایک دس گیارہ سال کی گڑیا سی پیاری بہن بھی مل گئی۔ اور پھر منگیتر؛ جس پر ایک زمانہ مرا جا رہا تھا۔ ایک منگنی کیا ہوئی' رشتوں کا جمعہ بازار لگ گیا۔ طالب حسین ملک کے بڑے بڑے شہروں میں سینٹری کی دوکانوں پر کئی طرح کی Items سپلائی کرتا تھا۔ اچھا خاصا بزنس تھا اور لاکھوں روپے بینک میں جمع تھے۔ دس مرلہ پر دو منزلہ مکان بنا رکھا تھا۔ پرانے ماڈل کی ایک کار بھی تھی اور گھر میں ضرورت کی ہر شے موجود لیکن ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ بڑی بڑی قیمتی اشیا برباد ہو رہی تھیں۔ اے سی' ٹی وی' ریفری جریٹر' فرنیچر اور کراکری' غرض ہر وہ شے جس کی تمنا عمر بھر میاں بیوی کرتے رہے تھے۔ لیکن ان کے مقدر میں یہی لکھا تھا کہ کرائے کے مکان میں زندگی بسر کریں' جس میں رکھا اُن کا کل اثاثہ چند چارپائیوں' کرسیوں' ضرورت کے برتنوں کے علاوہ ایک چھوٹے سے بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی پر مشتمل تھا۔

ہونے والے داماد کے بارے میں میاں بیوی کو معلوم تھا کہ وہ قبل ازیں دو

شادیاں کر چکا ہے۔ ایک بیوی فوت ہو گئی اور دوسری سے اس لیے نہ نبھ سکی کہ وہ ہفتے میں پانچ چھ روز ٹور پر چلا جایا کرتا اور بیوی قیدِ تنہائی میں پڑی کڑھتی رہتی' لہٰذا طلاق ہو گئی۔ لیکن اب فکر کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ ساس سسر نے حوصلہ افزائی کی کہ وہ دل لگا کر کام کرے۔ کاروبار مزید بڑھائے۔ بے دھڑک بزنس ٹور لگائے' پیسہ کمائے اور گھر کی طرف سے مطمئن ہو جائے۔ سارے معاملات وہ خود دیکھ لیں گے۔ اُسے بار بار ذہن نشین کرایا گیا کہ سینکڑوں رشتے آئے' لوگوں نے دہلیز گھسا دی' اعلیٰ سے اعلیٰ جوان' خوبرو اور دولت مند لڑکوں کے رشتے ٹھکرا کر اسے پسند کیا ہے تو بس یہ اُس پر اللہ کا خاص کرم ہوا ہے۔ ایسی لڑکیوں کے رشتے خوش نصیبوں کو ہی ملتے ہیں۔ اُسے باور کرایا گیا کہ چونکہ انہوں نے اُسے داماد کی بجائے بیٹا بنایا ہے لہٰذا اُس کا فرض ہے کہ وہ بھی حقیقی معنوں میں بیٹا بن کر دکھائے۔

طالب حسین کو اب واقعی کوئی فکر دامن گیر نہیں رہی تھی۔ لباس کا انتخاب بھی ساس نے اپنے ذمہ لے لیا اور اسی کے مشورے پر مونچھیں منڈوا دیں۔ چہرے کی جلد میں سے پلپلاہٹ کے آثار نمودار ہونے کے ساتھ ساتھ بال بھی سفید ہو رہے تھے۔ جب کہ سر کے بال ابھی کالے ہی تھے۔ تاہم کن پٹیوں میں سے سفیدی جھانکنے لگی تھی۔ اُسے روزانہ شیو کرنے کے علاوہ کن پٹیوں کے بال بھی رنگنے کی تاکید کر دی گئی۔ تاہم اُس کا جسمانی طور پر دُبلا پتلا ہونا غنیمت تصور کیا جا سکتا تھا۔ چونکہ کچھ فاصلے سے اُسے دیکھ کر' لڑکا نہ سہی، ادھیڑ عمر کہنے کو بھی دل نہ مانتا۔ البتہ زیادہ قریب آنے پر' اُس کے جسم میں سسکتی' دم توڑتی جوانی آخری سانسیں لیتی محسوس ہونے لگتی۔ نہ جانے کسی لوک شاعر نے ایک خوبصورت گیت میں یہ کیوں کہا ہے کہ پنچھی' پردیسی اور جوانی جانے کے بعد نہیں لوٹتی۔ حالانکہ پنچھی کا کبھی موڈ بنے اور پردیسی کی نیت میں فتور نہ آئے تو یقیناً پلٹ کر آ سکتے ہیں' بشرطِ موت نہ آ لے۔ لیکن بقول عالم لوہار مرحوم' جوانی کبھی واپس نہیں آ

سکتی' خواہ لاکھوں خوراکیں شکم رسید کر لی جائیں۔ خوراکیں درکنار' سرِراہ در و دیوار پر لکھے اور پرنٹ میڈیا میں چھپے تمام اشتہارات میں درج کل ہدایات پر مرحلہ وار خلوصِ نیت سے عمل درآمد کر گزرنے کے باوجود بھی جسم سے فرار ہوتی جوانی کو محصور نہیں کیا جا سکتا اور خوراک جزوِ بدن بننے کی بجائے بدہضمی کا باعث بنتی ہے۔

طالب کے پاس پیسہ جمع ہو چکا تھا لیکن پیشے کی نوعیت ایسی تھی کہ مہینے میں صرف پانچ چھ روز ہی اُسے گھر کا کھانا نصیب ہو سکتا۔ ساس کا شمار اُن خواتین میں ہوتا جو لذتِ کام و دہن کے وسیلے سے مرد کو فتح کرنے کا گُر آزمایا کرتی ہیں۔ مالی اُمور کی نگہداشت سسر کے سپرد ہوئی اور گھر کی چابیاں ساس کے پاس۔ جہاں حفاظت کے لیے ''چھوٹے بہن بھائی'' ٹھہرے ہوتے۔ صاف استری شدہ لباس' پالش کیے ہوئے جوتے' سلیپرز سب قرینے سے رکھے ملتے۔ ہر شے سلیقے سے پڑی ملتی۔ گھر کی صفائی ستھرائی اور سجاوٹ دیکھ کر طالب کی تھکاوٹ کافور ہو جاتی اور پھر کھانے پینے کا خاص اہتمام اُسے مسرور کر دیتا۔ وہ سوچتا کہ اصل زندگی کا آغاز اب ہوا ہے۔ زیور' بری اور جہیز ایک ساتھ بن رہا تھا۔ طالب کے مکان کی مرمت اور رنگ و روغن بھی ہو رہا تھا۔ وہ ممنونِ احسان تھا اور اپنی قسمت پر نازاں کہ قدرت کیسے مہربان ہوئی۔ زندگی کے سفر میں عین نصف النہار پر ایسے خوبصورت ہم سفر ملے' جنہوں نے راہوں کے سارے کانٹے چن کر پھول بکھیر دیئے۔

غیر موجودگی میں چونکہ گھر کھلا رہتا تھا' اس لیے چھوٹے بہن بھائیوں سے رابطے کے لیے ٹیلی فون کا کنکشن لگوا لیا۔ موبائل پہلے سے ہی لے رکھا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوتا' دن میں ایک آدھ بار گھر میں کسی سے بات ہو جاتی۔ سسرال والے دوسری گلی میں کرائے کے چھوٹے سے مکان میں رہائش پذیر تھے۔ طالب نے کئی بار اس خواہش کا اظہار کیا کہ اتنا بڑا اپنا گھر ہوتے ہوئے وہ کرائے کے مکان میں نہ

رہیں۔ ساس سسر نے ہر مرتبہ بڑے پیار سے ٹوک دیا کہ شادی سے پیشتر لڑکی کا اس گھر میں آنا معیوب ہے اور مزید یہ کہ وہ روایات کی پاس داری کو ایمان کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ بھی باور کرانا ضروری سمجھتے کہ اُسے داماد نہیں بیٹا بنایا ہے۔ "بیٹا" اور "لڑکا" دو ایسے الفاظ تھے' جو طالب نے اپنے لیے زندگی میں کب سُنے ہوں گے' اُسے یاد نہیں تھا۔ اب اِن الفاظ کی تکرار سے وجود کے اندر جوبن پنپتا ہوا محسوس ہونے لگا اور من ہی من میں وہ اٹکھیلیاں کرتا رہتا۔

تھوڑے ہی عرصہ میں طالب حسین کی چال ڈھال اور طور طریق میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ وہ اکثر گنگنانے لگتا اور چلتے ہوئے اٹھلاتا بھی۔ راہ چلتے اور دورانِ سفر لڑکیاں تاڑنے کو دل بے اختیار مچل جاتا۔ گزشتہ مہینے کے بزنس ٹور پر ملتان کے ایک بڑے سینٹری سٹور میں پیش آنے والا ناخوش گوار واقعہ بھی اسی ذہنی تغیر کا شاخسانہ تھا۔ وہاں ٹائیلیں خریدنے کے لیے موجود ایک اوحیڑ عمر ماڈرن خاتون سلیز مین سے تکرار کرنے لگی تو طالب نے مالک کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے "آنٹی" کہہ ڈالا۔ خاتون برافروختہ ہوگئی اور ڈانٹ کر بولی کہ وہ اسے ننھے بچوں کی طرح آنٹی آنٹی کیوں پکار رہا ہے' جب کہ خود اس کا چچا دکھائی دیتا ہے۔ کدو کی طرح چہرہ چھیل چھال لینے سے لڑکا نہیں بنا جا سکتا۔ اُس کی خریداری کا تخمینہ پینتیس ہزار کے لگ بھگ تھا۔ صورت حال زیادہ بدمزہ یوں ہوگئی کہ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دکاندار جو طالب سے عمر میں کم و بیش سولہ سترہ سال چھوٹا تھا' لپک کر آگے بڑھا۔ معذرت کی' "باجی باجی" اور "میڈم میڈم" کی تکرار کرتے ہوئے خاتون کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ گاڑی سٹارٹ کر کے نکل گئی۔ دکاندار نے سارا غصہ طالب پر نکال دیا اور سابقہ ادائیگی کرنا درکنار' مزید آرڈر بھی نہ دیا۔ طالب حیرت زدہ تھا کہ خاتون اس کی ساس سے بہرحال زیادہ عمر کی دکھائی دے رہی تھی لیکن "آنٹی" کہنے پر بھڑک

اُٹھی۔ حیرت سے زیادہ افسوس ہوا' اور سوچتا رہا' کاش وہ عورت اُسے مزید بُرا بھلا کہہ لیتی لیکن سودا خریدے بغیر نہ جاتی تو دُکاندار اس پر ناراض نہ ہوتا۔ گویا ایک انتہائی نجی نوعیت کے مغالطے نے اُسے دو دو مرتبہ بے عزت کروایا۔

''چھوٹا بھائی'' عامر ابھی اٹھارہ انیس برس کا تھا۔ بورڈ کے امتحان کی فیس بروقت جمع نہ کرانے کے باعث میٹرک پاس نہ کر سکا۔ اب وہ اس کی زیرِ نگرانی اپرنٹس شپ میں دے دیا گیا۔ وہ بڑا تیز طرار اور خوش شکل نوجوان تھا۔ کاروبار کے جملہ رموز بہت جلد سمجھ گیا۔ ملک بھر کے چیدہ چیدہ سینٹری ہاؤسز سے تعارف بھی ہو چکا تھا۔ اُسے 'طالب بھائی جان' کے پچیس سالہ کاروباری تجربہ کی روشنی میں راستہ صاف دکھائی دے رہا تھا اور معلوم ہو گیا کہ ملک کے کس کونے میں کون سا دکاندار لین دین کے معاملات میں صاف ہے یا گندہ۔ اس لیے کہیں کوئی ٹھوکر لگنے کا احتمال نہیں تھا۔ فیکٹری مالکان میں بھی طالب کی ساکھ بنی ہوئی تھی۔ اُس کی ضمانت پر عامر کو ہزاروں کا مال بغیر رقم ادا کیے ملنے لگا۔ سات آٹھ ماہ کے عرصے میں ریل پیل ہو گئی اور کاروبار میں خاصی حد تک خودمختار ہو گیا۔ چھوٹے بہن بھائی اب انگلش میڈیم میں پڑھنے لگے تھے۔

سسر صاحب نے بہت جلد ڈرائیونگ سیکھ لی اور محض داماد کے بہت سے کام سنوارنے کی نیت سے دونوں میاں بیوی شہر بھر میں گاڑی دوڑائے پھرتے۔ کہتے ہیں کہ نیت ٹھیک ہو تو اللہ تعالیٰ سارے کام سنوار دیتا ہے۔ دس ماہ کی مدت میں شہر سے ملحقہ جدید رہائشی علاقے میں کنال کنال کے دو پلاٹ خرید لیے۔ ایک ثمینہ کے نام یعنی طالب کے لیے اور دوسرا عامر کے لیے۔ بیٹی کا جہیز بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ بَری اتنی خوبصورت بنائی گئی کہ جسے دیکھ کر اچھی بھلی بستی رستی سہاگنوں کا دل بھی دوبارہ شادی کرنے کو مچل پڑے۔

ساس اور سسر بہت ہی دانش مندی کی باتیں کیا کرتے' جن سے اختلاف کی

گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔ اسے مشورہ دیا گیا کہ گلی محلے کی زندگی کے ساتھ بہت سی آلائشیں لپٹی ہوئی ہیں۔ تم جب کہ بہت جلد ایک نئی اور خوش گوار زندگی کا آغاز کر رہے ہو تو اس گندی ساجیات میں بکھرے ہوئے ماحول سے باہر نکلو۔ صاف ستھرے' کھلے پُرفضا' آلودگی سے پاک جدید سہولتوں سے آراستہ علاقے میں گھر بناؤ اور ازدواجی زندگی کا لطف اٹھاؤ۔ اس مکان کو بیچ ڈالو۔ ویسے ہی ذرا اندازہ لگانے کے لیے جاننے والوں سے بات کی تو خوش قسمتی سے ایک خواہش مند سامنے آ گیا۔ توقع سے زیادہ قیمت مل رہی ہے۔ تم ہاں کرو۔ میں کل ہی رقم پکڑ لیتا ہوں۔ قبضہ تب دیں گے جب ہماری کوٹھی بن جائے گی۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ تمہارے اکاؤنٹ میں بھی ابھی خاصی رقم باقی ہے۔ سارے کام بخیر و خوبی ہو جائیں گے۔

طالب کی اب تک گزری زندگی کی ساتھی' بینک کی پاس بک ہی تھی۔ رات کو اس سے راز و نیاز کی باتیں کیں تو عقدہ کھلا کہ بے چاری کا دامن تار تار ہوا پڑا ہے۔ طالب نے اس کی دہائی کو درخور اعتنا نہ سمجھا کہ نئی منزل کی جانب پیش رفت میں کوتاہی نہ ہو۔ دوسرے روز سسر کو تعمیر شروع کرنے کا سگنل دے دیا اور ساتھ ہی گندی ساجیات میں بکھرا گھر بیچنے کا عندیہ بھی دے ڈالا۔ خود ایک نئے جوش اور جذبے سے کاروبار میں وسعت پیدا کرنے کے لیے اور زیادہ محنت کرنے لگا۔ ساس سسر کا بیٹا ہونے کے جملہ تقاضے پورے کرنے کے لیے اس نے اتنی سختی سے کمر کس لی کہ آسودگی سے سانس لینا بھی محال ہو گیا۔ رات دن کی محنت شاقہ اور سسر صاحب کی مہربانیوں سے آٹھ ماہ کی مدت میں گھر تعمیر ہو گیا تو مشورہ دیا گیا کہ اب گاڑی بھی نئی ہونی چاہیے۔

جو لوگ سپلائی کے کاروبار سے وابستہ اس طبقے کو دور سے دیکھتے ہیں' بڑی جلدی غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی آسان کام ہے اور اس میں پیسہ ہی پیسہ ہے۔ اِدھر کا مال اُدھر۔ ایک کا مال تو سرمایہ دوسرے کا۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری۔

منافع چوکھا۔ وہ بھی سارے کا سارا جیب میں۔ جب کہ حقیقی صورتِ حال اس سے بہت مختلف ہے۔ یہ انتہائی مشکل اور صبر آزما پیشہ ہے۔ مسلسل سفر اور بے آرامی سے انسان کے جوڑ بند فرسودہ ہو جاتے ہیں اور پھر ایسے کاروباری شخص کی زندگی خطرات سے عبارت ہوتی ہے۔ دورانِ سفر وہ متعدد بار حادثوں کا شکار ہوا۔ قسمت اچھی تھی کہ معمولی چوٹیں آئیں۔ لیکن دو بار کئی کئی دن ہسپتال میں داخل رہنا پڑا۔ ڈاکوؤں سے بھی سامنا ہوا اور وہ لٹ گیا۔ زیادہ بڑی رقوم لے کر چلنا موت کی ہمراہی میں سفر کرنے کے مترادف ہے۔ ہوٹلوں میں رہائش اور وقت بے وقت بازاری کھانا صحت کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ دکانداروں کے نخرے ایک طرح کی غلامی برداشت کرنا پڑتی ہے۔ بڑی مار کھانے کے بعد کہیں کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ ناتجربہ کاری کے دور میں بڑے دھوکے ہو جاتے ہیں۔ ایسے دکانداروں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں جو رقم دبا کر الٹا تڑی بھی لگاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے اچھے اور بااصول دکانداروں کے ساتھ مراسم بن جائیں تو انہیں مزید مستحکم کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ حیلے بہانے ان کے لیے دور دراز علاقوں سے تحفے لے جانا' بڑی رازداری سے سیلزمینوں کی مٹھی گرم کرنا' مالک کی اجازت سے عید وعید پر اچھی خاصی عیدی دینا۔ عام نوعیت کی ذاتی خوشیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور اسی بہانے سوغاتیں لے جا کر پیش کرنا۔ طالب کو اس تمام عرصہ میں معلوم ہو چکا تھا کہ پشاور کا کون سا ڈیلر گوجرانوالہ کا چیسہ پسند کرتا ہے۔ اسلام آباد والے کو چڑے بھاتے ہیں اور پنڈی والے کو حافظ آباد سے سرسوں کا ساگ پہنچانا ہے۔ چکوال سے دیسی گھی کی ریوڑیاں کس دکاندار کے بچوں کو پسند ہیں اور کون خاص ادویات کا طلب گار ہے۔ اسی طرح فیکٹری مالکان کے لیے پشاور سے چھوٹی موٹی سمگلنگ بھی کرنا پڑتی تھی۔ ڈرامے کے یہ سب پارٹ درحقیقت اس لیے ادا کیے جاتے ہیں کہ بزنس کا کھیل جاری رہے اور ڈراپ سین کبھی نہ ہو۔ بڑے دکانداروں کا موڈ دیکھ

کر بات کرنا۔ گاہکی لگی ہوئی ہو تو سیلزمینوں کی عملاً مدد کرنا' ساتھ مل کر سامان پیک کروا کر لوڈ کرانا' سب اس کھیل کا حصہ ہیں۔

ساری جیبیں دولت سے بھری ہونے کے باوجود طالب جیسے کاروباری لوگوں کو بارہ بارہ گھنٹے بھوکا پیاسا رہنا اور فطری تقاضوں کے خلاف کئی کئی گھنٹے اپنے اوپر جبر کرنا پڑتا ہے کہ کہیں ذرا دیر کو اِدھر اُدھر ہونے سے کاروبار کا مناسب وقت ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ مزید آرڈر ملے اور نہ ہی وصولی ہو۔ دوسری جانب کئی فیکٹری مالکان کے نامناسب رویے۔ کم سیل ہونے پر گلے پڑتے ہیں اور زیادہ ٹرن اوور پر بعض کو غش پڑنے لگتے ہیں۔ اس طرف دھیان نہیں دیتے کہ مہینے میں دس بیس لاکھ کا بزنس مل گیا۔ کم ظرف اور تھڑدلے بیس پچیس ہزار کی کمیشن پر پیچ وتاب کھانے لگتے ہیں۔ ایسے تنگ دل مالکان کو رام کرنے کے لیے بھی کئی پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ گویا یہ ایک طرح کی دوہری غلامی ہے۔ لیکن طویل عرصہ تک اعصاب ساتھ نہیں دیتے۔ انجام کار اس پیشے سے وابستہ انسان کی جسمانی فرسودگی اور سن رسیدگی کا عمل تیز تر ہو جاتا ہے۔

طالب حسین کو دُلہا بنایا گیا تو ایسے لگا جیسے کارٹون کو مخمل مخمل میں سجا دیا گیا ہو۔ پلپلا پن چہرے پر عود کر آیا۔ گزشتہ عرصے میں بالوں کی سفیدی کن پٹیوں کی حدود پھلانگ چکی تھی' جسے چھپانے کے لیے سر پر پھیری گئی سیاہی ایک طرح سے اس کی زندگی کے آئندہ ماہ و سال کی ازدواجی روشنی کو نگلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ شادی کی تقریبات اتنی صبر آزما ہوتی ہیں کہ نوجوان دُولہے بھی تھک جاتے ہیں۔ طالب کی طلب گو بے کنار تھی لیکن وہ نڈھال ہوا پڑا تھا اور ان گنت مسافتوں کی تھکن جیسے یک لخت غالب آنے لگی ہو۔ ''بیٹا'' اور ''لڑکا'' کہلانے سے جو عزم جوان ہوا وہ اب ہانپ رہا تھا۔ شادی کے ہنگامے عروج پر تھے۔ عالم لوہار کا چمٹا زور زور سے بجنے لگا۔ مرحوم نے لمبی زلفوں کو ایک بار جھٹکا اور اس کے بول گونج اُٹھے۔ ''گئی جوانی مُڑ نہیں آوندی'

بھاویں لکھ خوراکاں کھایئے۔" لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ پاگل کی پیشنٹ اور بوڑھے کا عشق؛ دونوں بڑے سخت ہوتے ہیں۔ شکنجے کی طرح۔

ساس اور سسر پر دہری ذمہ داریاں آن پڑی تھیں۔ اُنھوں نے بیٹی سے زیادہ طالب کے والدین بن کر اُسے بیاہا۔ گویا سسرال بھی وہی اور میکا بھی۔ نئے شادی شدہ جوڑے کو اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا' اس لیے بھی کوٹھی میں شفٹ ہو گئے تاکہ رونق میں کمی نہ آئے۔ عامر کا پلاٹ قریب ہی تھا۔ طالب کو پہلی بار یہ خبر ہوئی کہ اُس کے "اماں ابا" نے پائی پائی جوڑ کر کچھ رقم پس انداز کر رکھی ہے۔ مہنگائی چونکہ دن بدن بڑھ رہی ہے لہٰذا عمر بھر کی جمع پونجی سے مکان تعمیر کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ داماد کے گھر سسرال کا رہنا معیوب ہے اور یہ بھی مناسب نہیں کہ اُس کی عدم موجودگی میں بیٹی اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہے۔ وہ اگر قریب نہ رہیں تو اور کون یہ فریضہ سرانجام دے۔

شادی کی مصروفیات کے باعث طالب کے بہت سے بزنس ٹورز خطا ہو گئے۔ بروقت وصولیاں نہ ہونے سے فیکٹریوں کی ادائیگیوں میں تعطل پیدا ہوا اور صورتِ حال قدرے کشیدہ ہو گئی۔ دوسری جانب عامر جن کارخانہ داروں سے مال اُٹھا رہا تھا' وہاں سے پہلے مرحلے پر دبا دبا اور پھر واشگاف الفاظ میں احتجاج بلند ہونے لگا کہ بیلنس زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ طالب کے استفسار پر عامر نے عذر پیش کیا کہ مندا ہونے کے باعث وصولیاں نہیں ہو سکیں۔ لیکن اصل صورت حال جو سامنے آئی' وہ اس سے یکسر مختلف تھی۔ طالب خود ٹور پر نکلا تو معلوم ہوا کہ وصولیاں باقاعدگی سے ہوتی رہی ہیں۔

بیوپار کی دنیا بڑی نرالی ہے۔ اس کے اپنے طے شدہ ضابطے اور روایات ہیں۔ جس کی ساکھ بن جائے' اس کی بات بن جاتی ہے اور جو کام کئی لاکھ سے نہ ہو سکے وہ محض ساکھ کی بنا پر چٹکیوں میں ہو جاتا ہے۔ ساکھ والے کی زبان سے فون پر سنائی دینے والے الفاظ کے جواب میں لاکھوں کا مال سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے

دروازے پر پہنچ جاتا ہے۔ لیکن ساکھ بنتے بنتے بنتی ہے اور ایک بار بگڑ جائے تو ساری بازی چوپٹ ہو جاتی ہے۔ کاروبار میں لین دین کا ایک ہی مسلمہ اصول رائج ہے کہ ضامن دلائے یا خود ادا کرے۔ سیانوں نے اسی لیے کہہ رکھا ہے کہ "ضامن نہ ہو جیئے گرہ سے دیجئے۔" عامر کی ضامنی نے طالب کو بری طرح جکڑ لیا۔ اسے مال ملنا بند ہو گیا تو دس دس بیس بیس سالوں سے لگی ہوئی دکانوں کی سپلائز متاثر ہونے لگیں۔

پہلے مرحلے پر ایک فیکٹری والے نے گھر آ کر چابی طلب کی اور نئی گاڑی سٹارٹ کر کے لے گیا۔ دوسری پارٹی کو خبر ہوئی تو دو چار کارکنوں کے ہم راہ آیا اور سسر صاحب کے زیر استعمال پرانی گاڑی چھین لی۔ طالب کی مجبوری یہ تھی کہ بینک اکاؤنٹ میں کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ گھر میں بیٹھنا محال ہو گیا۔ ایسی کھینچا تانی شروع ہوئی کہ طالب کے حواس جواب دے گئے۔ اُس نے آج تک بڑے رکھ رکھاؤ سے کاروباری معاملات چلائے تھے۔ اتنی ذلت اور رسوائی ہونے کا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس دلدل سے کیسے نکلے۔ خواری کے اس عالم میں سوائے ثمینہ کے کسی کو کوئی فکر نہیں تھی۔ سبھی بدستور اونچی ہواؤں میں پرواز کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ ثمینہ اس سے کم و بیش بیس سال چھوٹی ہے اور عمروں میں یہ تفاوت دلوں کے باہم قریب ہونے میں مزاحم ہو سکتی ہے۔ لیکن طالب کے لیے یہی ایک امر تقویت کا باعث ثابت ہوا کہ بیوی نئی صورت حال سے خوش نہیں تھی۔ اُس نے اِسے احساس دلایا کہ شوہر دکھ جھیلنے کے لیے تنہا نہیں۔ از خود کھل کر اقرار کیا کہ تباہی کے سارے کھیل میں اُس کے والدین اور بھائی کی حرص کارفرما تھی۔

رات کو آٹھ دس چھوٹے بڑے قرض خواہوں نے ایک ساتھ گھر آ کر گھیراؤ کر لیا۔ اُن کے تیور دیکھتے ہی طالب کے اوسان خطا ہو گئے۔ آنے والوں میں سب سے موٹے عمر رسیدہ اور پہلوان ٹائپ کارخانہ دار نے طالب کے سالے اور سسر کو بھی

حاضر کر لیا اور بڑے دبنگ لہجے میں طالب سے کہا۔ "دیکھ اوئے بھائی میاں! جان چھڑا ان جونکوں سے' تمہارا قیمہ کر کے کھا جائیں گے' میں تمہیں بتا رہا ہوں' سمجھ۔" پھر وہ براہِ راست اُس کے سسر سے مخاطب ہوا۔ "بس کر یار! بس کر۔ بدہضمی ہو جائے گی۔ اپھارہ ہو جائے گا۔ پیٹ پھٹ جائے گا تمہارا۔ ترس کھا اس یتیم مسکین پر۔ یہ بڑے موٹے موٹے 'آنڈے' دینے والی مرغی ہے۔ ڈیلی 'آنڈے' کھا مگر اس کا گوشت نہ کھا۔ جس پلاٹ پر گھر بنا رہے' وہ بیچو۔ کاغذ ہمارے حوالے کرو۔ ورنہ تمہارے دونوں بیٹے ہم ساتھ لے جائیں گے۔ پچیس تیس سال کام کریں گے کارخانے میں تو تمہارا قرض اتر جائے گا۔"

سسر ایک دم خم ٹھونک کر مقابلے پر اتر آیا اور بڑے مضبوط لہجے میں سب پر انکشاف کیا کہ وہ زندگی بھر کی جمع پونجی سے گھر بنا رہا ہے' کوئی نتھے خان پاؤں رکھے پلاٹ میں۔ قتل ہو جائیں گے...... اتنے میں ثمینہ نے بزرگ کارخانہ دار کو اندر بلوا لیا اور التجا آمیز لہجے میں بولی۔ "چاچا جی! آپ صرف چند دن کی مہلت دیں۔ یہ گھر میرے نام ہے۔ ہم اسے فوراً بیچ کر آپ سب کی پائی پائی ادا کر دیں گے۔" بزرگ نے ثمینہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ "اوئے کڑیئے! میرا پُتر! یہ گھر نہ بیچ۔ وہ بکوا جس پر تیرا باپ کوٹھی بنوا رہا ہے۔ طالب بے چارے کا قصور کیا ہے؟ اس کے ساتھ ہم تب سے کام کر رہے ہیں جب یہ بچہ تھا۔ ہیرا ہے یہ بندہ۔ اپنا گھر بچانا چاہتی ہو تو اپنے ماں باپ سے بچو۔ نہیں' تو تمہاری قسمت"......

اسی اثنا میں ڈرائنگ روم سے ایک شور سنائی دیا۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو طالب قالین پر گرا پڑا تھا۔ افراتفری مچ گئی۔ اسے دل کا دورہ پڑا تھا۔ وصولیاں کرنے والوں کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ بغیر کوئی لمحہ ضائع کیے اسے گاڑی میں ڈالا اور ہسپتال لے گئے۔ مہمانوں کی تمام گاڑیاں ایک ساتھ نکل گئیں۔ ثمینہ پیچھے روتی رہ گئی۔

اس کے ابا اماں اور عامر نے دلاسا دیتے ہوئے نصیحت کی کہ وہ بغیر ان سے مشورہ کیے کسی سے کوئی بات نہ کرے۔ گھر بیچنے کی پیش کش کرنا پرلے درجے کی حماقت ہے...... ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟...... ماں باپ کا ساتھ چھوڑ کر ایک ایسے شخص کی حمایت کر رہی ہو جو ذرا سا پریشر برداشت نہیں کر سکا اور غبارے سے ہوا نکل گئی...... احسان فراموش شخص چپ چاپ تماشا دیکھتا رہا۔ اتنی غیرت نہیں آئی کہ موٹا پھپھس' سسر کی بے عزتی کر رہا ہے"......

ثمینہ ایک دھماکے سے گویا پھٹ پڑی۔ "خبردار! کسی نے مزید ایک لفظ بھی کہا۔ ایک بات کان کھول کر سن لیں' پلاٹ ہر صورت میں فروخت کرنا ہوگا۔ کوٹھیوں میں رہنے کے خواب نہ دیکھیں۔ آپ کے سارے شوق پورے کرنے کا میں نے ٹھیکا نہیں لے رکھا۔ اب چھوٹی کی باری ہے۔ چند سال انتظار کر لیں...... اور ہاں! اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ میں دوبارہ نیلام پر چڑھوں گی۔ طالب سے زیادہ بولی کوئی دیوانہ بھی نہیں دے گا۔" اتنا کہہ کر اُس نے چادر لپیٹی اور ہسپتال جانے کے لیے اکیلی ہی گھر سے نکل گئی۔

***

بیگا

ماں نے اُس کا نام شاہ بیگ رکھا تھا لیکن چاہنے والے صرف ''بیگ'' کہہ کر پکارتے۔ بعد میں بیگ بگڑ کر بیگا بن گیا۔ ایسا کہ اصل نام سے شائد ہی کوئی واقف رہا ہو۔ وہ خود بھی اپنا نام بیگا ہی بتایا کرتا۔ اُس نے اپنی ماں اور باپ دونوں کو نہیں دیکھا تھا۔ بچپن نانی کے پاس اور پھر چچا کے ہاں گزرا' جہاں ہر قسم کا ظلم سہا۔ یوں لگتا جیسے صبر وشکر اُس کی فطری مجبوری ہو۔ احتجاج کے پہلو ہی سے ناواقف' حتیٰ کہ ناکردہ گناہوں کی پاداش میں بھی مشقِ ستم بن کر خاموش رہتا۔

احمق پرلے درجے کا' عام فہم معاملات میں بھی سُوجھ بُوجھ سے عاری' گھاٹ بات کرنے کے فن سے قطعی نابلد' مافی الضمیر بیان کرنے کی صلاحیت صفر' جسمانی طور پر کمزور مدقوق' گہری سانولی رنگت' لمبوترہ چہرہ' ٹھوڑی لمبی' گال اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں' ناتواں جسم' جیسے کوئی پوستی' نشے باز یا کسی پیچیدہ بیماری کا دیرینہ مریض ہو۔ جھوم جھوم کر چلتا۔ یوں لگتا کہ تیز ہوا کے جھونکے سے لہرا کر گر پڑے گا۔ ہر ایک کے مذاق کا نشانہ' سب کے لئے وقت بے وقت کی بے مول تفریح۔ اُس کی احمقانہ باتیں زبان زدِ عام تھیں' جسے دہرا کر ہر کوئی لطف اندوز ہوتا۔ وہ کہنا کچھ چاہتا' زبان سے ادا کچھ اور ہوتا۔ زمانے کی چیرہ دستیوں کا اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ کسی قسم کی طعن تشنیع' ٹھٹھہ تمسخر حتیٰ کہ ہلکی پھلکی دست درازی بھی اسے مشتعل نہ کرتی۔

نانی کے انتقال کے بعد جب وہ چچی کی ٹھوکروں میں آ رہا تو گھر بار کے تمام کام کاج ہلکے اور بھاری' بیشتر اسی کے ذمے آن لگے۔ اس کے چچا ماسٹر شریف پرائمری سکول کے استاد تھے۔ ان کے بیٹے بیٹیاں باقاعدگی سے سکول جاتے تھے۔ بگا آٹھ سال کا ہو چکا تھا۔ جب تک نانی کے ہاں رہا' ڈیڑھ سال سکول جاتا رہا تھا۔ یہاں بھی ماسٹر صاحب نہ جانے کس جذبے کے تحت بگے کی تعلیم کا سلسلہ بُرے یا بھلے جاری رکھے رہے۔ حالانکہ ماسٹر صاحب کی بیگم ہزار کوسنے دیتی' بگے پر سارا گھر لاد دیا' لیکن ماسٹر صاحب' صبح گھر سے نکلتے ہوئے بگے کو سکول چلنے کا حکم دیے بنا نہ رہتے۔

وہ گرمیوں کی ایک دوپہر تھی۔ بگے کے لیے کھانے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ کھانے کے بعد سب لوگ اندر سوئے ہوئے تھے۔ بگا چھت پر پڑی چارپائی کو گھسیٹ کر بیری کے نیچے لے آیا۔ آدھی چھت پر چھاؤں کیے ہوئے یہ درخت بگے کا غم گسار تھا۔ جب وہ کام کاج سے فارغ ہوتا' سب گھر والے دوپہر کو آرام کر رہے ہوتے تو بگا اس بیری کے سائے میں آرام کیا کرتا اور سکول کا کام بھی۔

بیری پر لگے بیر ابھی کچے تھے' لیکن بگے کے معدے میں لگی آگ انہیں نگلتی گئی۔ وہ سیر شکم ہو کر نیچے صحن میں آیا' دائیں ہاتھ سے نلکے کی ہتھی چلا کر بائیں مٹھی کو ٹونٹی پر جمایا اور پانی کی چھپک لگائی۔ معدے میں وہ اتھل پتھل ہوئی کہ دوسرے ہی لمحے قے ہو گئی۔ چچی نے کمرے میں غذا کے سبز سبز ذرات قے کیے ہوئے دیکھے تو ایک دھاڑ ماری۔ ''ہائے میرا سارا پستہ کھا گیا حرامزادہ۔'' اور بگے کو پیٹنے لگی۔

ماسٹر صاحب نے بیوی کو جھٹک کر الگ کیا اور بگے کو اُچک کر باہر لے گئے۔ محلے کے کمپاؤنڈر سے دوائی دلائی' دلاسا دیا اور پوچھا کہ اُس نے چچی کا پستہ کیوں چوری کر کے کھایا؟ کیا کھانا نہیں ملا تھا؟''

''چاچا! پستہ میں نے دیکھا بھی نہیں۔ میرے لیے کھانا نہیں بچا' بھوک زور

کی گئی تھی۔ میں نے کچے بیر زیادہ کھا لیے"...... آج بگے نے خلافِ معمول حقیقت بیان کر دی۔

ماسٹر صاحب کے سینے پر گھونسا پڑا۔ وہ اُسے سیدھا اپنے دوست حکیم کرم دین کے پاس لے گئے' جو بے اولاد تھے اور کئی بار بگے کو اپنانے کی خواہش کر چکے تھے۔ حکیم صاحب نے بڑی خوشی سے بگے کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔

بگے کی زندگی میں آنے والے یہ نئے دن اتنے بے مہر بھی نہیں تھے۔ کھانا وافر مل جاتا۔ یہاں کام کاج کچھ زیادہ نہیں تھا۔ سکول باقاعدگی سے جانا ہوتا۔ وہ ایسے ہی بے کشش اور پھیکی زندگی کے سفر پر رواں دواں رہا' جیسے صبر کا بھاری پتھر اٹھائے ہوئے ہو۔ اُس کی جسمانی ساخت اور شکل وصورت ایسی تھی' جیسے جوانی کبھی آئی ہی نہ تھی۔ نہ جانے کب اور کیسے' شباب کے جھونکے بائی پاس کر گئے۔ بگا' حکیم صاحب کی اُترن پہنتا۔ جوتے پاؤں میں کھلے ہوتے اور چلنے میں کھڑپ کھڑپ کرتے۔ کالی شیروانی اور شلوار قمیض بھی جسم پر ڈھیلی تھی۔ وہ حکیم صاحب کے حکم کے مطابق اُن کی مسترد کردہ ایک جناح کیپ بھی سر پر ضرور رکھتا جو کھلی ہونے کے باعث دونوں کانوں کو بھی نصف تک ڈھکے رکھتی۔ بات کرتے ہوئے بگے کی زبان لڑکھڑا جاتی تو حکیم صاحب کی بیگم اکثر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتیں۔

ایک مرتبہ حکیم صاحب نے بگے کو ہدایت کی کہ صلابو کمہار کے گدھے پر گندم لدا کر مشین تک ساتھ جائے۔ اُس کی شہرت اچھی نہیں اس لیے چوکنا رہے' مبادہ وہ راستے میں اناج چوری کر لے۔ واپسی پر بگے سے حکیم صاحب کی بیگم نے پوچھا کہ صلابو نے چوری تو نہیں کی۔

بگے نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ "اُس کم بخت نے جھولی بھر کر گندم نکالی اور گدھے کو کھلا دی۔ میں صلابو سے بولا اور نہ ہی گدھے سے۔"

حکیم صاحب کے گھر سے یہ بات اڑوس پڑوس گئی اور دوسرے دن ہر زبان پر تھی۔ ہر کوئی بیگے سے پوچھتا کہ آخر گدھے کا کیا قصور تھا۔ گندم صلابو نے چوری کی۔ تم گدھے سے کیوں ناراض ہو گئے؟

بزرگوں اور اساتذہ کی ہر نصیحت پر عمل پیرا ہونا وہ اپنا فرض سمجھتا۔ حتی الوسع سر پر ٹوپی رکھتا یا رومال اوڑھتا۔ قومی ترانے کی آواز کان میں پڑتے ہی فوراً مؤدب کھڑا ہو جاتا اور ضروری احترام بجالاتا' جس پر اکثر لوگوں کا طرزِ عمل استہزائیہ ہوتا۔ لیکن اُس نے کبھی بھی اپنی روش نہیں بدلی۔

وہ ملک و قوم کا وفادار تھا اور حکومت کی اپیلوں پر عمل کرنے کا اہتمام کیا کرتا۔ ہڈالی تحصیل خوشاب کے ڈاکو چراغ بالی کے عروج کا زمانہ تھا۔ پورے علاقے میں چپے چپے پر پولیس چوکیاں قائم تھیں۔ خوشاب' کٹھہ' چیل' نوشہرہ' تلہ گنگ اور نیچے ہڈالی' مٹھہ ٹوانہ' قائدآباد تک چیک پوسٹیں بنی ہوئی تھیں۔ بس اڈے پر اعوان ہوٹل کے ایک کمرے میں چراغ بالی اپنے آٹھ ساتھیوں سمیت بیٹھا کھانا کھا رہا تھا' جب کہ ساتھ ہی دوسرے کمرے میں ایک پولیس پارٹی اپنے سب انسپکٹر کی معیت میں دبکی بیٹھی تھی۔ چراغ بالی کی موجودگی کی خبر لمحوں میں آس پاس پھیل گئی۔ سروس پر مامور نیبل مین نے گھبراہٹ میں چراغ بالی کے کپڑوں پر سالن گرادیا لیکن غضب ناک ہونے کی بجائے چراغ بالی نے نیبل مین کو پیار سے تھپکی دی اور حوصلہ افزائی کے طور پر دس روپے کا ایک نوٹ تھما دیا۔

بیگے کو چراغ بالی کی موجودگی کا علم ہوا تو قانون کی مدد کے لیے لپک کر پولیس انسپکٹر کے روبرو پیش ہو گیا اور اُسے وقت کی سفاک حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ سب انسپکٹر نے بیگے کو بازو سے پکڑ کر پاس بٹھا لیا۔ جب چراغ بالی رخصت ہو گیا تو بیگے کی ٹھکائی شروع ہو گئی۔ ہوٹل کے مالک نے بیگے کی جان چھڑائی اور تھانے دار کو احساس دلایا کہ

لڑکا اللہ لوک ہے۔ اسے چھوڑ دیا جائے۔ کہیں اللہ کی پکڑ نہ ہو جائے۔

گلی محلے کے کئی گھروں میں بڑے بڑے ہیرو ٹائپ لڑکے' جو اپنے تئیں دلیپ کمار اور راج کپور ہونے کے ناتے ماتھے سے زُلفوں کی لٹ ہٹنے نہیں دیتے تھے' بیشتر میٹرک کے امتحان میں فیل ہو گئے۔ باقی کے تھرڈ ڈویژن کا دھکا لے کر بمشکل پاس ہوئے۔ ایسے کئی لڑکوں کے والدین کا شک' یقین میں بدل گیا کہ ان کے لاڈلے کے پرچے بیگے کے پرچوں سے بدل گئے ہیں۔ جب ہی تو وہ سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گیا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اچھا بھلا سمجھ دار لڑکا فیل ہو اور ایک سکے بند مخبوط الحواس اوسط درجے میں بڑی صفائی سے پاس ہو جائے۔ ضرور کوئی گھپلا ہو گیا ہے۔ بلکہ کئی لوگ محکمۂ تعلیم کے کارپردازوں کی کارکردگی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے بیگے کی کامیابی کو ثبوت کے طور پر پیش کرتے۔ لیکن بیگا اپنی دھن کا پکا' چپ چاپ زندگی کے سفر پر گامزن رہا...... اور پھر انٹر کا امتحان بھی سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر گیا۔

سرکاری ملازمت ملنے پر بیگا شہر آ گیا۔ ایک مرتبہ پھر روزمرہ کے معمولات میں شدید اکھاڑ پچھاڑ ہوئی۔ بارہ چودہ فٹ کا ایک کمرہ اور سامنے دس چودہ کا صحن' جس کے ایک کونے میں بیگے کے کندھوں تک اونچی چونتڑی میں لگی ڈبلیو سی اور تھوڑی وافر جگہ جہاں سمٹ کر غسل بھی کیا جا سکتا تھا' بیگے کی رہائش تھی۔ یہاں اُس کی زندگی یکسر بدل گئی تھی تاہم نئے چیلنج کا سامنا بڑے بھرپور اور اچھوتے انداز میں کیا۔ اب وہ اپنی مرضی کا خود مالک تھا۔ خاص طور پر یہ انتہائی خوبصورت تجربہ تھا کہ وہ اب کمانے لگ گیا ہے اور سرکار کا ایک ذمہ دار ملازم ہے۔ مہینے کے آخر میں اسے تنخواہ ملے گی جسے وہ اپنی مرضی سے خرچ کرے گا۔ خود کھانا پکانے کا شوق چرایا' سو گھر پر تجربے کرنے لگا۔ جو ساز و سامان گھرداری کے لیے خریدا اس کی فہرست مرتب کی۔ ہر چیز کو مخصوص نمبر الاٹ کر دیا۔ لکڑی کا چمچہ یعنی ڈوئی کا نمبر ایک' ہانڈی کو نمبر دو' پلیٹ کو تین' لوہے کے چمچے کو نمبر چار'

دیگچی کو پانچ' اسی طرح چارپائی' تکیہ' دری' چادر' قمیص' حتیٰ کہ جھاڑو جس کو نمبر پینتالیس ملا' اس کی خرید کردہ آخری آئٹم تھی۔ بعد ازاں جو چیز بھی خریدی' رجسٹر میں اس کی تاریخ خرید' نمبر شمار' نام' استعمال' فوائد اور قیمت خرید درج کر کے متعلقہ شے پر الاٹ شدہ نمبر کندہ کر دیتا' لکھ دیتا یا نقش کر دیا کرتا۔

زندگی نت نئے تجربوں سے گزرنے لگی۔ کھانا پکانا مشغلہ بن گیا۔ پہلے ایک کاغذ پر ترکیب لکھتا' اطمینان کر لینے کے بعد دہراتا۔ پانچ نمبر میں ایک چھٹانک گھی ڈال کر نمبر سات (چولہے) پر چڑھائیں' ہلکی آنچ دیں۔ ایک پاؤ سوجی ڈالیں اور نمبر ایک سے ہلاتے جائیں...... کام کاج سے فارغ ہو کر پینتالیس نمبر سے گھر کی صفائی کریں۔

دفتر میں وہ گت بنتی کہ خدا کی پناہ' لیکن بیگے کے عزم کے سامنے طعن تشنیع' چھیڑ چھاڑ اور ساتھیوں کی چیرہ دستیاں سب ہیچ ہو گئیں۔ وہ کسی بھی طنز' مذاق ٹھٹھولین کو خاطر میں نہ لاتا۔ مضبوط چٹان کی طرح جم گیا کہ حالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں' وہ نوکری چھوڑ کر جانے والا نہیں۔ اُس کے سیکشن میں تمام دن جملے بازی ہوتی' جس میں سے اکثر کا رُخ اسی کی ذات ہوا کرتی۔ جسمانی ساخت' شکل و صورت' عادات اطوار' بول چال' لباس اور سادگی کے حوالے سے اُس کی شخصیت بیشتر ساتھیوں کا تختۂ مشق بنی رہتی۔ بات کہیں سے بھی شروع ہوتی تان اُسی پر آ کر ٹوٹتی۔ بیگا نوکری کے معاملے میں اتنا سنجیدہ اور پابندِ وقت ثابت ہوا کہ گھڑیاں غلط ثابت ہو سکتی تھیں لیکن وہ ایک منٹ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوتا تھا۔ دفتری اوقات سے پہلے دفتر پہنچتا۔ چھوٹے سے بڑے تمام افسران کی ہدایات پر حرف بحرف عمل کرتا۔ اپنی سیٹ پر فائلوں کو انتہائی سلیقے اور صفائی ستھرائی سے رکھتا۔ ایک منٹ کو بھی سیٹ چھوڑنے سے پہلے ہیڈ کلرک سے اجازت لینا' ضروری فائلوں کو الماری میں رکھ کر تالا لگاتا۔ ہر کارروائی تحت ضابطہ کرنا بیگے کا خاصہ تھا۔

دفتری امور میں اپنی استعداد بڑھانے کے لیے اُس نے بے پناہ محنت کی۔ سیکشن کے بعض طرار فرزار ساتھی خصوصاً اسلم گورایا اور نواز باجوہ کہا کرتے کہ بیگے جیسا most obedient servant افسران کا دماغ بگاڑ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کم بخت کا گلا گھونٹ دیں۔ سال ختم ہونے کے قریب سب نے بقایا اتفاقی چھٹیاں لے لیں۔ ساتھیوں نے اسے بھی ترغیب دی کہ وہ تمام چھٹیاں حاصل کرے کہ یہ اُس کا حق ہے ورنہ ضائع ہو جائیں گی۔ لیکن بیگے کے لیے دفتر حاضر رہنا ہی سب سے زیادہ دلچسپ امر تھا۔ خصوصاً اسلم گورایا اور نواز باجوہ نے اسے قائل کرنے کی بہت کوشش کی اور ساتھیوں کے ساتھ یک جہتی قائم رکھنے کی خاطر' مروجہ دفتری روایات پر عمل پیرا ہونے کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی۔ لیکن وہ خدا کا بندہ چھٹیاں انجوائے کرنے پر راضی نہ ہوا۔

سب ساتھی اُس کے اٹل فیصلے سے چڑ گئے۔ اُس کے عجیب و غریب نام رکھ دیئے' چوہا' کرلا' دفتر کی چھچھوندر' چمچہ' کڑچھا اور نہ جانے کیا کیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ظالمانہ مذاق کی شکایت بھی افسران سے نہ کرتا۔ شاید اس کی اٹل شخصیت نے بعض شوخ ساتھیوں کے پندار کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ رو میں بہہ کر وہ زیادہ ہی سنگین مذاق کرنے لگتے اور اسلم گورایا دست درازی پر اتر آتا۔ اس پر بھی بیگا حرف شکایت زبان پر نہ لاتا۔ گورایا چنگھاڑتا ہوا اُسے گلے سے پکڑ لیتا اور ہذیان بکنے لگتا......

''اوئے بیگیا بے غیرتا! تُو کس مٹی کا بنا ہوا ہے؟ بے شرما! مجھے تھپڑ مار' میرے گلے پڑ۔ اوئے کاٹھ کے اُلّو! اور کچھ نہیں کر سکتا تو دو چار گالیاں ہی سنا دے۔ کچھ تو کر۔'' پھر رونے کی اداکاری کرتے ہوئے بیگے کے آگے ہاتھ جوڑتا اور کہتا...... ''اللہ کے واسطے ایک گالی بک دے' میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔''

لیکن بیگے کے طرزِ عمل میں کچھ تغیر نہ آ سکا۔ کئی بار اُس کی کرسی پر گوند لیپ

دی گئی۔ اُس کا لباس چیک کیا مگر وہ مشتعل نہ ہوا۔

شروع میں بیگے کی انگریزی بہت کمزور تھی۔ نوٹ لکھنے میں اکثر حماقتیں سرزد ہوتیں۔ کئی لطیفے بنے جو دوسرے دفتروں میں بھی گردش کر گئے اور بہت مقبول ہوئے۔ اس کے باوجود افسران درگزر کرتے اور اس پر اعتماد کیا کرتے۔ رازداری قائم رکھنے کے حوالے سے اہم امور اسے سونپنے لگے۔ شہر سے دور تھل میں ایک دور دراز مقام پر رفاعی ادارہ قائم تھا۔ شکایات موصول ہوئیں کہ وہاں بہت گھپلا ہو رہا ہے۔

پچاس کی دہائی میں وہاں اونٹ اور جیپ ہی جایا کرتی تھی۔ افسر مجاز نے بیگے کو انکوائری افسر کے اختیارات تفویض کیے اور موقع پر جا کر ریکارڈ چیک کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ جہاں تک پختہ سڑک موجود تھی' بیگے نے بس سے سفر کیا۔ اس سے آگے چند میل اونٹ کا سفر تھا۔ حکم ہوا تھا کہ متعلقہ ادارہ کے عدم تعاون کی صورت میں بذریعہ ٹیلیگرام مطلع کیا جائے تاکہ ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب بذاتِ خود بذریعہ جیپ موقع پر پہنچ کر ضابطے کے تحت کارروائی کریں۔

اس سے پیشتر بیگے کو اونٹ پر سواری کرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اونٹ نے اپنی پیٹھ پر بیگے کو سوار کر کے اُٹھنے کے لیے پچھلی ٹانگیں سیدھی کیں تو اولا رسب آگے کی جانب ہو گیا۔ قبل اس کے کہ اونٹ اگلی ٹانگیں اٹھا کر سیدھا کھڑا ہوتا' بیگا زمین پر آ رہا۔ عجلت میں اٹھنے کی کوشش کی۔ شتربان نے بڑی تیزی اور مہارت سے اونٹ کو شُشکارا۔ ڈر تھا کہ کہیں گرا ہوا سوار اونٹ کے پاؤں تلے کچلا ہی نہ جائے لیکن تمام تر ممکنہ اقدام کے باوجود اونٹ کا اگلا پاؤں بیگے کے دائیں پاؤں پر آن پڑا۔ زمین ریتلی تھی اور پاؤں بوٹ میں محفوظ ورنہ چٹنی بنی پڑی ہوتی۔ پھر بھی خاصی داب لگی۔ احساسِ ذمہ داری کا مارا ''انکوائری افسر'' فطرتاً ہٹ کا پکا تھا۔ اٹھا اور اونٹ پر پھر سے سوار ہو گیا لیکن چند میل کا سفر طے کر کے منزل پر پہنچنے تک پاؤں سُوج کر کُپا بن چکا تھا۔

ساربان نے بازوؤں میں بھر کر نیچے اتارا۔ ادارہ میں پہنچ کر بجائے اس کے کہ کوئی دوائی دارو کر کے آرام کرتا' جھٹ ریکارڈ پر چھاپا مارنے کا قصد کیا۔ وہاں پر اُس وقت صرف ایک چوکیدار اور ایک ہی بابو موجود تھا۔ انہوں نے نہ صرف مزاحمت کی بلکہ بدتمیزی اور جھٹ پھٹی کا ارتکاب بھی کیا۔ بیگے نے اپنے افسر کو حسب ہدایت تار دیا۔ ''کیمل فالن' لیگ بروکن' پیپل ویری بیڈ۔ ریکارڈ کین ناٹ چیک۔ کم آن جیپ۔ شاہ بیگ۔''

(Camel fallen, leg broken, people very bad, record cannot check, come on jeep (Shah Baig)

یعنی اونٹ گر گیا۔ ٹانگ ٹوٹ گئی' لوگ بہت بُرے ہیں' ریکارڈ چیک نہیں کر سکتا۔ جیپ پر آئیں۔ (شاہ بیگ)

ٹیلیگرام نے ۲۳ میل کا سفر تین دن میں طے کیا۔ اس دوران میں بیگے کو بخار نے آن دبوچا۔ ٹیلیگرام جدھر جدھر سے گزرا قہقہے بکھیرتا گیا۔ جس جس کے ہاتھ لگا' دوسروں کو پڑھایا تاکہ ہر کوئی محظوظ ہو سکے۔ ہر کسی نے مضمون حفظ کر لیا۔ ڈپٹی ڈائریکٹر بڑا سڑیل مزاج افسر تھا لیکن ٹیلیگرام پڑھ کر ہنسا۔ وہ معاملے کی نزاکت کو بھانپ گیا۔ گو اسے یہ سمجھ نہ آ سکی کہ ٹانگ اونٹ کی ٹوٹی ہے یا بیگے کی اپنی لیکن قیاس کر لیا کہ ہو نہ ہو' فرض شناس ماتحت کسی مشکل میں ہے۔ جھٹ آرڈر ہوا کہ پراجیکٹ ڈاکٹر کو بلایا جائے۔ جیپ تیار ہوئی۔ ضروری عملے اور ساز و سامان کے ہم راہ روانگی ہو گئی۔ سوا گھنٹے میں ہی سرکل چیف بیگے کی تیمارداری کر رہا تھا۔

ان تین دنوں میں بستر علالت پر دراز ہونے کے باوجود بیگے نے اپنی سرکاری حیثیت کا ثبوت فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ عدم تعاون کی صورت میں ملازموں کو پیش آمدہ متوقع انضباطی کارروائی کے ضرر رساں نتائج سے آگاہ کر کے بابو اور چوکیدار سے تمام ریکارڈ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ڈپٹی ڈائریکٹر کو بیگے کے احساسِ

ذمہ داری پر بڑا پیار آیا۔ دل سے تیمارداری کی' گویا پتھر میں جونک لگی تھی۔ یہ بیکے کی خلوص نیت اور اٹل شخصیت کا کرشمہ تھا۔ ڈاکٹر نے ضروری ابتدائی طبی امداد اور درد میں افاقے کی دوا دی۔ ریکارڈ جیپ میں ٹھونسا گیا۔ سٹاف کو واپسی کا سفر اونٹ پر کرنے کا حکم ہوا۔ ڈپٹی صاحب' ڈاکٹر اور بیکے کو جیپ میں بٹھا کر واپسی کے سفر پر روانہ ہوئے۔

دفتر میں بات بے بات 'کیمل فالن۔ لیگ بروکن' کی گردان ہوتی رہتی۔ اب تیچ کڑ چھے کے علاوہ صاحب کا لاڈلا اور راج دلارا کے القابات کا اضافہ ہو گیا۔ ڈپٹی صاحب نے گھر پر رہ کر آرام کرنے کی ہدایت کی تاکہ موصوف جلد صحت یاب ہو سکیں۔ دفتر کے ساتھی گھر پر تیمارداری کے لیے آتے رہے۔ باجوہ نے پیار پیار میں سمجھایا کہ سرکاری ضابطے کے مطابق بغیر درخواست گھر چھٹی پر رہنا' سروس رُول کے خلاف ہے لہٰذا بہتر ہو گا کہ Maternity Leave کے لیے درخواست دے دی جائے۔ بیکے نے اعتماد میں آ کر لکھی ہوئی درخواست پر دستخط کر دیے۔

درخواست دفتر پہنچ گئی۔ لیکن اب ہوا کا رخ بدل چکا تھا۔ بجائے اس کے کہ درخواست کے مندرجات سے کوئی چھوٹا افسر لطف اندوز ہو کر اسے نظر انداز کر دیتا' معاملے کی اصلیت کو بھانپ کر درخواست بمعہ ضروری رائے برائے ملاحظہ بحضور ڈپٹی صاحب پیش کر دی گئی۔ انکوائری ہوئی اور نتیجے کے طور پر باجوہ معطل ہو گیا۔ بیکے کو خبر ہوئی تو ڈپٹی صاحب کے حضور حاضری دی۔ انہیں یقین دلایا کہ باجوہ اس کا دوست ہے' لہٰذا اسے بحال کیا جائے۔ عرضی منظور ہوئی۔ یہ سب کے نزدیک انوکھا تجربہ تھا کہ بیکا جو ہر حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا تھا' اپنے طور پر ڈپٹی صاحب کے سامنے کیسے پیش ہو گیا اور فرعون طبع افسر کو قائل بھی کر لیا۔

باجوہ نوکری پر بحال ہو کر بھی اپ سیٹ رہا۔ حسب سابق بیکے کی منت سماجت کرنے لگا۔ "او اللہ کے نیک بندے! مجھے تھوڑا سا ذلیل کر دے۔ کچھ بُرا بھلا

ہی کہہ۔ اوئے بے زبان مال! ایک دولتی ہی مار دے۔ میں اس کا مستحق ہوں۔ مجھے محروم نہ رکھ۔" بگے کا جواب اور استدلال نرالا تھا' وہ کہتا۔ "غلطی میری ہے کہ میں انگریزی میں کمزور ہوں۔ اپنی انگریزی کی استعداد میں اضافہ کروں گا تا کہ آئندہ ایسی صورت حال کا اعادہ نہ ہو۔"

دفتری معاملات میں بگے کی استعداد کار میں اضافہ روز افزوں تھا۔ لیکن انگریزی میں بونگیاں مارنا کم نہ ہو سکا۔ ایک چٹھی کے بارے میں بگے کی رائے تھی کہ داخل دفتر کر دی جائے اور ریمارکس لکھے: "مے بی فائیلڈ" (May be filed) صاحب نے استفسار کیا۔ "وائی فائل (Why File) یعنی کیوں داخل دفتر کیا جائے۔ گویا جواز فراہم کرو۔ بگے کے پاس فائل واپس آئی تو بجائے داخل دفتر کرنے کا جواز بیان کرتا' اُلٹا سوال کر دیا اور لکھ دیا۔ "وائی ناٹ فائل" (Why not file) مطلب یہ ہوا کہ صاحب بتائے کہ اسے داخل دفتر کیوں نہ کیا جائے۔ یہ واقعہ دیگر محکموں کے دفاتر میں بھی گردش کر گیا اور اکثر لوگ ایک ہی سانس میں دہراتے "مے بی فائیلڈ۔" وائی فائل۔ وائی ناٹ فائل؟"

بگے کے گھر کے سامنے خالی پلاٹ کے کونے میں ایک چھپر کے نیچے تنور تھا' جس کی مالکن کا اصل نام فتح خاتون تھا لیکن عرف عام میں بہت کھاتوں کہلاتی۔ وہ سکیسر کے دامن میں واقع ایک ڈھوک سے آ کر یہاں آباد ہوئی تھی۔ اُجلی رنگت' تراشیدہ جسم اور آریائی نین نقش ایسے پُرکشش تھے کہ شہر کے بیشتر چھڑے روٹی وہاں سے لینے آیا کرتے۔ اسی اثنا میں وہاں پٹوار سکول کا اجرا ہوا۔ میانوالی سے لائل پور تک' دور دراز کے زیر تربیت پٹواری سینکڑوں کی تعداد میں وارد ہوئے۔ ان میں سے بیشتر نے طلب علم کم اور دیگر شوق زیادہ پالے ہوئے تھے۔ بعض رات کو گھروں کی دیواریں پھاند کر چوری چکاری بھی کر لیتے۔ کچھ ہاتھ نہ لگتا تو صحن میں بنی رسویوں میں سے

اشیائے خور و نوش اور چھکے میں لگی ہانڈیاں سالن سمیت اٹھا لے جاتے۔ باغوں سے پھل توڑتے اور خوانچوں سے چھینا جھپٹی کرتے۔ میلہ لگتا' کالج میں فنکشن یا مشاعرہ منعقد ہوتا تو اس کی بساط الٹ دیتے۔

روٹیاں لگاتے ہوئے تنور میں دہکتے انگاروں کی روشنی بھت کھاتوں کے چہرے پر سو شفق رنگ بکھیر دیتی۔ اس کا کاروبار ترقی کرنے لگا۔ اب وہ محض تنور نہ رہا بلکہ ایک قسم کا چھپر ریسٹورنٹ بن گیا تھا' جہاں ون ڈش اور تازہ روٹی دستیاب ہوتی۔ دال' سبزی یا موٹا گوشت' لوگ کھڑے کھڑے ہی کھا لیتے۔ بھت کھاتوں کا خاوند خادم کھاڈو ماچھی کے نام سے مشہور تھا۔ احمق شخص اپنے کاروبار کی ترقی کی اصل وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ بھت کھاتوں کے ذاتی کردار کا کمال تھا کہ بظاہر وہ قدرت کا خوبصورت شاہکار تھی لیکن اندر سے مضبوط چٹان۔ جس پر کسی بابو کی پتلون' حاضر سروس پٹواری کی اچکن ٹوپی اور کسی ملک کا پگڑ فتح یاب نہ ہو سکا۔ وہاں سوائے درشن بازی کے اور کسی کو کوئی فیض حاصل نہ ہوا۔ وہ سمجھ دار تھی۔ اپنے کاروبار میں برکت اور ہوٹل میں ہمہ وقت بھیڑ کے اصل سبب سے بے خبر نہیں تھی۔

ایک مرتبہ رانجھا مزاج ایک زیر تربیت پٹواری نے چھپر کے نیچے کچھ فاصلے پر کھینچی ہوئی خیالی حدِ متارکہ پار کرنے کی کوشش کی تو حسبِ روایت اس کا راستہ روکا گیا۔ وہاں جب کوئی حد سے بڑھتا تو بھت کھاتوں کے ہاتھ میں آنے کا پیڑہ' گرم روٹی' دال سے بھرا چمچہ' جلی ان جلی لکڑی' آہنی کونڈی یا کھرچنی' تجاوز کرنے والی شخصیت کی راہ میں حائل ہو جاتی۔ لیکن ایسا صرف چند ایک بار ہی ہوا ہو گا۔ پھر امن و امان ہو گیا اور شرافت کا دور دورہ۔ کسی بھلے مانس گاہک سے پوچھا جاتا کہ آخر اتنا خوار ہو کر طعام کرنے سے حاصل؟ یار لوگ دال اور تازہ روٹی کی تعریف کرنے لگتے۔ کچھ سچے کھرے لوگ دل کی بات بھی کہہ جاتے۔ ایک سرکاری اہل کار' ابرار احمد عثمانی' جو اہلِ

زبان اور نیم شاعر بھی تھے' فرماتے ...... ''بھئی! ہم وہاں ماہِ کامل کو غسلِ شفق کرتے ہوئے دیکھنے جاتے ہیں۔'' وہ صاحب تنور کی شہابی روشنی میں خاتون کے نہائے ہوئے حُسن کی تعریف بڑے خوبصورت پیرائے میں کیا کرتے۔

بھت کھاتوں نے ایک پلاٹ خرید لیا اور پچھلے حصے میں کچے پکے دو کمرے بنا لیے۔ اُس کی بیٹی کا نام ست بھرائی تھا لیکن سب لوگ اسے ستاں' ستی' ستو اور بعض چھتو کہہ کر پکارتے۔ بڑی اتھری' بیوقوف' منہ پھٹ اور منہ زور لڑکی تھی۔ اونچی آواز میں بولتی' لڑکوں کی طرح سیٹیاں بجاتی' چلنے کی بجائے دوڑتی' وہ بھی ننگے پاؤں اور ننگے سر۔ عمر اس کی چودہ سال ہونے کو تھی۔ ہر چھوٹا بڑا کھیل کھیلنے پر ہمہ وقت آمادہ۔ لڑکیاں تو درکنار لڑکوں سے بھی' خواہ وہ گلی میں پٹھو گرم کھیل رہے ہوتے' گلی ڈنڈا یا کبڈی' وہ چوکڑیاں بھرتی آدھمکتی۔ ماں سے خوب گالیاں سنتی اور ہر کام کرنے سے پہلے چھتر پریڈ ضرور کرواتی۔ وہ چار لتر چھتر کھا کر بھی نہ کرتی۔ ہاں کبھی برسات ہی ہو جاتی تو تھوڑا سا روتی مگر ذرا سی پسند کی چیز دیکھ کر بہل جاتی۔ پرلے درجے کی ڈھیٹ' فوراً ماں سے راضی ہو جاتی۔

بیگا چوبیس سال کی عمر میں پینتیس چھتیس کا لگتا تھا۔ بھت کھاتوں خود تینتیس چونتیس کی تھی لیکن پچیس سے بھی کم کی دکھائی دیتی۔ نہ جانے بیگا کیوں جن بن کر اس کے دماغ میں گھس گیا۔ بقول لوگوں کے شکل نہ صورت' عقل نہ مت' جسم کی تمام چولیں ڈھیلی ڈھالی' لباس بے ڈھب لیکن بھت کھاتوں نے ایک نہ مانی۔ اُس کی ایک ہی رٹ تھی کہ داماد ہو تو بیگا۔ وہ ایک گلی کے لوگوں کو بیچ میں ڈالا اور ستاں سے اس کی منگنی کر دی۔ بیگا اب ہر وقت شرمایا ہوا رہنے لگا۔ لیکن ستاں کی ہوش مت ابھی اُسی طرح اتھری بچھیری کی طرح بے قابو تھی۔

تمام رقیبوں نے اپنے اوپر لعنت بھیجی اور بھت کھاتوں کو کھری کھری سنائیں اور مت ہونے کا طعنہ دیا کہ اپنے سے بڑی عمر کے بدشکل نیم پاگل بندے کو داماد بنا رہی ہے۔

لیکن بگے کے دفتر کے ساتھیوں کو خوشی ہوئی۔ گورایا اور باجوہ پیش پیش رہے۔ نکاح کر دیا لیکن رخصتی کے لیے ڈیڑھ ماہ کا وقفہ رکھا گیا۔ اس دوران بگے نے ازدواجی زندگی سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے مطالعہ شروع کر دیا اور بڑی سنجیدگی سے اپنے آپ کو آئندہ نئی زندگی میں ڈھالنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ اسی تگ و دو میں نہ جانے کہاں سے کون سا نسخہ ہاتھ آ گیا کہ پینتالیس چوزے خرید کر اپنے کمرے میں لا رکھے۔ پہلے روز مختلف یونانی دوائیاں' پستے' بادام' انڈے اور مختلف جڑی بوٹیاں کوٹ چھان کر باہم ملا کے مرکب تیار کیا۔ پھر اسے چورا کر کے تمام چوزوں کو خوراک کے طور پر دینا شروع کر دیا۔

دوسرے روز ایک چوزہ ذبح کر دیا اور اس کا تمام گوشت اور ہڈیاں کوٹ پیس کر پہلے سے تیار کردہ مرکب میں ملا کے باقی چوالیس چوزوں کو کھلا دیا۔ اسی طرح ہر روز ایک چوزہ بقیہ تمام چوزوں کی خوراک بن جاتا۔ بالآخر ایک چوزہ جو باقی بچا اب مرغ بن چکا تھا' آخری روز بگے کی خوراک بنا۔ وہ رخصتی کا دن تھا۔ بگے نے سوچا کہ دلھن کے لیے کوئی تحفہ خریدا جائے۔ آخر کیا چیز؟ پٹھو گرم کی گیند' گلی ڈنڈا' کوئی ہاکی بلا' نہیں نہیں۔ خود کو تسلی دی' اب وہ ایسا نہیں کرے گی۔ گھرداری کی ذمہ داریاں کندھوں پر پڑیں تو تمام بچوں والے کھیل کود خود ہی چھوڑ دے گی۔ اچھا چوڑیاں' کوئی ہار وغیرہ......

بگا بازار گیا۔ ستاں پکوڑے بہت شوق سے کھاتی تھی۔ پکوڑے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ رخصتی شام کو ہونی تھی۔ خیر کوئی بات نہیں' وہ چھ دن کے باسی بھی کھا لیتی ہے۔ ایک پاؤ پکوڑے' ایک پاؤ جلیبی' تھوڑے سے بیر' ایک ٹکی پتیسہ' تھوڑی سی برفی ایک ٹکڑا ڈھوڈے کا۔ وہ کیا کیا لے؟ ستو ہر چیز کھا لیتی ہے۔ بس اب یہ چوڑیاں اور رولڈ گولڈ کا ایک ہار۔ آئندہ ایک ہفتے کا راشن۔ آدھ آدھ کلو دالیں' چنے' چاول' نمک مرچ' متوقع مہمانوں کے لیے سودا' سسر کے لیے پشاوری تمباکو جو وہ اپنے پستول نما

حقے کی نغمی سے چلم میں بھر کر بھرپور کش لگاتا تو دھوئیں کا بڑا سا مرغولہ پھیل جاتا۔ ساس کی تواضع کے لیے کالا پڑا' جس سے وہ شغف فرماتی تھیں۔ بیگے کے پاس لفافے ہی لفافے اکٹھے ہو گئے۔ خاکی کاغذ کے لفافے' اخباری کاغذ کے لفافے' امتحانی پرچوں' ردی کتابوں' رسالوں اور کاپیوں کے کاغذ سے بنے لفافے۔ ڈھیروں لفافے بیگے نے خاکی زین کے بنے ہوئے بڑے سے تھیلے میں بھرے اور گھر کو چل دیا۔

شام کو ہوٹل کا کاروبار بند رہا اور رخصتی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ستاں کی تلاش ہوئی۔ سکول کی گراؤنڈ میں لڑکوں لڑکیوں کے پیچھے ہلا ہلا کرتی بھاگ رہی تھی۔ بچے اسے تنگ کر رہے تھے۔ ساتھ کھلانے کی بجائے بار بار چھیڑ رہے تھے۔ ''اوئے اوئے ستاں کا ویاہ بیگے کے ساتھ' اوئے اوئے''۔ ستاں غصے میں بھری سب کو کوسنے دیتے ہوئے بآوازِ بلند کہہ رہی تھی۔ ''تمہاری بہن کا ویاہ ہو بیگے کے ساتھ۔ تمہاری ماں کا ویاہ ہوگا بیگے سے۔ بیگے کی ماں کا ویاہ ہو میرے ابے سے۔'' ستو کو بالوں سے پکڑ کر گھر لایا گیا۔ گلی میں بیگے کی بارات کھڑی تھی۔ چمٹی اور ڈھول بج رہا تھا۔ باجوہ اور گورایا ناچ رہے تھے۔ باقی دفتر کے ساتھی مل کر گا رہے تھے۔ ''سانوں ساری خدائی اِک پاسے' تے ساڈا بیگا بھائی اِک پاسے۔''

ڈھول باجے کا بندوبست بیگے کے ساتھیوں نے کر رکھا تھا۔ اسی اثنا میں ایک ساتھی نے مٹھی بھر ریزگاری ہوا میں اچھال دی۔ ایک چھناکا ہوا اور گول گول سکے دلھن کے صحن میں بکھر گئے۔ بچے سکوں پر جھپٹ پڑے۔ چند ہی لمحوں میں دوسرا چھناکا ہوا۔ ستاں کے ضبط کی طنابیں ٹوٹ گئیں۔ دوسری تیسری چوکڑی میں بچوں کے ہجوم میں بپھری ہوئی منہ زور بچھڑی کی طرح روندتی لتاڑتی آگھسی اور ریزگاری ڈھونڈنے لگی۔ دو چار کو دھکے دیئے اور اِدھر اُدھر جھپٹی۔ چیخی چلائی...... ''حرامیو! ویاہ میرا ہے اور پیسے تم لوٹ رہے ہو؟''

طرح طرح کے استقبالی نعرے اور قہقہے بلند ہوئے۔ آدھی بنی سنوری دُلھن پھر سے گھسٹتی ہوئی کمرے میں واپس لے جائی گئی۔ بارات کھانا کھانے میں مشغول ہو گئی۔ گلی میں اچھی خاصی رونق ہو گئی تھی۔ قلفی کھوئے ملائی والی' لچھے بڑے اچھے' پاپڑ کرارے' بہت کچھ گلی میں دستیاب تھا۔ ابھی سب مہمان کھانے سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ ایک ریڑھی کے پاس بچوں کا نعرۂ تحسین بلند ہوا......''اوئے ستی ووہٹی بنی ہوئی۔'' اور ستاں اپنے بناؤ سنگھار سے بے پرواہ ہو کر بڑی بڑی دو دو آنے والی قلفیاں کھائے جا رہی تھی۔ گھر میں تمام عورتیں بیگے کے اردگرد گھیرا ڈالے اس کا ناطقہ بند کیے ہوئے تھیں۔ پھت کھاتوں نے دلھن کو کمرے سے غائب پایا تو باہر گلی میں اسے پا کر واپس گھر میں پلٹ آئی اور گلی تلاش کرنے کوئی ڈنڈا سوٹا۔ عورتوں نے معاملہ بھانپ کر پھت کھاتوں کو روک لیا۔

دوست احباب رخصت ہو گئے۔ دُلھن' دُلہا کے گھر آ چکی اور کمرے میں چارپائی پر بیٹھی تھی۔ بیگا بھرے ہوئے تھیلے میں ہاتھ مارنے لگا کہ دُلھن کے لیے لائے ہوئے تحفے ملیں تو اُسے پیش کیے جائیں۔ ستاں کو دُلھن بننے کے لوازمات میں سے کپڑے اور بناؤ سنگار کی حد تک سب اچھا ہی لگا لیکن بیگے سے بڑی چڑ ہو رہی تھی۔ دل ہی دل میں اُس کو کوسنے دے رہی تھی۔ وہ سامنے فرش پر بیٹھا تھیلے میں ہاتھ مار رہا تھا۔ ستو کو بیگے پر طاری اُلجھن اور ہونقوں کی سی حالت پر ہنسی آ رہی تھی۔ تجسس بھی بڑھ گیا تھا کہ آخر تھیلے میں ہے کیا؟ نہ جانے بیگے نے تھیلے میں کیسے کیسے اُلٹے سیدھے ہاتھ مارے کہ مرچ تمبا کو پکوڑے گڈمڈ ہو گئے۔

بالآخر بیگے نے ایک ایک کر کے ہر چیز تھیلے میں سے نکال کر فرش پر رکھ دی۔ ہار اور چوڑیاں جھاڑ پونچھ کر ایک طرف کیں۔ جلیبیاں' پکوڑے' برفی' ڈھوڈا' چیسہ الگ الگ کیا۔ دل ہی دل میں کچھ سوچا اور پھر جلیبیاں پیش کر دیں۔ ستو اکثر سودے میں

سے ایک آنہ بچا کر مٹھائی والے سے پورا مٹھائی لے کر کھایا کرتی تھی اور اس وجہ سے گھر آ کر ماں سے جوتوں کی ایک خوراک بھی لینی پڑتی۔ آج اُس نے انواع و اقسام کی مٹھایاں سالم حالت میں اپنے سامنے دیکھیں تو دماغ میں طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ نہ جانے چشم تصور سے کیا تصویر دیکھی اور دماغ نے پیش آمدہ حالات کا کیسا خاکہ کھینچا' کچھ سمجھی کہ نہ سمجھی' یا سمجھی تو کیا سمجھی کہ دوسرے ہی لمحے چھلانگ لگا کر چارپائی سے نیچے کود گئی۔ دو ہی چوکڑیوں میں صحن پار کر کے گلی میں ننگے پاؤں آ کھڑی ہوئی۔ حلق کی پوری قوت سے تمام اہل محلہ کو مخاطب کر کے بولی: "وے لوگو! بیگا مجھے جلیبیاں دے رہا ہے۔ بے شرم! جلیبیاں کھلائے اپنی ماں بہن کو۔ ساری خیاری اٹھالایا ہے اور مٹھائی کی پوری دکان۔ اماں کہتی تھی بڑا شریف ہے۔ کھتا ہے کھتا' بدمعاش کہیں کا۔"

بیگا اندر سانس روکے بیٹھا رہا اور باہر ہاہا کار مچ گئی۔ چند ہی لمحوں میں شور شرابے' چیخ چیخ' ہاہا خاخا کا طوفان بپا ہو گیا۔ بہت کھاتوں نے چٹیا سے پکڑ کر دلھن کو دلہا کے گھر کی جانب دھکیلا تو ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گئی اور لگی واسطے دینے......"اماں مجھے بچالے وہ بڑا خراب ہے۔ تجھے خدا رسول کا واسطہ"......وہ گلا پھاڑ کر درد اور خوف سے پھوٹ پھوٹ کر روئی تو محلے کی عورتوں کو ترس آ گیا۔ ماں کا دل بھی پسیج گیا۔ دھپے مارتی ہوئی گھر لے گئی اور ساتھ لٹایا تو وہ سسکتی بلکتی ماں سے لپٹ کر سو گئی۔ بہت کھاتوں کو بیٹی پر پیار آ گیا۔ اسے چومتی اور روتی رہی......"جھلیے! تجھے کیا پتا' میں نے کیوں تیرا ویاہ کر دیا ہے؟ پہلے ہی یہاں بڑے بھگیاڑ (بھیڑیئے) تھے اور اب پٹوار سکول بھی کھل گیا ہے۔"

قاضی صاحب کی اماں یعنی بی بی جی سے سارے لڑکے لڑکیاں قرآن پاک پڑھتے تھے۔ ستاں نے بھی کل تین سیپارے انہی سے پڑھے ہوئے تھے۔ ماں اور پڑوس کی عورتیں ناکام ہو گئیں تو بی بی جی کو بلایا گیا۔ انہوں نے ستاں کو بڑے پیار سے

سمجھایا...... "دھیئے! وہ تیرا مجازی خدا ہے۔ اُس کا حکم مان لے۔ نہیں تو دوزخ کی آگ میں سڑو گی۔" یوں تو ستاں' بی بی جی کا بڑا احترام کرتی تھی' اُن کا ہر حکم مانتی رہی لیکن آج اسے بڑا دکھ ہو رہا تھا کہ کیسی اچھی اچھی عورتیں بھی ایسی گندی گندی باتیں کر رہی ہیں۔ اُس نے سب کو صاف صاف سنا دیا...... "خبردار! سب کان کھول کر سن لو۔ کوئی بے شرمی والی بات نہیں ہو گی۔ تم سب خراب عورتیں ہو۔ اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔ اللہ سے ڈرو۔ بیگا بے چارہ خدا کیسے ہو گیا؟ توبہ توبہ! وہ شہدا اتنے جوگا نہیں اور میں دوزخ کی آگ سے نہیں ڈرتی۔ وہ اماں کے تندور کی آگ سے زیادہ سخت نہیں ہو گی۔ تم سب اللہ سے معافی مانگو اور آئندہ ایسی خراب باتیں کبھی زبان پر مت لانا۔"...... ماں نے اتنے دن بڑا ضبط کیے رکھا لیکن اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ تنگ آ کر دلھن کی چھترپریڈ شروع کر دی۔

صبر کا دوسرا نام بیگا تھا۔ شادی کو پانچ سال گزر چکے تھے۔ وہ ترقی کر کے ہیڈ کلرک بن چکا تھا۔ بہت سے لوگ اسے شاہ بیگ بلکہ شاہ بیگ صاحب کہنے لگ گئے تھے۔ اللہ نے اُسے ایک بیٹا دیا۔ اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ بڑا حیران تھا کہ قدرت اس پر اتنی مہربان بھی ہو سکتی ہے۔ یہ زندگی کا بڑا خوبصورت تجربہ تھا جس کے رونما ہونے سے پہلے وہ اس خوش گوار تبدیلی کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے احساسات اور جذبات کو کوئی نام دینے سے قاصر رہا۔ اسے باپ بننا بڑا اچھا لگا۔ بیٹا گورا چٹا تھا' جیسے اپنی نانی یا کچھ کچھ ماں کا عکس ہو۔

مشابہت کسی سے بھی ہو' یہ احساس ہی جاں فزا تھا کہ دنیا میں کوئی اُس کا اپنا ہے۔ جسے وہ بلا جھجک اپنا لختِ جگر کہہ سکتا تھا۔ خدا نے بیٹا دے دیا لیکن ستاں چند روز تک موت سے لڑتی رہی اور اپنی نشانی چھوڑ کر زندگی کی بازی ہار گئی۔ اس صدمہ پر سب جاننے والے بھی دکھی ہو گئے۔ بیگے کو شادی سے پہلے کے وقت کی ستاں یاد آ گئی......

اچھلتی کودتی' شور مچاتی' ننگے سر ننگے پاؤں' گلیوں میں بھاگتی' اس کے دفتر کی راہ میں لگے
توت کے درختوں پر بندریا کی طرح چڑھی' توت کھاتی ہوئی' کھلنڈری اور بے پرواہ......
وہ سوچتا...... ابھی تو بے چاری کے کھیلنے کے دن تھے۔ اُنیس سال بھی کوئی مرنے کی عمر
ہوتی ہے۔ اب کہیں وہ نکھری اور جوان ہونے لگی تھی۔ کچھ زمانے کی ہوش آئی تھی۔ اپنے
خاوند کو "وہ" اور "بیگا شہدا" کی بجائے "شاہ بیگ" کہنا سیکھی ہی تھی کہ مر گئی۔

اسے یاد نہ تھا کہ زندگی میں آخری بار کب رویا تھا۔ لیکن ستی کو قبر میں دبا کے
گھر لوٹا تو رات کو تنہائی میں جی بھر کے رویا۔

بیٹے کا نام امیر سلطان رکھا۔ پیار سے سوہنا کہتا۔ وہ نانی کے پاس پلتا رہا۔
دفتر سے واپسی پر بیگا اپنے پاس لے آتا۔ اسے نہلاتا سنوارتا' اور پوتڑے خود دھوتا۔
اس کی زندگی کے تمام معمولات بدل گئے۔ حکمت کا نسخہ' کھانا پکانے کی ترکیب یا کوئی
تجربہ کرنا' کچھ بھی زندگی میں نہ رہا۔ اس کی تمام تر زندگی دفتر کے بعد گھر اور سوہنے کی
ذات میں سمٹ آئی۔ اکٹھے پھرنا' گود میں اٹھائے' بغل سے لگائے اور کندھوں پر
بٹھائے' بازاروں میں' میلوں ٹھیلوں میں' بالی جی کے تھیٹر پر' لاری اڈا' ریلوے سٹیشن'
ٹرین کی آمد پر' نہر کے کنارے' باغوں اور کھیتوں میں۔ ہر اُس جگہ جہاں رونقیں ہوتیں
یا سوہنے کی دلچسپی کا سامان۔

سوہنا جوں جوں بڑا ہوتا گیا' بڑی پیاری پیاری باتیں کرنے لگا۔ ننھے ہاتھوں
کی نرم ہتھیلیاں باپ کے دونوں گالوں پر جما کر منہ چومتا تو اُس کے جسم و جان میں نئی
نویلی تازہ روح سرایت کر جاتی۔ گردن میں بانہیں ڈال کر اپنی سی قوت سے بھینچتا اور
سینے سے لپٹ کر پیار کرتا۔ بیگے کی زندگی میں ایسی بہار آئی' اتنے پھول کھلے کہ ہر سُو گل
و گلزار لہرانے لگے۔ پور پور' ایک ایک روئیں میں محبت کی مہک رچ بس گئی۔ وہ خانہ
ویران' جس کے دل کا آنگن روئیدگی کے عمل سے ہی ناآشنا تھا۔ گزشتہ تمام عمر طویل

ترین بے مقصد مسافتوں کے راہی کی مانند چلتا رہا۔ منزل کا پتا تھا نہ انجام کی خبر۔

محبت کا ہی کرشمہ تھا کہ مقدر کے اندھیروں میں ایک جگنو کیا چمکا' رنگ و نور کی بارش ایسے کھل کر برسی کہ تنہائیوں اور مایوسیوں کی سیاہیاں دُھل گئیں۔ زندگی کے وہ گوشے' جہاں وحشت ناک سناٹا محیط رہا وہاں نغموں کا ہجوم ہونے لگا۔ ساری بیزاری' اکتاہٹ اور بے مقصدیت کا گدلا پن دھل گیا۔ وہ سرتاپا نکھر گیا۔ محبت میں کیا جادو ہے؟ یہ ایسے کرشمے بھی دکھاتی ہے کہ سوکھے ٹھنٹھ ہرے ہو جاتے ہیں۔ کونپلیں اور پھول کھل اٹھتے ہیں۔ اجاڑ میں بہار آ جاتی ہے۔ خنک ہوائیں چلیں' نرم پھواریں برسیں اور بے رنگ زندگی میں سَو رنگ نکھریں۔ کبھی اُس نے اپنے لیے ایسا تصور نہیں کیا ہوگا۔ آسمان پر چمکتا سورج' رات کو چاند اور ستارے' فضاؤں میں اڑتے بادل' قوسِ قزح کے رنگ' لہلہاتے کھیت' سرسبز شاداب جنگل اور باغات' پھل پھول' خوبصورت چہچہاتے پرندے' پہاڑ میدان ندی نالے' سب کچھ تھا لیکن زندگی کے گئے دنوں میں ان پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ گویا اُس کا اِن سے کیا سروکار؟ نہ جانے یہ سب کس لیے ہوتا ہے؟ سب کچھ بے معنی تھا۔ لیکن اب فطرت کے ہر اس عمل میں راحت محسوس ہونے لگی۔ خواہ وہ نمو کا عمل تھا' طلوع و غروب' تغیر و تبدل' دھوپ چھاؤں یا بارش' سبھی اچھے لگتے تھے۔ سوچتا کہ سب کچھ اُسی کے لیے اور اُس کے محبوب بیٹے کے لیے ہے۔ تاکہ وہ دونوں خوب لطف اندوز ہوں۔

دل میں خیال کرتا' کاش وہ اور اس کا بیٹا بہت طویل عمر تک زندہ رہیں۔ بدلتے موسم اور بہاریں ہزار بار دہرائی جائیں اور یہ سب کچھ میرے بیٹے کے لیے راحتِ جاں بنے۔ قدرت اس کے لیے زندگی میں آسانیاں پیدا کرے۔ ہر کوئی اُس کا دوست ہو۔ وہ ہر لطف سے بہرہ ور ہو۔ فطرت کے ہر خوبصورت روپ سے فیض یاب ہو۔ کوئی بھی دشواری اُس کی راہ میں حائل نہ ہو۔ اگر میں نے اپنی عمر کے گزشتہ سالوں میں کچھ

کٹھنائیاں اپنے دامن میں نہیں سمیٹیں تو ان کے عوض اپنے سوہنے بیٹے کی آئندہ سوسالہ زندگی کی راہوں کے تمام کانٹے اپنی پلکوں سے چن لوں۔ وہ سدا خوش رہے۔ جس نے اپنی محبت کے صدقے میں مجھے زندگی کا جاں فزا حسن اور دل کی راحت بخشی ہے۔

دل میں خیال گزرتا کہ شاید وہ اسی کے لیے اب تک دنیا کی ٹھوکروں پر بھی زندہ رہا۔ سنگین مذاق اور زمانے کی سفا کیوں نے بھی ٹوٹنے نہ دیا۔ شاید اس کے اندر زندہ رہنے کی اُمنگ کسی ایسے ہی مرحلے کی منتظر تھی جہاں سے اتنی خوشیاں ملتی تھیں کہ دامن میں سمیٹنی محال ہو جائیں۔ اُس کے بیٹے کو محض امیر سلطان کے نام سے کوئی بھی نہیں پکارتا تھا۔ عرفِ عام میں سوہنا اور لکھنے میں سوہنا امیر سلطان لکھا جاتا۔ وہ صرف خوبصورت ہی نہیں' بلا کا ذہین بھی تھا۔ بیگے نے اسے بہت ہی چھوٹی عمر میں پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ سکول جانے کی عمر تک وہ بہت لائق ہو گیا' اپنے ہم جماعت لڑکوں سے کئی قدم آگے۔ سوہنا اپنا ہر شوق بھی پورا کرتا۔ ہر قسم کے کھلونوں سے کھیلنا' ہر تفریح سے لطف لینا' شہر میں بالی جٹی کا تھیٹر لگے یا عنائت حسین بھٹی کا' آموکہ والے نٹ آئے ہوئے ہوں یا اوپن ایئر سینما میں فلم لگے' ریچھ کتے کی لڑائی ہو یا نیزہ بازی' سوہنا اپنے باپ کے ساتھ ہر جگہ پہنچتا۔ لوگ کہتے کہ باپ شریف تھا لیکن بیٹے نے اپنی سنگت میں بگاڑ دیا۔ نانی پیار سے سرزنش کرتی...... "بدمعاشا! تُو نے باپ کو بھی اس عمر میں خراب کر دیا ہے۔"...... اچھا کھانا' اچھا لباس اور ہر قسم کے کھلونے۔ بیگے کا گھر سوہنے کے کھلونوں اور استعمال کی دیگر اشیا سے بھر گیا۔ جیسے کھلی منڈی میں کسی ارزاں جنس کا ڈھیر لگا ہوا۔

بیگے کو زندگی کی کوئی محرومی یاد نہ رہی۔ وہ بے کیف دن رات' پھیکے کڑوے کسیلے' گزرنے میں ہی نہیں آتے تھے۔ وہ ایک ایک پل کا بوجھ سینے پر برداشت کرتا جیسے ہر دم حالات کی بے رحم سولی پر لٹکا ہوا ہو۔ لیکن اب صورت مختلف تھی۔ محبت کے

امرت نے ہر خوشی وافر دامن میں بھر دی تھی۔ دن رات ایسے گزرنے لگے جیسے لمحے۔ وہ چاہتا کہ کسی طور ان خوبصورت دنوں پر اپنی گرفت مضبوط کر لے۔ ان کے گزرنے کی رفتار پر قدرت حاصل کر لے۔ وہ اپنی خوشیوں کا ایک ایک پل کیش کرانا چاہتا تھا۔ زندگی سے اپنا تمام ادھار وصول کرنا چاہتا تھا۔

ستاں اکثر یاد آ جاتی' جس نے جان کی بازی ہار کر اتنا خوبصورت تحفہ دیا تھا...... کاش وہ بھی زندہ ہوتی۔ تینوں مل کر زندگی کے مزے لوٹتے۔ اب اُس کی تنخواہ معقول ہو چکی تھی۔ مختصر کنبہ خوش حالی میں گزر بسر کر سکتا تھا۔ آخر مالکِ کائنات کے خزانے میں کون سی کمی ہو جاتی اگر وہ تینوں ایک ساتھ زندہ رہے ہوتے۔ جہاں اس کی دنیا میں کروڑوں لوگ آباد ہیں' کثیر الاولاد لوگ' جن کے بڑے بھی سو سو سال کے ہو کر نہیں مرتے۔ گھروں میں بھیڑ کے باعث دم گھٹنے لگتا ہے۔ ایسے گھر جن کے مرد کھلی فضاؤں میں سانس لینے کے لیے دن بھر باہر اور رات کا بیشتر حصہ اِدھر اُدھر گھوم پھر کر فضول گپ شپ میں گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مگر بیکے کی زندگی میں آنے والی ہم سفر چند قدم ہی ساتھ چلی تھی اور بچھڑ گئی۔ اس کا دل بھر آتا۔ پیشتر اس کے کہ محرومیوں اور تلخ یادوں کے لق و دق ریگ زاروں میں کہیں کھو کر رُل جاتا' سوچوں کی منہ زور ڈاچی کی مہار یک لخت کھینچ کر رُخ سوہنے کی محبت کے نخلستان کی جانب موڑ دیتا۔

سوہنے کے آس پاس گلی محلے میں زیادہ تر ملنے ملانے والے چھوٹے بڑے لوگ ٹرانسپورٹ کے روزگار سے ہی منسلک تھے۔ لڑکوں میں عام طور پر بسوں اور ٹرکوں کے میک اور ماڈل کی باتیں ہُوا کرتی تھیں۔ اعوانوں کی بسیں اور ٹرک' بندیالوں کی ٹرانسپورٹ' شریف ٹرانسپورٹ' راجپوت کمپنی کی فلاں بس' ان کی دوڑیں' جیت اور ہار ڈرائیوری اور ٹرانسپورٹری آئیڈیل پیشہ تصور کیا جاتا تھا۔ اپنے ہم عصروں میں سوہنا ہی مختلف تھا۔ وہ باپ سے کہتا...... ''ابا! میں بڑا ہو کر جہاز اڑاؤں گا۔'' بیکا بیٹے کو گلے سے

لگاتا' گود میں بھر کر پیار کرتا اور اسے بتانے لگتا کہ وہ کیسے دل لگا کر پڑھے تا کہ بڑا ہو کر ایئر فورس میں کمیشن حاصل کر سکے۔ جنگی جہاز چلائے اور فضاؤں میں اُڑے۔ کھلونوں میں اسے سب سے زیادہ مختلف شکلوں کے جہاز ہی پسند تھے۔ اُس کا شوق اور جوش دیدنی ہوتا' جب باپ کے ساتھ سرگودھا جا کر ایئر فورس کے جہاز' تنصیبات اور پائلٹوں کو قریب سے دیکھتا۔

وہ سات سال کا ہوا کہ اُس کے دونوں کندھوں کے درمیان گردن سے ذرا نیچے پیٹھ پر چھوٹی سی گلٹی نمودار ہوئی۔ علاج کے باوجود درد بڑھنے لگا اور گلٹی کا حجم بھی۔ بیگے کو یقین تھا کہ یہ کوئی عام سا پھوڑا ہے جو جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ تاہم وہ سوہنے کو لیے ایک سے دوسرے ڈاکٹر کے پاس پھرنے لگا۔ خوشاب' سرگودھا' لائلپور اور پھر لاہور۔ تب تک گلٹی کا اُبھار بہت نمایاں ہو چکا تھا۔ گہری سبز رنگت' جس کے کنارے سرخ اور سوزش زدہ تھے۔ یوں معلوم ہوتا کہ اُبھار کے اندر کوئی گہرے سبز رنگ کا سیال مواد بھرا ہوا ہے۔ درد میں شدت آ گئی۔ تین ماہ کے عرصے میں سوہنے کی بھوک ختم ہو گئی اور وہ دبلا ہو گیا۔ وزن کم اور رنگت پیلی پڑ گئی۔ ڈاکٹروں کے علاوہ بیگے نے حکیموں کو بھی آزمانا شروع کر دیا۔ میانوالی' بھیرہ اور راولپنڈی تک گیا۔ نوٹوں سے جیب خالی کر کے چند ہفتوں میں بیٹے کی صحت یابی کی نوید لے کر واپس آ جاتا لیکن افاقے کے آثار دکھائی نہ دیتے۔

آخر کار تمام ممکنہ ایڈوانس اور جی پی فنڈ وغیرہ نکلوا کر بیگا' بیٹے کو لے کر لاہور آ گیا۔ میو ہسپتال میں سوہنے کا اپریشن ہوا۔ اُمید لگ گئی کہ موذی پھوڑے سے نجات مل گئی ہے۔ لیکن اب کے بار دو ہی ماہ میں پہلے سے بھی بڑا اور تکلیف دہ اُبھار ظاہر ہو گیا۔ جس سے دنوں میں سوہنا سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ بیگا اپنے بیٹے کے چہرے پر نظریں ڈالتا تو دل ڈوب جاتا۔ جہاں کبھی نکھری رنگت میں سرخی دوڑتی' لال ہونٹوں پر ہر وقت

خوبصورت باتیں اور مسکراہٹیں رقص کرتیں' وہاں پژمردگی' پیلاہٹ' خاموشی اور بے بسی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ بیگے کی روح زخمی ہو جاتی۔ وہ سوچتا کہ کسی طرح اپنی زندگی اپنی روح سوہنے کے نام کر دے۔ کوئی طریقہ' کوئی چارہ چلے کہ وہ بچ رہے۔ اگر یہ ممکن نہیں کہ وہ دونوں باپ بیٹا ایک ساتھ زندہ رہیں تو کبھی ایسا نہ ہو کہ سوہنے کی زندگی اس سے پہلے ختم ہو۔

وہ اپنے بیٹے کے تراشیدہ خوبصورت ہونٹوں کو دیکھتا جن میں شاید خون کا ایک قطرہ بھی نہ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا جن میں چمک ماند پڑ چکی تھی لیکن وہ ہر لمحہ اپنے باپ کو ایک ٹک دیکھتی رہتی تھیں۔ جن میں نہ جانے کیا کیا سوال تیرتے رہتے تھے۔ بیگے کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ گلا رُندھ جاتا۔ وہ اپنی بے بسی پر جھنجلا اٹھتا۔ اس کا جی چاہتا کہ دیوار سے سر ٹکرا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے۔ وہ سوچتا' کیوں کوئی علاج' ٹونکا' تعویذ اور دعا کارگر نہیں ہوتی۔ کہیں کوئی خبر ملے' کوئی معجزہ ہو' میرا بیٹا بچ رہے' پہلے کی طرح زندگی سے بھرپور اور تندرست ہو جائے۔ ہر طرح کی نعمتیں دیکھ کر ایک ایک لمحے میں سو سو بار مرتا کہ بیٹا کھا نہیں سکتا۔ چمچ سے دی گئی معمولی خوراک بھی قے کے ذریعے نکل جاتی۔ ڈاکٹروں نے کئی ٹسٹ لیے اور پھر آخری رائے دی کہ اب اپریشن بے سود ہے' بس دعا کی جائے۔ دعائیں وہ پہلے ہی ایک ایک سانس کے ساتھ کر رہا تھا۔ وہ سرتاپا دعا بن چکا تھا۔ وہ جو اس کی شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب تھا' درد ناک التجائیں نہیں سن رہا تھا۔ اُس کا خدا کہیں قلعہ بند ہو گیا تھا جس پر بے زخمی کے آہنی دروازے مقفل ہو گئے تھے۔ سنگلاخ دیواروں پر بدنصیب باپ سر پٹختا تھا لیکن قبولیت کا کوئی روزن وا نہ ہوا۔

لاہور سے واپس آ گئے۔ سوہنا بہت لاغر ہو گیا۔ بستر سے پیٹھ لگانے کے قابل نہ رہا۔ بیگا اسے سینے سے لگائے رکھتا۔ اسی طرح سینے سے لگائے لیٹ جاتا۔ لیٹے

ہوئے بیگا اپنے بیٹے کے دل کی دھڑکن محسوس کر کے دل میں بے اختیار پکار اٹھتا......
''کاش یہ ننھا دل اسی طرح دھڑکتا رہے' حتیٰ کہ مجھے موت آ جائے۔''......دیوانوں کی
طرح سوچتا کہ بیٹے کو لے کر کہیں ایسی جگہ چلا جائے' جہاں موت کا تصور ہی نہ ہو۔ لیکن
اپنی احمقانہ سوچ پر اسے رونا آ جاتا۔ ایک دن وہ سوہنے کو سینے پر لٹائے ایسے ہی خیالوں
میں غرق تھا کہ آنکھ لگ گئی۔ موت کسی ایسے ہی لمحے کی تاک میں تھی۔ شاید بیگے سے
سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اُس کو غافل پایا تو سوہنے کو چرا کر لے گئی۔

غسل اور کفن کے لیے بیگے سے سوہنے کو مانگا گیا تو وہ اسے لے کر بھاگ
پڑا۔ لوگ پیچھے پیچھے اور وہ آگے آگے۔ آخر کب تک۔ سوہنا قبر میں ڈال دیا گیا تو بیگا
پشت کے بل زمین پر آ رہا۔ ہسپتال میں تشخیص ہوئی کہ بیگے کے دماغ پر فالج کا حملہ ہوا
ہے۔ زیادہ شدید نہیں۔ شاید بچ جائے لیکن مکمل ہوش و حواس بحال نہ ہوں۔ اُسے کچھ
یاد نہ رہا۔ بھوک پیاس کا احساس مٹ گیا۔ مقامات اور اوقات کے کنفیوژن کا شکار ہو
گیا۔ سب کچھ بھول گیا' ماسوائے ان دو آنکھوں کے' جن میں آخری ایام کے دوران
زندہ رہنے کی حسرتیں منڈلا رہی تھیں۔ عمرِ رفتہ کی ہر تصویر اُس کی ہستی کے کینوس پر
دھندلا گئی۔ صرف ایک سراپا ہی اُس کی روح کے اہرام میں محفوظ ہو کر رہ گیا۔ دن میں
چند ایک بار صرف ایک جملہ بولتا: ''یوں تیرے ساتھ ہو تو جانوں۔''

مراجعت

آج صبح ہی سے گھر میں سخت تناؤ کا سا ماحول رہا تھا۔ بچے سہمے ہوئے ایک ایک گھڑی گنتے رہے کہ کب والد صاحب گھر سے باہر نکلیں تو وہ سکھ کا سانس لیں۔ بیوی مقابلے میں ڈٹی رہی تھی۔ اُس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ہر صورت میں بیٹی کو کالج میں داخلہ دلائے گی۔ خاوند نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو! میرے منہ نہ لگو۔ میں زن مرید نہیں جو تمہاری بات مانوں۔ لڑکی کو تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں۔ میٹرک تک اُس کی پڑھائی میں نے اِس لیے برداشت کر لی کہ سکول گھر کے قریب تھا۔ لیکن کالج دور ہے اور معاشرہ کس قدر بگڑ چکا ہے' یہ میں جانتا ہوں۔ خبردار! آئندہ مزید تعلیم کی بات نہ ہو۔ اس مسئلے میں اب بک بک بند ہونی چاہیے۔'' بیوی نے میاں کے توہین آمیز کلمات کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے قائل کرنے کی ایک بار پھر کوشش کی اور بولی۔

''معاشرہ میں نے نہیں بگاڑا۔ یہ تم مجھ سے زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہو کہ کس قماش کے لوگوں نے ایسا کیا ہے۔ تاہم اس کی سزا میری بیٹی کو کیوں ملے؟ میں نے تمہارے معاملات میں کبھی دخل نہیں دیا۔ تم جو کچھ بھی باہر کرتے ہو' کرتے رہو۔ ویسے مجھے اندازہ ہے کہ جو تم کرتے ہو وہ سب ٹھیک نہیں۔ معاشرے میں جس طرح کی شہرت کے تم حامل ہو' تمہیں بھی پتا ہی ہے۔ تاہم مجھے کیا؟ تم جانو اور تمہارا کام۔

لیکن یہ معاملہ ایسا ہے کہ میں چپ نہیں رہوں گی۔ اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم سے محروم نہیں ہونے دوں گی۔ اپنی طرح اس کی زندگی کیوں برباد ہونے دوں؟ یہ خالصتاً گھریلو مسئلہ ہے اور ہمارے بچوں کے مستقبل کا سوال۔ کم از کم اس معاملے میں مجھے بولنے اور رائے دینے کا حق حاصل ہونا چاہیے"۔

خاوند اس جواب پر تپ گیا اور منہ سے کف بہاتے ہوئے بولا۔

"بند کرو اپنی بکواس۔ کیا برباد ہوئی ہے تمہاری زندگی؟ تم نے تخت پر بیٹھنا تھا؟ کسی نہ کسی کے پاؤں کی جوتی ہی بننا تھا۔ میرے میں کیا خرابی ہے؟...... اور تجھے گھر کے معاملے میں بولنے کا حق کس نے دیا ہے؟ میں اُن مردوں میں سے نہیں ہوں جو عورتوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ اچھی طرح جان لو کہ میں تمہارا خاوند ہوں...... مجازی خدا...... تم ہو کیا چیز؟ ایک عورت ذات؟ جس کی مت گھری تلے ہوتی ہے۔ میں اب تمہارے کہنے پر چلوں گا؟" وہ غصے میں گرجتے برسنے لگا۔ بیٹی نے کونے میں گھس کر رونا شروع کر دیا اور بچے مارے خوف کے دبک گئے۔ وہ سب پر فاتحانہ نگاہ ڈال کر گھر سے نکل گیا۔

وہ تمام دن گھر نہیں لوٹا۔ اپنے دھندوں میں مشغول رہا۔ تمام کارندوں سے حساب کتاب لیا اور انہیں رخصت کر کے ٹی وی آن کر دیا۔ خبریں نشر ہونے لگیں۔ "...... محترمہ نے وزیراعظم کی حیثیت سے حلف اُٹھا لیا"...... اس کی توجہ ہٹ گئی۔ خبروں کے الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرا رہے تھے لیکن اس کے ذہن تک ان کی ترسیل اپنی اصل ترتیب میں نہیں ہو رہی تھی۔ تاہم نظریں منظر پر گڑ گئیں۔ ذہن میں مختلف سوال آپس میں گڈمڈ ہو گئے اور خیالات زیروزبر ہونے لگے۔ بیوی کے ساتھ آج صبح ہونے والی تلخ کلامی اور لمحۂ موجود میں ٹی وی پر نشر ہونے والی خبریں...... "گھر کے معاملے میں بولنے کا مجھے حق حاصل ہونا چاہیے...... تم ہو کیا چیز؟ ایک عورت ذات؟ لڑکی کو تعلیم کی کوئی

ضرورت نہیں...... محترمہ وزیراعظم...... تم ہو کیا چیز؟...... تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں......"

ذہن میں ہونے والی اتھل پتھل تھمنے لگی۔ خبروں کا اصل مفہوم واضح ہوتا چلا گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ اتنا بڑا ملک' کروڑوں انسان' منتخب ایوان کی قائد اور وزیراعظم' ایک خاتون' اتنا بڑا اعزاز عورت کے لیے؟ سوچیں گھمبیر ہوتی چلی گئیں۔ ذہن میں ایک سوال روشن ہو گیا۔ "میری بیٹی میں کیا کمی ہے؟"

رات دس بجے کے قریب وہ گھر پہنچا تو بچے سو چکے تھے۔ بیوی اور بیٹی ایک ہی بستر پر اداس بیٹھی تھیں۔ وہ ان سے مخاطب ہونے لگا لیکن آج پہلی بار جھجک غالب آ گئی۔ میز پر سے داخلہ فارم اُٹھائے اور پڑھنے لگا۔ پھر ان پر دستخط کیے۔ جیب سے کچھ رقم نکال کر بیوی کی طرف بڑھائی اور کہنے لگا۔

"چلو اب ناراضگی معاف کر دو۔ مجھے اپنے رویے پر افسوس ہے۔ صبح بیٹی کو کالج میں داخل ضرور کروانا۔ کہو تو میں بھی ساتھ چلوں۔"

***

بازگشت

ہر چھوٹے بڑے سرکاری ملازم کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے entitlement کے مطابق رہائش ملے۔ چوہدری غلام رسول صاحب جب نان گزیٹڈ افسر تھے تو گلی کے اس آخری ڈی ٹائپ کوارٹر میں رہائش پذیر ہوئے لیکن اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے عہدے پر ترقی پانے کے باوجود اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو رہے تھے۔ دراصل وہ یہاں اپنی دیہاتی زندگی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ تین اطراف سے کھلے کوارٹر کے اردگرد وسیع گرین بیلٹ کے بڑے حصے پر انہوں نے باغیچہ لگا رکھا تھا جس میں پھول اور سبزیاں کاشت کیا کرتے۔ دیسی مرغیوں کے علاوہ دو بھینسیں بھی پال رکھی تھیں۔ نام کے ہی چوہدری تھے' آبائی زمین کچھ زیادہ نہیں رہی تھی۔

بھاری بھر کم چوہدری صاحب کی رنگت بھی اگر کالی ہوتی تو کئی طرح کے مغالطے پڑ سکتے تھے۔ دھوتی بنیان میں ملبوس اپنی بھینسوں کے پاس کھڑے ہوتے تو ڈیل ڈول اور فطری بھولپن کے باوصف انہی کے سگے دکھائی دیتے۔ بھینسیں ان سے خاصی مانوس تھیں اور وہ خود بھی جانوروں سے کچھ زیادہ ہی پیار کرتے تھے۔ شاید اسی لیے وہ اصل کی بجائے جی آر بھینس کے نام سے زیادہ مشہور ہوئے۔ سامنے والے گھر میں رہائش پذیر انٹیلی جنس بیورو کے فاروقی صاحب نے جی آر بھینس کا لاحقہ زبانِ زدِ عام کرنے میں خاصا کردار ادا کیا۔ وہ اس گھرانے کو موٹی کھال والے بھی کہا کرتے اور

اُن کی بڑی بیٹی ثنا تو کچھ زیادہ ہی دلچسپی لیا کرتی۔ دھان پان سی ثنا بلا کی ذہین تھی۔ تاہم چہرے پر بھرپور روشنی پڑنے کی صورت میں بھی کوئی نیک روح ہی اُس کی رنگت کو سانولی قرار دینے کی روادار ہو سکتی تھی۔ نین نقش کے بارے میں رائے دینے والے کی صواب دید پر منحصر تھا۔ بخیل کو قائل کرنا محال تو تخی کے لیے از خود ہی کلمۂ خیر ادا ہو جاتا۔

کالونی میں ملک کے ہر علاقے سے تعلق رکھنے والے لوگ مقیم تھے لیکن چوہدری صاحب والی گلی میں صرف ایک پٹھان اور ایک گلگتی کے علاوہ باقی تمام بنگالی اور اردو سپیکنگ رہتے تھے۔ کوئی چھوٹا بڑا' مرد' عورت' چوہدری غلام رسول کو جانے نہ جانے' جی آر بھینس کو سب جانتے تھے۔ ہر کسی کی تمنا تھی کہ دودھ ان کے ہاں سے ملے۔ چونکہ اس کے خالص ہونے میں کسی کو کلام نہیں تھا۔ آس پاس کے سب گھروں میں سے ثنا کو یہ انفرادیت حاصل تھی کہ وہ سر چڑھ کر بھی اپنے گھر کی ضرورت کے مطابق دودھ حاصل کر لیتی۔ حالانکہ وہ اس گھرانے پر ریمارکس پاس کرنے میں سنگ دلی کا مظاہرہ کرتی۔ اپنی چھوٹی بہن کے برعکس وہ شوخ طبیعت کی مالک تھی اور ہر وقت سہیلیوں میں گھرے رہنا پسند کرتی۔ ماں بہت پہلے انتقال کر چکی تھی تاہم عمر رسیدہ نانی اپنی زندگی کے باقی دن ان کے ہم راہ بسر کر رہی تھی۔ طبعاً وضع دار خاتون' ضعفِ بصارت کے باعث ایک طرح سے گوشہ نشین ہو کر رہ گئی تھی۔ سہیلیوں کے حلقے میں ثنا' رویے اور اطوار کے اعتبار سے ان کی قائد قرار دی جا سکتی تھی۔ اُس کا موضوعِ سخن زیادہ تر جی آر بھینس اور اُن کا گھرانا ہی ہوا کرتا۔ وہ انہیں ڈھگے کہہ کر پکارتی۔ چوہدری صاحب کو اولڈ ڈھگا اور اُن کے بیٹے کو ینگ ڈھگا کہا کرتی۔ اُن کے کھانے پینے کی عادات پر سیر حاصل معلومات رکھتی تھی۔ وہ فی کس کتنا دودھ پیتے ہیں اور ان کے ہاں کس مقدار میں گوشت پکایا جاتا ہے اور وہ کیسے سارے کا سارا چٹ کر جاتے ہیں۔

چوہدری صاحب کی بیوی صوفیانہ مزاج کی حامل خاتون تھیں۔ پرائمری تک

پڑھی ہوئی تھیں۔ قرآنی آیات اور احادیث اکثر دہرایا کرتیں تاہم انہیں صوفیہ کا خاصا کلام بھی ازبر تھا۔ مسلک کے حوالے سے وہ اپنے ذہن میں گویا افق تا افق وسعتیں سمیٹے ہوئے تھیں۔ ذخیرۂ اشعار محض مسلمان صوفی شعرا کے کلام پر ہی مشتمل نہیں تھا بلکہ بھگت کبیر اور بابا گرونانک کے کئی اشعار بھی بڑی عقیدت سے سنایا کرتیں۔ خاتون کے سینے میں نہ جانے اس قدر سوز و گداز سے معمور دل کیسے دھڑکتا تھا۔ وہ اکثر ایسے اشعار سنایا کرتیں۔

آکھ نی مائے آکھ نی ۔۔۔ میرا حال سائیں اگے آکھ نی
پریم دے دھاگے انتر لاگے ۔۔۔ سُولاں سیتی ماس نی
نج جنیدیئے بھولیے مائے ۔۔۔ جن کر لائیو پاپ نی

ہر کام عبادت جان کر کیا کرتیں۔ گویا اس نیک بخت نے اپنی ازدواجی زندگی کو بھی اس انداز سے گزارا کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو سکے۔ چھ بیٹیاں اور ایک بیٹا بھی اسی جذبے سے پیدا کیا اور انہیں پال پوس کر جوان کیا۔ تمام بیٹیاں مرحلہ وار بیاہ دیں۔ ان میں سے اکثر سے زیادہ تعلیم وہی حاصل کر سکی جس کا رشتہ آنے میں بمن جانب اللہ تاخیر ہوگئی۔ بیٹے کا نام عبداللہ رکھا تھا لیکن اللہ دتہ کہہ کر پکارتیں۔ وہ اسی نام سے مشہور ہوا۔ اصل نام صرف متعلقہ دستاویزات میں ہی لکھا رہ گیا۔ ہر وقت زبان سے نیک کلمات ادا کیا کرتیں۔ اپنے خاوند اور بیٹے کے علاوہ مرغیوں اور بھینسوں کے لیے بھی قدم قدم پر بسم اللہ بسم اللہ پکارتیں۔ چوہدری صاحب یا عبداللہ گھر میں قدم رکھتے تو ان کے ایک ایک عمل پر بسم اللہ کا ورد کرنے لگتیں۔ گھر میں آنے والے ہر مہمان کو بھی وہ اسی طرح خوش آمدید کہا کرتیں۔ شاانہیں اپنے گھر اور حلقے میں بسم اللہ خاتون کہہ کر یاد کرتی۔ ان کی محتاط طبیعت کے باعث البتہ بیٹے کا تعلیمی سفر ہموار نہ رہ سکا۔ کوئی ایک بھی امتحان ڈھنگ سے پاس نہیں کرنے دیا۔ رات جب بھی وہ پڑھنے بیٹھتا' بڑے پیار

سے سو جانے کا مشورہ دیا کرتیں۔ جب تک وہ سو نہیں جاتا تھا پاس بیٹھی رہتیں یا حیلے بہانے وقفے وقفے سے کمرے کے چکر لگایا کرتیں۔

اللہ دتہ اپنی ماں کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتا تھا' اس لیے کبھی اُن کی دل آزاری نہیں کی۔ ذرا بارش کا سماں بنا' زیادہ گرمی ہو گئی یا خنکی بڑھی تو بیٹے کو گھر پر روک لیا۔ شہر میں کہیں کسی ہنگامے کی خبر کان میں پڑ گئی' تب بھی باہر نہیں جانے دیا۔ ثنا بھی اس سلسلے میں خصوصی کردار ادا کیا کرتی۔ تفریحِ طبع کے لیے اس گھرانے کو تختۂ مشق بنانے سے باز نہیں آتی تھی۔ کالج میں لڑکوں کا گروپ الجھ جاتا یا کہیں طلبا تنظیموں کے مابین ذرا سی کشمکش رونما ہو جاتی تو وہ جھٹ آ دھمکتی۔ ''خالہ! آج کل حالات ٹھیک نہیں' خدا خیر کرے۔ نہ جانے لڑکے کیا گل کھلاویں۔'' گھر جا کر وہ مزے لے لے کر بتایا کرتی۔ ''بس ذرا ڈھگا تو گیا کام سے۔'' کئی بار اس کی سہیلیوں نے عبداللہ کو کالج جانے کے لیے تیار کھڑے پایا لیکن ثنا نے شرط بد کر اُس کی چھٹی کروا دی۔ یہی وجہ تھی کہ آسان ترین مضامین رکھنے کے باوجود عبداللہ ابھی گریجویشن نہیں کر سکا تھا۔ حالانکہ وہ غبی نہیں تھا۔ بلکہ اس کے برعکس خاصا ذکی اور حاضر جواب تھا۔ گھر میں حدِ ادب ملحوظ رکھتے ہوئے وہ خوب ہنسی مذاق کیا کرتا۔ بہنوں اور بہنوئیوں سے بھی بڑی دوستی تھی۔ جب وہ کچھ دن ان کے پاس گزارنے کے لیے آ جاتے تو خوب رونق رہتی۔

چوہدری صاحب اپنے سرکاری کام میں خاصے ماہر تھے۔ تاہم ایک سادہ لوح درویش صفت انسان کے طور پر مشہور ہوئے۔ خاصے خوش خوراک تھے۔ انہوں نے اپنی بیگم سے کہہ رکھا تھا کہ جب وہ چپاتیاں پکاتے ہوئے تھک جائیں تو بلا جھجک کہہ دیا کریں۔ کھانے کے وقت بیگم انہیں یوں دعوت دیا کرتیں۔ ''چوہدری جی! آؤ بسم اللہ۔'' چوہدری صاحب بسم اللہ پڑھ کر شروع ہو جاتے لیکن الحمدللہ کا کلمہ ادا کرنے میں خاصی تاخیر کر دیتے تو بیگم صاحبہ بڑی رسان سے کہتیں۔ ''ماشاء اللہ۔ چوہدری جی! اُٹھو بسم

اللہ کر کے' پڑھو شکر الحمدللہ۔'' اور چوہدری جی فرمایا کرتے۔ ''اچھا جی! لو جی! اُٹھ گئے...... الحمدللہ...... اور کوئی حکم؟''

کہتے ہیں ایک بار چوہدری صاحب ٹوکرا بھر کچی گوبھی کھا گئے۔ بات کا بتنگڑ بنانا کوئی ہم لوگوں سے سیکھے۔ اصل قصہ یہ تھا کہ گھر میں بہت سے رشتہ دار اور بیٹیاں آئی ہوئی تھیں اور خاتونِ خانہ کے ہم راہ کسی کام سے باہر چلی گئیں۔ پانچ کلو گوشت اور تازہ گوبھی کے آٹھ دس پھول بھی گھر میں رکھے تھے۔ چوہدری صاحب کو بھوک نے ستایا تو گوبھی سے شغل فرمانے لگے۔ بیگم صاحبہ مہمانوں کے ہم راہ گھر لوٹیں تو گوبھی کا آخری پھول فنا ہونے کو تھا۔ گوبھی کے آٹھ دس پھول چھوٹے تھے یا بڑے لیکن بلاتردد اس کا وزن دس بارہ کلو تصور کر لیا گیا اور جس ٹوکری میں سبزی رکھی تھی اسے بڑی فراخ دلی سے ٹوکرا تسلیم کر لیا گیا۔ گویا بلا تحقیق اور بے دریغ یہ بات ایک سے دوسرے شخص تک بڑھا دی گئی کہ جی آر جینس گوبھی سے بھرا پورا ٹوکرا ڈکار گئے۔ اس بات کو پھیلانے میں ثنا نے زیادہ تندہی کا مظاہرہ کیا۔ اُس نے اپنی سہیلیوں کے ہم راہ گھر گھر جا کر یہ فریضہ ادا کیا۔ چوہدری گھرانے کا مسئلہ یہ تھا کہ جو باتیں بڑی آسانی سے اپنے تک محدود رکھی جاسکتی تھیں وہ بھی بیان کر دیتے۔ اللہ کے بندے یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ لوگ ان کی سادگی پر ہنستے ہیں اور کالونی میں ہر مرکزی محکمے اور وزارت کا چھوٹا بڑا ملازم رہائش پذیر ہے' اس لیے گزشتہ روز جو بات ثنا کی کوئی سہیلی اپنے گھر میں سنا چکی ہوتی' وہ آج دفتر کی ایک میز سے دوسرے تک سفر کرنے لگتی۔

مرکزی حکومت کے جس عہدے پر چوہدری صاحب فائز تھے' وہاں سے صرف حق حلال کی تنخواہ ہی گھر لایا کرتے۔ مزید کی توقع تھی اور نہ ہی اس سے زیادہ کی بیگم نے کبھی تمنا کی۔ ویسے بھی خاتون حلال اور حرام میں تمیز کا وہی معیار رکھتی تھیں جو کسی ولی اللہ کا نصیب ہوتا ہے۔ دودھ کو اللہ کا نور قرار دیا کرتیں اور ایک قطرہ پانی کی

آمیزش ناقابلِ معافی جرم کے مترادف سمجھتی تھیں۔ چوہدری صاحب نے زندگی بھر کھینچ تان کر ہی اخراجات پورے کیے تھے۔ خصوصاً بیٹیوں کی پرورش، تعلیم اور شادیوں کے مراحل سے نکلے تو زیرِ بار ہو چکے تھے۔ اس لیے آبائی علاقے میں جو تھوڑی بہت جائیداد تھی وہ بھی سکڑ کر رہ گئی۔ گو وہ لوگ سادہ زندگی بسر کرتے لیکن طبعاً وضع دار اور بامروت تھے اس لیے آئے گئے کی آؤ بھگت بڑے کھلے دل اور خندہ پیشانی سے کیا کرتے۔ ہر روز شام کو گلی کے بیشتر لوگ ان کے ہاں محفل لگایا کرتے۔ جان پہچان کا حلقہ وسیع تھا۔ اپنے وقت کی سپر سٹار نیلو کے ایک کزن بھی فوکسی گاڑی میں سوار کبھی کبھار آیا کرتے۔ گلی محلے کے دیگر لوگوں کے علاوہ چوہدری صاحب بلحاظ عمر اور سرکاری عہدہ فاروقی سے سینئر تھے لیکن شروع شروع میں انہوں نے تم کہہ کر مخاطب کیا تو وہ بولے۔ ''کمال ہے بھئی!! آپ خود ''ہم'' اور ہم ''تم'' ہیں۔ اپنے نام کا بڑا پاس ہے؟'' تیز طبع فاروقی صاحب نے جھٹ کہا۔ ''ارے چوہدری صاحب! یہ تو ہم پیار میں کہہ گئے۔'' پیار کا لفظ سنتے ہی چوہدری صاحب فوراً نہال ہو گئے اور بولے۔ ''اچھا! اچھا! پیار میں جو مرضی ہے کہہ لیں۔''

پچھلے پہر باہر کھلے میں معمول کی محفل جمی ہوئی تھی۔ فاروقی نے کہا۔ ''ارے چوہدری صاحب! وہ ملا تھا آج صدر میں...... تمہارا دوست...... کیا نام ہے سالے کا...... ابے وہ نیلو کا کزن...... تمہارا پوچھ رہا تھا۔'' چوہدری صاحب نے استفسار کیا کہ کیوں پوچھ رہا تھا تو فاروقی نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''چوہدری بھائی! وہ بول رہا تھا کہ کوئی فلم زیرِ تکمیل ہے اور آپ کو اس میں پارٹ دینا ہے۔'' حاضرینِ محفل ہنسنے لگے لیکن چوہدری صاحب بدک کر بولے۔ ''کمال کر دیا اُس نے...... میں اب اس عمر میں فلم ایکٹر بنوں گا؟'' اتنا کہہ کر چوہدری صاحب خاموش ہو گئے اور یوں لگا جیسے کسی سوچ میں پڑ گئے ہوں لیکن فاروقی نے زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ باقی سب دوستوں کو آنکھ

ماری اور بولے۔ ''یار چوہدری بھائی! مخلصانہ مشورہ ہے' سچ پوچھو تو ایکٹنگ بھی ایک پیشہ ہے۔ چار پیسے اضافی آ جانے سے کئی کام سنور سکتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟'' چوہدری صاحب نے سر پر ہاتھ پھیرا اور گردن جھکا لی۔ وہ ان دنوں واقعی ضرورت مند تھے۔ اپنے طور پر کچھ سوچ کر بولے۔ ''یار فاروقی! پارٹ کیا ادا کرنا ہوگا۔ اُس نے کچھ بتایا؟'' فاروقی صاحب اب خاصے سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے۔ جھٹ بولے۔ ''ارے بہت آسان ہے چوہدری! الف لیلیٰ کے جن کا پارٹ ہے۔ بس گلا پھاڑ کر اوا و آ ہا آ ہا کی آوازیں نکالنی ہیں۔'' چوہدری صاحب کے لبوں سے بے ساختہ ایک موٹی سی گالی برآمد ہوئی اور سب لوگ قہقہے لگانے لگے۔ فاروقی صاحب نے کہا۔ ''اچھا بھائی چوہدری! تمہاری مرضی' ہم نے تمہارا ہی فائدہ سوچا تھا۔''

سب لوگ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے لیکن چوہدری صاحب نے گفتگو میں حصہ نہیں لیا۔ اتنے میں عبداللہ اندر سے چائے لے آیا۔ محفل کی رونق میں مزید اضافہ ہو گیا۔ تاہم چوہدری صاحب گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ چائے کا دور اختتام پذیر ہونے پر فاروقی صاحب کو مخاطب کر کے بولے۔ ''معاوضہ کیا ملے گا جن کا پارٹ ادا کرنے کا؟ کچھ بتایا تھا اُس نے؟'' سب لوگ زیر لب مسکرائے۔ لیکن فاروقی صاحب نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''ہاں پوچھا تھا میں نے۔ دس ہزار روپے بول رہا تھا۔'' چوہدری صاحب کے چہرے پر ایک رنگ سا آ گیا۔ تاہم جلد ہی سنبھل کر کہنے لگے۔ ''یار فاروقی! پیسے خاصے معقول ہیں۔ چلو پھر ٹھیک ہے۔ میری طرف سے ہاں سمجھو۔ لیکن یار مجھے جھجک محسوس ہو رہی ہے۔ اب مزید بات چیت اُس سے تم نے کرنی ہے۔''

جن کا پارٹ ادا کرنے سے متعلق معاملہ محض فاروقی صاحب کے ذہن کی اختراع کے سوا کچھ نہ تھا' جس کے نتیجے میں لوگوں کو ہنسنے کے لیے ایک اور موضوع مل گیا۔

ثنا کے ذہن میں کیا پیچیدگی گھر کر گئی تھی کہ وہ عبداللہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ

گئی۔ اپنے گھر کے سامنے برآمدے میں کھلنے والی کھڑکی میں سے ہر وقت نگاہ رکھا کرتی اور عبداللہ کو دیکھتے ہی کوئی نہ کوئی کٹیلا جملہ ادا کر دیا کرتی۔ عبداللہ نے ایک بار ثنا سے کہا کہ وہ تمیز کے دائرے میں رہے۔ وہ جل بھن کر بولی۔ ''اب ڈھگے ہمیں تمیز سکھانے چلے ہیں؟''

عبداللہ نے گھسٹتے ہوئے بی۔اے پاس کرلیا۔ اردو میں فسٹ کلاس فسٹ ڈویژن آئی۔ شاعری سے میلان شاید ماں کی طرف سے وراثت میں ملا تھا اس لیے چھوٹے بڑے مشاعروں میں شرکت کرنے لگا۔ ثنا کو اس امر پر حیرت تھی۔ بقول اُس کے موئی کھال والے گھرانے کا لڑکا اردو جیسی نفیس اور اعلیٰ زبان میں اشعار موزوں کرتا ہے۔ وہ اُن کے ہاں بے دھڑک آ جایا کرتی اور باہر بھی سامنا ہو جاتا تو موقع پا کر بڑی بے دردی سے تبصرہ کر دیتی۔ ''پنجابی ڈھگے اب اردو میں جگالی کرنے لگے۔'' عبداللہ اپنی پڑوسن کے جذبات کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پا رہا تھا' اس لیے کبھی بھی مناسب جواب نہ دے سکا۔ اُس نے ایک بار اسے کہا بھی کہ وہ پنجابی میں شاعری کرلیا کرے تو بڑا سخت جواب ملا۔ ''کیوں میں پنجابی کیوں بولوں؟ اپنی ماں سے غداری کروں؟'' عبداللہ حیرت زدہ رہ گیا کہ اس میں ماں سے غداری کرنے والی کون سی بات ہے۔ اُس نے وضاحت چاہی اور کہا کہ وہ بھی پنجابی ہوتے ہوئے اردو بولتا ہے۔ کہنے لگی۔ ''تم یہ احسان نہ ہی کرو اردو پر تو حضور کی عنایت ہوگی۔''

عبداللہ کی چھب ڈھب اور رنگ و روپ غیر معمولی نہ سہی' موزوں ضرور تھا تاہم قدرے فربہی مائل۔ اصل نام عبداللہ ہونے کے باوجود محض اپنی ماں کی محبت میں اللہ دتہ کہلوانے پر بُرا نہیں مانتا تھا۔ لیکن ثنا نے اپنے سخت رویے سے اسے زچ کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ اسے عبداللہ کی بجائے اللہ دتہ کے نام سے پکارتی تو کوئی مضایقہ نہیں تھا لیکن جب اسے اے ڈی بھینس کے نام سے یاد کرتی تو بے چارے کو بڑی کوفت ہوتی۔

یا پھر اسے بلا جھجک ڈھگا کہہ دیا کرتی۔ اس کے علاوہ بھی اسے چھیڑنے کے لیے اپنی ترکش کو بڑے بھرپور ذخیرۂ الفاظ سے بھر رکھا تھا اور جوں ہی موقع ملتا' کوئی نوکیلا لفظ زبان کے چلّے پر چڑھا کر طعن تشنیع کا تیر چلا دیتی۔ رفتہ رفتہ اُس نے چوکھی جنگ لڑنا شروع کر دی۔ صرف زبان و کلام تک محدود نہ رہی بلکہ دیگر ذرائع بھی استعمال کرنے لگی۔ دونوں گھروں میں سرکار کی طرف سے ٹیلیفون کی سہولت دی گئی تھی۔ جب بھی چوہدری صاحب اور ان کی بیگم باہر باغیچے میں یا بھینسوں کے پاس ہوتے' فون کی گھنٹی ضرور بجتی۔ فون اٹھانے پر عبداللہ کو اس طرح کے الفاظ سنائی دیتے۔

''چڑ بیلے' جن کے بچے' بھینسے۔'' فون بند ہو جاتا۔ اب اسے بنگالی کی دکان اور قریبی لائبریری کی معرفت ہر روز خطوط موصول ہونے لگے۔ اسی طرح کے الفاظ لکھے ہوتے' خاکے اور کارٹون بنے ہوتے۔ ہاتھی' گینڈا' دیو اور پہاڑ بنائے گئے ہوتے اور مختلف اخبارات و رسائل سے ایسی ہی تصاویر کی کٹنگز کے ساتھ ریمارکس لکھے ہوتے۔ اُس کی فرمائش پر کچھ سہیلیاں بھی اس مہم میں شریک ہو گئیں۔ خاصے واہیات خاکے موصول ہونے لگے' جن میں بڑا سا پیٹ نکلا ہوتا اور ساتھ کوئی نیا سے نیا نام دیا ہوتا۔ ''چلتا پھرتا گوشت کا تودہ' پنجابی ڈھگا' جعلی شاعر۔'' پہلے کی بہ نسبت اب فون کالز زیادہ آنے لگیں۔ عبداللہ خود اُٹھاتا تو دوسری طرف سے پوچھا جاتا۔ ''یہاں کوئی جن نما موٹا مسٹنڈا اللہ دتہ رہتا ہے؟ جو اردو ادب کے ساتھ دھینگا مشتی کر رہا ہے۔'' کئی آوازیں ایک ساتھ سنائی دے رہی ہوتیں۔ ''کوئی ہٹا کٹا فربہ اندام ہیبل پیکر ہے؟'' اس کے بعد کئی لڑکیوں کے ہنسنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔

عبداللہ خاصا بردبار تھا لیکن ٹیلیفون کالز اور خطوط کی بھرمار نے اسے پریشان کر کے رکھ دیا۔ بعض لڑکیاں ہنسی مذاق میں اخلاقی حدود سے تجاوز کر جاتیں اور اسے موصول ہونے والے کچھ خاکے پورنوگرافی کے زُمرے میں آتے تھے۔ ایک دن عشا کے وقت

موقع پا کر عبداللہ' ثنا کی کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور اُس سے مخاطب ہو کر بولا۔

''کلو! باز آ جاؤ۔ ورنہ پچھتاؤ گی۔'' وہ اتنا کہہ کر واپس پلٹ آیا لیکن اسے یہ جملہ بہت مہنگا پڑا۔ اگلے ہی روز اس پر انتہائی سخت حملہ ہوا۔ فون اٹھاتے ہی کہا گیا۔ ''تم پنجابی ہو اس لیے...... ہو۔ تمہیں لڑکیوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں' جاہل' اُجڈ' گنوار' گدھے' ڈھگے۔'' یہ سب کچھ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کا ذہن منتشر ہو کر رہ گیا۔

یہ ایک مشکل دور تھا۔ عبداللہ اردو ادب میں ایم اے کر رہا تھا۔ ثنا اور اس کی سہیلیوں نے اسے پریشان کر کے رکھ دیا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح یہ یک طرفہ جنگ بند ہو جائے۔ تنگ آ کر اپنے ایک دوست نما ہمدرد استاد سے مشورہ کیا تو باہمی مشاورت سے نئی حکمتِ عملی طے کر لی جس کے تحت اس نے فون اٹھانا چھوڑ دیا اور لائبریری یا بنگالی کی دکان کا رخ ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ بہت سی لڑکیوں کو پہچانتا تھا جو ثنا کی سہیلیاں تھیں اور لائبریری کے آس پاس والے کوارٹروں میں رہتی تھیں جہاں ساتھ ہی بنگالی کی دکان تھی۔ لائبریری کے مالک اور بنگالی دوست کو اس نے سمجھا دیا کہ وہ اس کے نام سے آئے ہوئے مکتوب وصول نہ کریں یا پھر تلف کر دیا کریں۔ بنگالی خاصا تیز دماغ شخص تھا۔ اسے کچھ اندازہ تھا کہ اس کی دکان میں باقاعدگی سے آنے والی کئی لڑکیاں کاؤنٹر پر پڑی ڈاک میں خصوصی دلچسپی لیا کرتی تھیں۔ وہ سرخ روشنائی سے ان پر جلی حروف میں واپسی کے ریمارکس درج کر کے کچھ دن تک کاؤنٹر پر رکھے رکھتا اور پھر پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتا۔ تاہم اس نے ایک روز عبداللہ سے کہا۔

''عبداللہ بھوئی! لوڑکی لوگ تم سے بوڑا سخت محبت کرتا۔ وہ جولدی جولدی تم کو Love کرنا مانگتا۔'' عبداللہ نے اتفاق نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس سے سخت نفرت کرتی ہے اور اسے زچ کر کے مار ڈالنا چاہتی ہے۔

اس اثنا میں فاروقی صاحب کو ترقی دے کر مشرقی پاکستان ٹرانسفر کر دیا گیا

اور ثنا کی چھوٹی بہن کو وہاں میڈیکل میں داخلہ بھی مل گیا۔ عبداللہ کے لیے یہ خبر بڑی خوش آئند تھی کہ ایک مستقل عذاب سے نجات مل جائے گی لیکن فاروقی صاحب نے چوہدری صاحب کو بتایا کہ وہ اپنی چھوٹی بیٹی کے ہم راہ بہت جلد مشرقی پاکستان چلے جائیں گے لیکن ثنا بضد ہے کہ وہ بی۔اے کا امتحان پاس کر کے یہاں سے جائے گی۔ لہٰذا وہ اپنی نانی اماں کے ساتھ پانچ چھ ماہ تک یہیں رہے گی۔ گلی محلے کے لوگ اچھے ہیں اور کچھ قریبی عزیز رشتہ دار بھی یہیں ہیں اور چوہدری بھائی آپ بھی تو یہاں پاس ہیں۔ دونوں کا خیال رکھیے گا۔

اگلے ہفتے دونوں باپ بیٹی مشرقی پاکستان کے لیے روانہ ہو گئے۔ گھر میں دونوں نانی دوہتی رہ گئیں۔ ثنا اپنی سہیلیوں کے ہم راہ صبح کالج جانے کے لیے جس سٹاپ سے سوار ہوتی' عبداللہ بھی وہیں سے اومنی بس پکڑتا تھا۔ اُس نے اپنے راستے بدل ڈالے۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ آنکھ اُٹھا کر اُن کی طرف ایک نظر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ بس سٹاپ پر بہت دور ہٹ کر کھڑا ہوتا اور ڈبل ڈیکر کی اوپر والی منزل میں سفر کرنے لگا۔ اُس کی یہ حکمتِ عملی کافی حد تک کامیاب رہی اور تابڑ توڑ حملوں میں خاطر خواہ کمی ہو گئی۔ لیکن ایک مسئلہ تھا کہ وہ گھر سے باہر نکلتا تو سامنے برآمدے میں کھلنے والی کھڑکی کے پیچھے اُسے کھڑے ہوئے دیکھتا۔ اُس نے اب دیکھنا چھوڑ دیا لیکن یہ جانتا تھا کہ وہ وہاں موجود ہوتی ہے۔ رات کو اس نے کئی بار دیکھا کہ ثنا کے کمرے میں اندھیرا ہے لیکن ایک موم بتی جل رہی ہے۔ اگلے روز ایک کی بجائے دو اور تیسرے روز تین۔ موم بتیوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے اتنی زیادہ ہو گئی کہ کمرہ چراغاں کا منظر پیش کرنے لگا۔ تب اُس نے کبھی کن انکھیوں سے اُس جانب دیکھا تو ثنا کو اندھیرے میں پھلجھڑی جلائے کھڑے پایا۔

اب وہاں اندھیرے میں اکثر ایک ہیولا سا دکھائی دیا کرتا۔ عبداللہ مطمئن تھا کہ امن ہو گیا ہے۔ تاہم اُس نے محسوس کیا کہ شوخی' تیزی طراری' جملہ بازی' ہلا گلا اور چلبلا پن سب

ماند پڑ گیا ہے اور اس کے برعکس ایک یاس اور افسردگی کی سی فضا چھا گئی ہے۔

چند ہفتوں کے وقفے سے اُسے گھر کے پتا پر خط موصول ہوا۔ ماں نے بند لفافہ اس کے حوالے کر دیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے کھولا تو نوٹ بک کے پانچ اوراق خوب بھر کر لکھے گئے تھے۔ مختلف الفاظ' سنگ دل' ظالم' کٹھور' بے رحم اور نہ جانے کیا کیا۔ جلے کٹے جملے اور اشعار کی بھر مار ہوئی پڑی تھی۔ عبداللہ نے خط تلف کر دیا اور اپنی تعلیم کی جانب یک سُوئی سے توجہ دینے لگا۔ اُس نے آنے والے دنوں میں نوٹ کیا کہ ثنا کالج نہیں جا رہی۔ اس سے بھی بہت پہلے سے وہ دودھ لینے نہیں آ رہی تھی۔ عبداللہ کی اماں نے ایک برتن میں تقریباً ڈیڑھ پاؤ دودھ ڈالا اور خود جانے لگی تو بیٹے نے منع کیا لیکن وہ بولیں۔ ''اُس کا باپ اب گھر میں نہیں۔ جب تک وہ نانی دوہتی اِدھر ہیں' میں دودھ دینے جایا کروں گی اور اس کا کوئی پائی پیسہ وصول نہیں کریں گے۔'' اسے اپنی ماں کی سخاوت پسند نہیں آئی لیکن دل و دماغ میں اس خاتون کی عظمت کے نقوش بڑے گہرے ثبت ہو چکے تھے اس لیے ٹوکنا گوارہ نہیں تھا۔

فاروقی صاحب کو مشرقی پاکستان گئے ابھی تین ماہ کا عرصہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ثنا اور اس کی نانی اماں نے رختِ سفر باندھ لیا۔ حالانکہ طے یہ ہوا تھا کہ ثنا بی اے کا امتحان دے لے گی تو انہیں پاس بلا لیا جائے گا۔ نانی دوہتی اس کے ہاں ملنے آئیں تو عبداللہ سامنے کمرے میں موجود تھا۔ ثنا اس کی ماں سے گلے لگ کر بہت روئی۔ کہنے لگی۔ ''اماں! کہا سنا معاف کر دینا۔ کون جانے اب کے بچھڑے تو کبھی ملنا نصیب بھی ہوگا۔''

عبداللہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ تاہم وہ حیرت زدہ بھی تھا کہ یہ کیسی ریاکاری ہے۔ اُسے وہ گالی اندر سے کچل رہی تھی جو محض نسلی حوالے سے دی گئی تھی۔ اسے یہ پسند نہیں آیا کہ وہ اس کی ماں سے لپٹ کر روئے اور ''ماں'' کہہ کر پکارے۔ وہ اس امر پر اپنی بہنوں سے بھی جھگڑا کیا کرتا کہ اب ان میں سے ہر کوئی اپنی اپنی ساس کو ''ماں''

سمجھے اور میری ماں پر کلیم چھوڑ دے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اب اس خاتون پر صرف اور صرف اس کا اپنا حق ہے کہ وہ اسے ماں کہے۔ لیکن یہاں منظر ہی کچھ اور تھا۔ اس کی ماں ثنا کو اپنے ساتھ لپٹا کر بڑے پیار سے سہلاتے ہوئے دلاسے دے رہی تھی۔ کتنے ہی لمحے اس طرح گزر گئے تو انہوں نے ثنا کے ماتھے چہرے اور سر پر بوسے دیئے۔ دونوں شانوں سے تھام کر پاس چارپائی پر بٹھایا اور بڑی محبت سے باتیں کرنے لگیں۔ نانی سے پوچھا کہ طے شدہ پروگرام سے پہلے کیوں چل دیئے تو وہ بولی۔ ''ارے! ہم کیا جانیں؟ اس دو بالشت کی لونڈیا سے پوچھو۔ پہلے باپ سے ضد کری کہ بی اے ادھر سے کرنا ہے اور اب اُس کا ناک میں دم کر رکھا۔ خط پہ خط اور فون پہ فون کہ ابھی کوچ کرنا ہے۔ سب ستیاناس کر دیا پڑھائی کا اور چل دی ہمارا مرودہ خراب کرنے۔''

عبداللہ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بغیر کچھ بولے گھر سے نکل گیا۔ کچھ بنگالی کی دکان پر اور زیادہ وقت لائبریری میں گزار کر رات گئے گھر آ گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ دونوں کھانا کھا کر رخصت ہوئیں اور ثنا جاتے ہوئے بہت روئی۔ عبداللہ نے اپنی ماں سے گلا شکوہ کیا کہ وہ ایسی لڑکی کے ساتھ غیر معمولی مروت سے پیش آئیں جس کا رویہ درست نہیں' بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ وہ لڑکی ٹھیک نہیں۔ ماں نے فوراً ٹوک دیا اور کہا کہ وہ اللہ سے معافی مانگے۔ ایسے کلمات آئندہ کبھی بھی زبان پر نہ لائے۔ اس میں تکبر کا رنگ نمایاں ہے۔ وہ تکبر کے تصور ہی سے کانپ اٹھتی تھیں اور اکثر ادھورا شعر سنایا کرتیں ''چھوڑ تکبر پکڑ حلیمی' پوی کنڈائیں سوئے''۔ وہ کہنے لگیں کہ ثنا بہت اچھی لڑکی ہے۔ اُس کے من میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ جس تن میں محبت کرنے والا من ہوتا ہے' اس میں بُری سوچ پنپ نہیں سکتی۔ ''دل دریا سمندروں ڈھونگے کون دلاں دیاں جانے ہُو؟'' ہم عامی' دلوں کے بھید کیا جانیں۔

عبداللہ نے سب کچھ بتا دینا چاہا لیکن ایسا نہیں کر سکا' تاہم کہنے لگا کہ وہ

گالیوں پر اُتر آتی ہے۔ ماں نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ "بُرا بول جو اُس کے لبوں سے ادا ہوا ہوگا' وہ اُس کا اپنا نہیں ہو سکتا۔ زبان اُس کی ہوگی اور سوچ کسی اور کی۔ جیسے کوئی بدروح کسی نیک پر غالب آ جاتی ہے۔" عبداللہ چپ رہا لیکن یوں دیکھ رہا تھا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ اُس کی ماں نے کہا۔ "ثنا بہت اچھی لڑکی ہے۔ میرا بس چلے تو میں اُسے ہمیشہ کے لیے پاس رکھ لوں۔ تمہارے لیے۔" عبداللہ آگے بڑھ کر ماں کے سامنے آ گیا اور آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ "اماں! آپ اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتی ہیں؟ مجھے بڑا افسوس ہو رہا ہے۔ آپ ذرا غور سے دیکھیں اُس کالی پرچھائیں کو۔" ماں نے انگشتِ شہادت لہراتے ہوئے کہا۔ "ناں! میرے بچے ایسا نہیں سوچتے۔ کالی کرماں والی۔ ورقے قرآن مجید دے چٹے' اُتے سیاہی رب دی کالی۔ تیری اکھ نہیں ویکھن والی۔" عبداللہ نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ "پیاری اماں! ذرا سوچیں تو سہی۔ اس طرح پوتے پوتیوں اور کٹے کٹیوں میں فرق ہی نہیں رہے گا۔ بے چاری بھینسوں کو کیا کیا مغالطے پڑیں گے۔" ماں نے پھر وہی بات دہرائی اور کہنے لگیں۔ "ثنا کی ڈور اب کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ اُس کی حالت ایسی ہی ہے۔ جن دے ہتھ بانہہ اساڈی' کیونکر آکھاں چھڈ دے اڑیا۔" وہ مزید بولیں۔ "اور جن وہ اوپر والا خود ہے یا اس کا کوئی مجاز۔ یہ وہی جانے' اوڑک کم اللہ نال۔"

ثنا جا چکی تھی لیکن اُس کا گھر ابھی تک خالی پڑا تھا۔ کسی کو الاٹ کیوں نہ ہوا؟ عبداللہ کو معلوم نہیں تھا۔ وہ اپنے گھر سے نکل کر برآمدے میں کھلی کھڑکی سے پار کمرے میں کسی ہیولے کو تلاش کرتا۔ یوں گمان گزرتا کہ وہاں پہلے کوئی اہم ہستی تھی جو وجودی طور پر ہوتے ہوئے بھی عنقا ہوگئی اور پھر وجودی طور پر بھی موجود نہ رہی۔ مزار بن گیا' جس پر چراغاں ہوا کرتا تھا۔ اب وہ مزار بھی اُجڑ گیا ہے۔ کوئی مجاور رہا نہ سوگوار۔ کسی بے نوا کے ارمانوں کا مرقد تھا یا گورِ غریباں۔ منظر سوگوار ہو گیا ہے۔ وہی گھر ہے' وہی شہر

اور دنیا کی وہی رونقیں۔ ایک کاغذی سی جان کے دم سے کتنی ہنگامہ آرائیاں تھیں' اب وحشتیں برستی ہیں۔ عبداللہ کہیں انجانی دنیا میں کھو جاتا اور نہاں خانے کے کسی گوشے سے پچھتاوا جنم لینے لگتا لیکن وہ کچھ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اسے کس بات کا ملال ہے۔ اگر کوئی خود ہی مہربان اور پھر نامہربان ہو کر ترش روئی پر اتر آئے تو دوش کس پر؟ وہ خطاکار ہوتا تو رضا جوئی کے لیے پیش قدمی کرنے میں تامل نہ کرتا۔

وقت سدا کا ہرجائی بے' منہ موڑ کر یوں گزر جاتا ہے جیسے کوئی سروکار نہ ہو' کسی کا یار نہ ہو۔ کاش! ایسے ہی گزرتا رہتا۔ جہاں ہجر و فراق کی داستانیں مرتب ہوتیں وہاں وصالِ یار کی صورتیں بنتی بگڑتی رہتیں۔ لوگ اسے مقدر جان کر اپنے حصے کی خوشیاں اور غم دامن میں سمیٹ کر زندگی گزار لیتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وقت ایک غضب ناک عفریت کی طرح بپھر گیا اور اس نے بستیوں کی بستیاں اُجاڑ دیں۔ سارے انسانی رشتوں کی حرمت تاخت و تاراج کر کے رکھ دی اور لاکھوں انسانوں کے خون سے پیاس بجھا کر بدمستی کے عالم میں یوں گزر گیا جیسے وہ نروش ہو۔

انسان کے بس میں ہو تو وہ لوحِ حافظہ کو یوں دھندلا دے کہ اس پر لکھے درد بھرے افسانے پڑھے نہ جا سکیں۔ ثنا ایک اور ہجرت کر کے لوٹ آئی تھی۔ وہ اپنے دکھوں پر اب روتی بھی نہیں تھی۔ شاید آنسوؤں کے سوتے خشک ہو گئے تھے۔ وہ شکر گزار تھی ستم شعار کی کہ اُس کی معصوم بہن کی ننھی بچی لاش آسانی سے مل گئی۔ ورنہ وہ عمر بھر انتظار کا عذاب جھیلتی۔ باپ کے فرائضِ منصبی ہی اُس کے قاتل ٹھہرے اور نانی اماں کو کسی نے قتل نہیں کیا۔ وہ آزادی کے اس دوسرے روپ کی تاب ہی نہیں لا سکیں۔

ایک روز ثنا کے دل میں نہ جانے کیا سودا سمایا کہ خط لکھنے بیٹھ گئی۔ مکتوب الیہ کو یوں مخاطب کیا۔ "تمھیں عبداللہ لکھوں کہ اللہ دتہ؟ یقین جانو! میں وہی کچھ لکھنا چاہوں گی جو تجھے پسند ہو۔ میں ایک اور ہجرت کرنا چاہتی ہوں۔ اُس شہر میں' جہاں لاکھوں

لوگ بستے ہیں اور وہاں آباد اُس گلی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں جہاں میرا بچپن گزرا اور لڑکپن۔ جس گلی میں ایک پٹھان اور ایک فلکتی رہتا تھا۔ بہت سے بنگالی اور وہ لوگ بھی جن میں سے ایک میں تھی۔ اُس مکان کو ایک بار دیکھنا چاہتی ہوں' جس میں میری بہن اور میرا وہ باپ رہتا تھا' جو بچپن میں وطن کی تلاش میں ہجرت کرتے ہوئے یتیم ہوا تو مشرقی پاکستان جا پہنچا۔ وہاں سے رزق کی تلاش میں یہاں چلا آیا اور پھر واپس لوٹ گیا۔ وہی گھر جس میں دوہری تہری ہجرتوں کے صدمے جھیلنے والی نحیف و نزار میری نانی اماں مر کر بھی صرف اس لیے زندہ رہی کہ اپنی بیٹی کی اولاد کو دیکھتی رہے۔ جس گھر کے سامنے بسم اللہ خاتون رہتی تھیں۔ جن کے لمس میں ممتا کی تڑپ میں نے شدت سے محسوس کی تھی۔ جہاں باہر لان میں ایک درویش کے پاس گلی کے بھی لوگ محفل لگایا کرتے تھے۔ اور اُن دونوں کا ایک بیٹا تھا' اللہ دتہ' جو اپنے آس پاس ہر دم منڈلانے والی دیوانی لڑکی ثنا سے نالاں تھا۔ میں اُسی ثنا کی بازگشت ہوں۔ وہاں آنا چاہتی ہوں۔ میں نے وہاں ایک سکول میں ملازمت حاصل کر لی ہے۔ لیکن اگر تمہیں بُرا لگے تو میں کبھی نہیں آؤں گی۔ اور ہاں! یہ سب کریدنا چاہتے کہ میں کن مراحل سے گزر کر یہاں پہنچی؟ تو یہ جان لو کہ ہر وہ عذاب جھیل کر جو وہاں ہم جیسوں کا مقدر بنا تھا۔"

ثنا فاروقی

دولے موٹے چوہدری صاحب نے مکتوب الیہ کا نام پڑھنے کا تکلف ہی نہیں کیا۔ لفافہ پھاڑ کر خط پڑھنے لگے اور پڑھتے ہی چلے گئے۔ پڑھ چکے تو سخت دل گیر ہو کر خط اپنی بیگم کی طرف بڑھایا اور خود یوں لیٹ گئے جیسے نڈھال ہو گئے ہوں۔ بیگم صاحب نے دو تین بار خط پڑھا اور خود کلامی کرنے لگیں۔ "لوک ولاںتاں رب سنے چادر دو منداں دیاں آئیں ہو۔" خاتون اُٹھیں اور صحن میں چہل قدمی کرنے لگیں۔ پھر باہر باغیچے میں چلی گئیں اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر چوہدری صاحب کے سامنے بیٹھ کر بولیں۔

"چوہدری صاحب! لڑکی نمانی نے بڑے دُکھ اُٹھائے ہیں۔ یہاں اور وہاں سینکڑوں اُس کے رشتہ دار ہوں گے۔ دکھوں کی ماری نے لاکھوں لوگوں میں سے ہمیں ہی کیوں پکارا ہے؟ اللہ اپنے بندے کے دروازے پر خود دستک دینے نہیں آتا۔ یقیناً مالک سچے کے اذن پر اُس کے دل نے گواہی دی ہوگی جو ہماری کنڈی کھڑکائی ہے۔"

چوہدری صاحب نے بوجھل لہجے میں کہا۔ "او جی! ہم سو بسم اللہ کر کے کنڈی کھول دیتے ہیں لیکن ساری بات ہے جی سے جی ملنے کی۔ اصل میں اُس دل کا دروازہ کھلنا چاہیے جس پر دستک دی گئی ہے۔ ذرا سوچیں! اگر ایسا نہ ہوا تو ہم دین اور دنیا دونوں سے گئے۔"

بیگم صاحبہ نے جواب دیا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ ہمارا دین اور دنیا مالک سچے کے ہاتھ میں ہے۔ وہ بڑی اَنا والی ہے۔ خیرات قبول نہیں کرے گی۔ دل کا دروازہ نہ کھلا تو پہلی دستک پر ہی لوٹ جائے گی۔ آپ بسم اللہ کر کے میری طرف سے خط لکھیں۔ میں خوش آمدید کہنے کے لیے بے تاب ہوں۔"

انارو

گلابی جاڑوں کی رُت میں جب شدت آ جاتی اور چاندنی اپنے پورے جوبن پر ہوتی تو اُس کے اردگرد پھیلے ہوئے فلک بوس پہاڑ برف کے لحاف اوڑھے دم سادھ لیتے' ساری فضا اداسی کی بوجھل دھند میں دبی دبی سسکیاں لینے لگتی' درختوں سے گرے سوکھے پتے ہوا کے دوش پر اِدھر اُدھر سرکتے تو ایک عجب سا زرد رنگ پت جھڑ کا موسم اُس کے دل میں سما جاتا۔ وہ سوچتی کہ زندگی کے کس موڑ پر کب کوئی خزاں کا موسم اُس کے باغ ہستی کو اُجاڑ گیا تھا۔

کہیں بھی کوئی اِس اُلجھی ڈوری کا سرا اُس کے ہاتھ نہیں آتا تھا۔ یوں جیسے وہ کبھی بھی کسی ہری شاخ سے جُڑا سبز پتا نہیں تھی۔ یوں ہی روزِ اوّل سے اِک آوارہ زرد سوکھے پتے کی مانند اجنبی پاؤں تلے کچلی گئی۔ وہ اس موسم میں اکثر دو تین راتوں کے لیے عتیق کے ساتھ انہی پہاڑوں پر آیا کرتی تھی۔ دونوں گزشتہ کئی برسوں سے اپنی اپنی نا آسودہ خواہشوں کو بہلانے کے لیے یہاں اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ عتیق ایک شریف اَپر مڈل کلاس گھرانے کا لاڈلا بیٹا جسے اُس کا باپ ہر صورت میں اعلیٰ سول آفیسر دیکھنا چاہتا تھا۔ جب کہ عتیق کا ذہنی میلان یکسر مختلف تھا۔ مایوسی کے عالم میں وہ کہا کرتا تھا۔

"مجھے میرے باپ نے اپنی تشنۂ تکمیل خواہشوں کی بیڑیاں پہنا کر یرغمال بنا رکھا ہے۔ مجھے تب تک رہا نہیں کیا جائے گا جب تک کشتری کی صورت میں تاوان ادا نہیں کر دیتا۔"

ہر انسان کے اپنے ہی دُکھ ہوتے ہیں اور ہر دکھ کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔
عتیق میں بغاوت کا بھی حوصلہ نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ جو آسودگیاں اسے گھر سے میسر تھیں وہ انہیں کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اسی بندش کے باعث ہی وہ زندگی کی راہ پر مضبوط قدموں سے نہ چل سکا۔ بیزاری کے دھندلکوں میں نیم دلانا لڑکھڑاتے قدموں سے سول سروس کی اعلیٰ منزل کی جانب بڑھتا رہا۔ اُس کے باپ کے تمام مادی وسائل کے باوجود اُس کو اپنی روٹھی ہوئی صلاحیتوں کا حاصل صرف پی اے ایس کی صورت میں ملا۔ اُسے دکھ تھا کہ اب بقیہ تمام زندگی افتادِ طبع کے برعکس گزارنا ہوگی۔

شروع میں عتیق سے انارکلی کے مراسم روائتی مروجہ کاروباری اصولوں کے مطابق ہی استوار ہوئے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اِن دونوں کے مابین قائم تعلقات میں اپنائیت کا رنگ جھلکنے لگا۔ وہ اپنے دکھ بیان کر لیتا اور انارکلی اُس کی دل جوئی کیا کرتی۔ وہ دونوں مئے وصل اور مئے ناب میں اپنے اپنے مقدر کے دُکھ تحلیل کیا کرتے تھے۔ عتیق بے خود ہو جاتا لیکن انارکلی پر طاری وقتی مدہوشی کا دورانیہ بڑا مختصر ہوا کرتا تھا۔ احساسات و جذبات میں لگی آگ اس کے تن بدن کو جھلسا دیتی اور وہی ایک زہرناک سوال' جو آگہی کے ان معتبر لمحات میں اُس کی سوچوں پر پھن پھیلا لیتا اور آنِ واحد میں اس کی روح کو ڈس لیتا تھا کہ وہ کن منزلوں کی مسافر ہے۔ وہ سوچتی' کاش مقدر نے اسے زندگی میں سچی محبت کی انمول نعمت بخشی ہوتی تو خود اپنی دنیا سنوار لیتی۔ خواہ عشق کی مسافرت میں اُس کے پاؤں میں آبلے ہی کیوں نہ پڑ جاتے۔ دمِ آخر بھی کبھی نہ لڑکھڑاتی۔ وفا ہی نہ ملی' ورنہ صلۂ وفا میں اپنی جان وار دیتی۔ زندگی بھر کے سارے دکھوں اور محرومیوں کی تلخی اُس کے خون میں سرایت کر جاتی اور دامن آنسوؤں سے تر ہو جاتا۔

عتیق کے ساتھ شناسائی کے دنوں میں اُسے اپنی زندگی کا ایک ایک تلخ لمحہ یاد آ جاتا...... ابھی کم سن تھی۔ کہیں کوئی شجرِ سایہ دار نہ تھا۔ وہ سوچتی اِس جہاں میں نہ

جانے وہ عورتیں کیسی ہوتی ہیں جن کی زندگی کی راہوں میں ہر سُو نرم شبنمی ریشم جیسی گھاس بچھی ہوتی ہے۔ جہاں پیار کی پھواریں برسیں اور کبھی آس کے فلک بوس کوہساروں پر گرتی یاس کی برف کے پس منظر میں دوسرے ہی لمحے خوابوں کی تعبیر کا سورج طلوع ہو جاتا ہے۔ وہ خوش بخت چہرے کیسے ہوتے ہیں جن پر سچی خوشیوں اور پاکیزہ محبتوں کا حسن دمکتا ہے۔ خواہشوں کی کھیتیوں میں نت رنگے پھول کھلتے ہیں۔ جن کی محبتوں کے آب گینے عمر بھر اعتماد کے ہاتھوں میں محفوظ وفا کے سینوں سے لگے حیات افروز حرارت میں یوں بچے رہتے ہیں کہ اُن پر مایوسی کی یخ بستگی اور حوادثِ زمانہ کی جان لیوا تپش سے کبھی بال نہیں آتا۔ جیسے وہ خالق کی جانب سے مخلوق کے لیے کوئی انمول سوغات ہوں۔ جنہیں محبت ملتی ہے اور عزت بھی۔ جس سے زندگی پر بھروسا قائم رہتا ہے اور انسانیت کا بھرم بھی۔ اکثر سوچا کرتی' آخر اُس کا اپنا وجود کیا معنی رکھتا ہے جسے عمر بھر جھوٹی محبتوں کے سوا کچھ نہیں ملا۔ زندگی کا سارا سفر ننگے پاؤں تپتے ریگزاروں اور سنگلاخ پہاڑوں کے جلتے پتھروں اور دہکتے سنگریزوں پر طے کیا تھا۔ ہوس کے ہنٹر ننگے بدن پر یوں بے حساب برسے کہ جا بجا نیل پڑ گئے۔

اُسے وہ وقت بھی یاد تھا جب بچپن میں والدین کے ساتھ گاؤں سے شہر آ کر آباد ہوئی تھی۔ اُس کا باپ ایک کارخانے میں ملازم ہو گیا اور اُسی کارخانے کے ایک ''چھڑے چھانٹ'' افسر کے گھر وہ سب رہنے لگے تھے۔ اُس کی اماں گھر کے کام کاج کیا کرتی تھی۔ وہ خود سکول جانے لگی اور سہ پہر کو قرآن پاک پڑھنے جایا کرتی۔ وہ اس کے کھیلنے کودنے کے دن تھے۔ ابھی وہ معصوم تھی اور اسے اپنے طبقے کے لوگوں کی حقیقی زندگیوں کی سنگینیوں کا احساس نہیں تھا۔ وہ دوپہر اُسے کبھی نہیں بھول سکتی تھی جب اُس کی ماں سودا لے کر ابھی بازار سے نہیں لوٹی تھی اور باپ ڈیوٹی پر تھا۔ وہ برآمدے میں اپنے سکول کا کام کر رہی تھی کہ صاحب نے اُسے کمرے میں بُلا لیا تھا۔ انسانیت اُس

کے سامنے ننگی ہو گئی تھی۔ اُس کے اندر ایک نازک سا شیشہ' جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکتی تھی' چکنا چور ہو گیا تھا۔ بہت بعد میں اِس حقیقت کا ادراک ہوا کہ زندگی کے اِس پہلو سے اُس کی ماں اور باپ بہت پہلے سے سمجھوتا کیے ہوئے تھے۔ تب اُسے احساس ہوا کہ اُس کی ماں گھر کے کام کاج کے علاوہ بھی بہت کچھ کرتی رہی ہے۔ وہ بہت ہی روئی اور ماں سے کہا تھا۔ ''اماں! میں نے یہاں نہیں رہنا۔ گاؤں چلتے ہیں۔'' ماں کا پتھر سا چہرہ آج تک یاد ہے اور الفاظ بھی۔

''انارو! گاؤں میں بھی یہی کچھ ہوتا تھا۔ چپ کر جا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں فاقے تھے اور یہاں پیٹ بھر روٹی ملتی ہے۔''

گاؤں میں جب وہ پیدا ہوئی تو ماں نے اُس کا نام انار بیگم رکھا تھا۔ سب لوگ اسے انارو کہتے تھے۔ انارو نے بہت جلد اپنے من کے اندر پندار کا پہلے سے ذرا مضبوط ایک آبگینہ بنا لیا جسے کچھ ہی عرصہ بعد ایک کاری ضرب نے توڑ دیا اور اس کے خنجر جیسے نوکیلے ٹکڑوں نے اُسے چھید دیا۔ اِس مرتبہ شرفِ انسانیت کا لبادہ جس ہستی نے تار تار کیا' وہ انارو کے لیے بڑی محترم تھی' اُسے دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے والی۔ اِس واقعہ پر صاحب تیغ پا ہو گیا۔ دونوں شرفا کے مابین ٹھن گئی۔ مولوی صاحب نے اہلِ محلّہ کے ساتھ مل کر تھانے میں صاحب کے خلاف بدکاری کا مقدمہ درج کرایا تو انارو' اس کی ماں' باپ اور صاحب' سب حوالات میں بند ہو گئے۔

انارو کو یقین ہو گیا کہ وہ دنیا میں صرف ایک ہی مقصد کے لیے پیدا ہوئی ہے' وہی' جس کی تکمیل نوعمری ہی میں کر چکی تھی۔ اب تھانیدار کے ہاتھوں کر رہی ہے۔ اُس کی سوچوں کے آگے کوئی پردہ کوئی ابہام نہیں رہ گیا تھا۔ تھانے میں اُس کی ماں اور اُس کا اپنا حشر ایک سا ہوا تھا۔ تھوڑی سی تفتیش کے بعد وہ چھوٹ گئے۔ صاحب نوکری چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ لیکن انارو اور اس کی ماں کو گاہے بگاہے مزید تفتیش کے سلسلے میں تھانے

جانا پڑتا۔ مفت کی تفتیش سے تنگ آ کر ایک رات وہ تینوں بس پر بیٹھ کر لاہور آ گئے۔

اب وہ پہلے جیسی انارو نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنا نام انارکلی رکھ لیا تھا۔ پہلے اُس نے ایک پرائیویٹ سکول میں ملازمت کر لی اور کچھ عرصہ بعد ایک ڈاکٹر کے کلینک میں' لیکن یکے بعد دیگرے دونوں چھوڑ دیں۔ وہ سراسر گھاٹے میں تھی۔ وہ جو بھی نوکری کرتی اُس میں اسے دوہری ڈیوٹی کرنی پڑتی تھی۔ پورا مہینا گزرنے پر جو قلیل تنخواہ ملتی' اُس کے عوض اضافی خدمات مفت میں سرانجام دینی پڑتی تھیں۔ وہی اضافی خدمات' جن کے عوض بعض اوقات' اگر قسمت یاوری کر جاتی اور کسی خوشحال شریف مرد سے معاملہ طے ہو جاتا تو محض ایک نشست یا ایک رات میں' مہینا بھر کی تنخواہ کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ معاوضہ مل جاتا۔ معاً ایک روز اُس نے کہا۔

''انارو! تُو کس شرافت کی زندگی کے لیے بے کل ہوئی پھرتی ہے۔ ناحق دوہرے آزار اٹھاتی ہے۔ پگلی اس دنیا نے تیرے لیے جو کردار تفویض کر دیا ہے' تُو اسے سلیقے اور ڈھنگ سے ادا کر۔''

ہوس کے پجاریوں نے اُس کی زندگی کو جنسی آلائشوں سے داغ دار کر دیا۔ وہ چاہتی کہ کسی طرح پیار و وفا کی خوشبو کا ایک جھونکا اور خلوص کی صرف ایک لپٹ ہی مشامِ جان میں سما جائے تو وہ اپنی تمام زندگی کا سودا اُس ایک لمحے کے نام کر دے۔ لیکن یہ اُس کا مقدر نہیں تھا۔ اُس کی خواہشوں' خوشیوں اور غموں کا انداز بدل گیا۔ جس طرز کی زندگی گلے کا ہار بنی' اُن ہی بیڑیوں اور طوق کے مطابق اپنا وجود ڈھال لیا تھا۔ اب اُس کی ترجیح یہی ہوا کرتی کہ کسی ایسے ہی شخص سے معاملہ پڑے جو معاشرے میں شرافت کی زندگی بسر کرتا ہو۔ معاملہ طے کر کے بددیانتی نہ کرے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بات اپنے لیے کر کے لے جائے اور وہاں کچھ دیگر کنگلے ساتھی بھی ہوں۔ شروع شروع میں ناتجربہ کاری کے باعث اس نے بڑے غلط سودے کیے اور جسمانی اذیتیں اٹھائی تھیں۔ لیکن

رفتہ رفتہ وہ اپنے کام میں ماہر ہو گئی۔ ایک وقت آیا کہ چند شریف اور خوشحال مردوں سے اُس کا مستقل معاملہ طے ہو گیا۔ اس طرح کئی سال گزر گئے اور اب قدرے آسودہ زندگی بسر کر رہی تھی۔ لیکن ہر دم اپنی بیٹی کے مستقبل کے لیے فکرمند رہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی کہ اُس کی بیٹی پر ماں کا عکس اور تیرہ بختی کی پرچھائیں پڑے۔ وہ بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتی تھی۔ اس منصوبہ بندی کے تحت اُس نے رہائش ایک بہتر علاقے میں تبدیل کر لی۔ بیٹی کو اپنے بوڑھے ماں باپ کے پاس چھوڑا اور خود راولپنڈی چلی آئی تھی۔

پنڈی میں اب اس کے کئی مستقل مربوط اور منفعت بخش مراسم بن چکے تھے۔ وہ باقاعدگی سے رقم لاہور بھیجتی رہی۔ بیٹی عاصمہ بڑے اچھے سکول میں پڑھتی تھی۔ انارکلی کے دل و دماغ میں یہی ایک سودا سما گیا تھا کہ کسی طرح بیٹی کی آئندہ زندگی محفوظ ہو اور وہ معاشرے میں باعزت مقام حاصل کر سکے۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر وہ کسی شناسا سے اپنے گھر اور بیٹی کا ذکر نہیں کیا کرتی تھی' ماسوائے عتیق کے۔ وہ بھی اُسے بیٹی کی تعلیم کے مسئلے میں مشورے دیا کرتا تھا۔ دلچسپی لیتا اور حوصلہ افزائی کیا کرتا۔ بڑے وثوق سے کہا کرتا تھا۔ ''انارکلی! تمہاری بیٹی کا مستقبل بڑا تابناک ہو گا۔''

o

دفتر کے باہر لگی تختی پر لکھا تھا۔ ''اے اے خان' ایڈیشنل اکاؤنٹنٹ جنرل۔''
اُس نے تختی پڑھی تھی لیکن کیا خبر تھی کہ اے اے خان دراصل عتیق احمد خان ہو گا۔ وہ عتیق کو بائیس سال پیچھے ماضی کے گرد و غبار میں چھوڑ آئی تھی۔ آج اُس کی بیٹی اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل کی حیثیت سے جوائن کرنے آئی تو عتیق سے انارکلی کا اچانک سامنا ہو گیا تھا۔ وہ دہل گئی۔ گزشتہ زندگی کی کتاب کا ایسا ورق کھل گیا جس کا ایک ایک لفظ ناگفتنی تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ماضی کی کہانیوں کے کردار اُس کی بیٹی سے متعارف ہوں۔ وہ اپنی بیٹی کو اُن کے سائے سے بھی محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ اچانک اُس نے اپنی

بیٹی کی کلائی کو مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے لیا اور کھینچتے ہوئے دفتر کے کاریڈور سے بھاگ کر باہر نکل گئی۔ عاصمہ چیخ رہی تھی۔ ''امی مجھے جوائن کرنا ہے۔ ایڈیشنل صاحب کیا سوچیں گے؟''

انارکلی کی سانس پھول رہی تھی۔ بدقت اُس کے ہونٹوں سے الفاظ ادا ہوئے۔ ''نہیں کرنا جوائن تمہیں۔ جلدی چلو یہاں سے۔ خبردار جو مُڑ کے دیکھا۔''

وہ کسی ٹیکسی کی تلاش میں موڑ کے قریب پہنچی ہی تھیں کہ پیچھے سے ایک کار اوورٹیک کر کے ان کے آگے آڑی ترچھی اس طرح سے آن رُکی کہ دونوں ماں بیٹی کا راستہ بلاک ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے عتیق گاڑی سے باہر نکلا اور عاصمہ کے سر پر دایاں ہاتھ رکھتے ہوئے انارو سے مخاطب ہوا۔ ''وہی بیٹی ہے ناں! جس کے مستقبل کے منصوبے ہم Share کیا کرتے تھے؟''

وہی معتبر لمحہ جس کے لیے بدنصیب عورت عمر بھر ترستی رہی یوں سرِراہ مٹھی میں بند ہو جائے گا، کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اُس کا وجود موم کی مانند پگھلنے لگا۔

ہیرو

آٹھویں اور نویں جماعت میں اُس نے دو دو سال جب کہ میٹرک میں تین سال لگائے' پھر بھی چند نمبروں پر بمشکل تھرڈ کلاس تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ ماں باپ اور بڑے بھائی نے باری باری حسب توفیق دو دو جوتے مارے' لعن طعن کی اور ہر طرح سے غیرت دلائی' لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ انتہائی درجے کا فیشن پرست ہونے کے باعث پورے شہر میں ہیرو کے نام سے مشہور تھا۔ بلکہ رفتہ رفتہ ایسا سکہ بند ہیرو ثابت ہوا کہ اُس کا باپ بھی اُسے ہیرو کہہ کر پکارنے لگا۔ گھر والے اور دیگر احباب اُس کا اصل نام رؤف اور بچپن کی عرفیت رُوفی' جیسے بھول ہی گئے۔

وہ اپنے تمام تر دستیاب وسائل فیشن پر ہی صرف کر دیتا۔ کہیں بھی جاتا وہ فٹ پاتھوں اور لنڈا بازاروں میں بڑی عرق ریزی سے کم خرچ بالا نشین کے مصداق نئی نئی لیکن سستی اشیائے زیبائش تلاش کر لیتا۔ اُن دنوں شاید ہی کوئی اپنے بالوں کو براؤن کیا کرتا تھا۔ اگر کسی کے بال براؤن نظر آتے بھی تو کم ہی لوگ سمجھ پاتے کہ مصنوعی رنگ ہے۔ نہ جانے ہیرو کو یہ نسخہ کہاں سے ہاتھ لگ گیا۔ معلوم ہوا کہ مائع ہائیڈروجن کا کرشمہ ہے۔ بال بڑھے ہوئے ہوتے۔ کنگھی ہر وقت جیب میں ہوتی۔ رنگ برنگی شرٹس اور تیز رنگوں کی پتلونیں زیب تن کرتا۔ نئے نئے ڈیزائنوں والی بیلٹس کمر پر کس کر باندھتا اور کالی عینک ہر وقت لگائے رکھتا۔ بوٹ ایسے چمک رہے ہوتے کہ اُن میں عکس نظر آتے۔ اپنے کپڑے گھر میں خود دھو کر کلف لگاتا۔ کوئلے والی استری ایسی نفاست سے کرتا کہ کوئی ہلکی سے ہلکی شکن بھی کہیں نظر نہ آتی۔ پوری سج دھج سے باہر نکلتا۔ ماسوائے

کرسی کے کہیں نہ بیٹھتا مبادا لباس میں شکنیں پڑ جائیں۔ پیسے شاذ و نادر ہی ہاتھ لگتے اس لیے باپ اور بڑے بھائی کی متروک پتلونیں درزی سے ری فٹ کروالیتا۔ سارے جتن کرنے کے باوجود بھی کوئی زیادہ کپڑے اس کے پاس نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے جب محسوس کرتا کہ کسی ایک قمیض یا پتلون کی آب و تاب ماند پڑ گئی ہے تو بازار سے کوئی رنگ لاکر خود ہی ڈائی کر لیتا۔ ایک آدھ ماہ بعد اُسی کپڑے پر کوئی دوسرا رنگ چڑھا لیتا۔ لیکن جب تیسری مرتبہ ایسا کرنے کی ضرورت محسوس کرتا تو اس کپڑے کو کالا رنگ لیتا۔ اس طرح وہ ایک ہی کپڑے میں اکثر و بیشتر تین مزے ضرور لیتا۔

کلین شیو تھا۔ ہلکا میک اپ کرتا اور خوشبو ضرور لگاتا۔ قد صرف پانچ فٹ چار انچ تھا۔ بہت دُبلا پتلا۔ طرہ اس پر یہ کہ خوب کس کر بیلٹ باندھتا۔ یوں گمان گزرتا کہ بڑے قد کاٹھ کا مرد ہیرو کو کمر سے ایک ہاتھ کی گرفت میں جکڑ کر ہوا میں معلق کر سکتا ہے۔ یوں تو جسم پر بھی بوٹی نہیں تھی لیکن چہرہ زیادہ ہی دُبلا تھا۔ رخسار اندر کو دھنسے ہوئے تھے اس لیے چہرے کی ہڈیاں اور ٹھوڑی بہت نمایاں تھی۔ رنگت گندمی لیکن ہر وقت تازہ شیو بنی ہوتی جس پر تبت سنو مل کر ہلکا پوڈر لگاتا۔ دوست مذاق کرتے۔ "یار ہیرو! تمہارا چہرہ یوں لگتا ہے جیسے کمزور بکرے کا بھنا ہوا پایہ ہوتا ہے۔" کئی ہم عصر اسے چھوٹا کھراوڑا کہہ کر پکارتے۔

مرد دوستوں سے ہیرو کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ اُسے پورے قصبے کے بارے میں یہ بھرپور معلومات حاصل تھیں کہ کس گھر میں کتنے افراد ہیں۔ خصوصاً اُس کی مخصوص دلچسپی کے۔ اُسے گلی گلی محلہ محلہ چکر لگانے پڑتے۔ بعض گلیوں میں نوجوان لڑکوں اور مردوں نے اس کا داخلہ بند کر رکھا تھا۔ شہر میں کئی مقامات پر اُس کی جسمانی ٹکور ہو چکی تھی۔ صنفِ قوی سے عموماً کتراجاتا اور ایسے اوقات میں من پسند گلیوں میں جانے سے اجتناب برتا کرتا جن کے دوران وہاں کے مقیم مرد حضرات کے اپنے اپنے گھروں میں موجود ہونے کا امکان ہوتا۔ سارا سارا دن بھوکا پیاسا اپنے شوق کی بھینٹ چڑھا اِدھر

اُدھر مارا مارا پھرا کرتا۔ جیب میں ایک آنہ بھی نہ ہوتا کہ کہیں سے بھنے ہوئے چنے ہی خرید کر کھا لے۔ اس لیے ہر آنے والے وقتوں میں وہ سمارٹ در سمارٹ ہوتا چلا گیا۔

تھرڈ ڈویژن کا داغ دھونے کے لیے عزم کیا۔ اللہ کا نام لے کر دوبارہ میٹرک کا امتحان دیا۔ تمام ممکنہ ذرائع اور صلاحیتیں آزمائیں لیکن سابقہ ریزلٹ کی نسبت دو نمبر مزید کم ملے۔ خوب گت بنی اور اب اُسے ہر کوئی ہیرو ڈبل میٹرک کہنے لگا۔ ہیرو کی بدقسمتی تھی کہ جسامت بہت ہی مختصر اور اس پر مستزاد آواز بڑی بھاری اور پھٹی پھٹی سی تھی۔ ترنگ میں آ کر کوئی گیت الاپتا تو بجائے رنگ بھرنے کے سچوایشن مزید خراب کر دیتا۔ جملہ خامیوں کے باوجود محض اس کی اَن تھک جدوجہد اور دن رات کی تگ و دو کا حاصل تھا کہ مخصوص میدان میں گوناگوں کامیابیاں حاصل تھیں۔ یہ اور بات تھی کہ مخصوص طرز کے تعلقاتِ عامہ کو وسعت دینے کے معاملے میں اُس کا ظرف بھی عمرو عیار کی زنبیل کی مانند کسی طور بھرتا ہی نہیں تھا۔ اس لیے وقت بے وقت ہر جگہ قسمت آزمائی پر ہمہ وقت آمادہ رہتا' جس وجہ سے گاہے بگاہے ہلکی پھلکی اور کبھی بھاری مرمت ہو جاتی۔ استفسار پر جواب گھڑا گھڑایا ملتا کہ رات کو سیڑھیوں سے گر گیا یا تانگہ بس سے اُترتے ہوئے پاؤں رپٹ جانے سے چوٹ لگ گئی۔ ہیرو کے والد صاحب کا آئے دن کے طعنوں سے ناک میں دم ہو گیا لہٰذا گاہے بگاہے وہ بذاتِ خود بھی دو چار ہاتھ جڑ دیا کرتے۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ ہیرو اپنے مستقبل سے غافل تھا۔ اُس نے مستقبل سنوارنے کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ جب بھی ڈبلیو پی آئی ڈی سی کا ٹرک لاہور جاتا' وہ ڈرائیور کی منت سماجت کر کے ہم راہ چل دیتا کہ سفر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے۔ وہاں تمام دن بھوکا پیاسا رہ کر فلم سٹوڈیوز کے طواف کرتے ہوئے جانے کیسی کیسی سختیاں کھینچتا۔ کوئی عینی شاہد جاننے والوں میں سے نہیں تھا لیکن سننے میں آتا کہ اپنی سی کوششیں بہت کیں۔ کئی ایکٹریسوں کی کوٹھیوں کے باہر سارا سارا دن گزارا' دھکے کھائے اور لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔ وہ کم پر بھی قناعت کرنے کو تیار تھا۔ اس لیے مختلف تھیٹرز اور سرکس

کمپنیوں کے گرد بھی منڈلاتا رہتا۔ قصبے اور آس پاس جس بھی نزدیکی شہر میں کوئی میلہ نمائش لگتی' لازماً پہنچتا۔ سدا کی طرح تہی دست ہونے کے باعث ٹکٹ خرید کر اندر جانے سے ہمیشہ محروم رہ جاتا لیکن عقبی خیموں کے گرد مسلسل چکر لگاتا رہتا۔ کبھی کبھار گپ شپ کی راہ ہموار ہو جاتی لیکن زیادہ تر تاگفتنی ہی در پیش آتی۔ ڈھول دھمکا مقدر بنتا جارہا تھا۔ ہیرو کا اپنا ایک کم سے کم معیار تھا جس سے نیچے وہ کسی صورت گرنا نہیں چاہتا تھا ورنہ اپنے ہی شہر کے مشہور ہیجڑے "مس بجلی" نے اُسے اپنی سنگت میں لینے کی پیش کش کئی بار کی جسے اُس نے ہر بار ٹھکرا دیا۔

شہر کے لوگوں کی شکائتیں درکنار' جب دو بار تھانے میں بھی پیشی ہوئی تو ہیرو کے والد صاحب کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ وہ پہلے ہی عاجز آئے ہوئے تھے۔ بالآخر انھوں نے اپنے ہی محکمہ کے الیکٹرسٹی ونگ میں ہیرو کو ٹول میٹ بھرتی کروا دیا۔ تنخواہ کا سکیل بڑا ہی نرالا تھا۔ ۶۰-۲-۷۰-۵-۱۰۰ اور وہ بھی ورک چارج کی کیٹگری میں۔ اُس کی ڈیوٹی سینئر الیکٹریشن کے ساتھ بطور معاون کے تھی۔ کام کی نوعیت یہ کہ سرکاری کوارٹروں' بنگلوں اور دفاتر میں جہاں کہیں بجلی کی وائرنگ میں کوئی نقص پڑنے کی شکایت موصول ہو' موقع پر جا کر درستگی کی جائے۔ گھروں اور بنگلوں کی جملہ شکایات کا ازالہ کرنے کا کوئی موقع وہ کسی صورت میں ہاتھ سے گنوانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بلکہ اُس کا بس چلتا تو بعض خاص خاص گھروں اور بنگلوں میں موقع پر ہی اپنا کیمپ آفس قائم کر لیتا تاکہ محترم مکینوں کو اپنی ہمہ وقت خدمات پیش کیے رکھے۔ اُسے اپنے عہدے کے اجزائے ترکیبی اور پے سکیل سے شدید نفرت تھی لیکن کام کی نوعیت عزیز از جان۔ محکمے سے باہر کے لوگوں کے استفسار پر خود کو سینئر الیکٹریشن یا بھی کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے جونیئر الیکٹریشن کے جاب پر فائز ہونے کی نوید سنایا کرتا۔ اُس نے اپنے ٹریڈ میں زیادہ مہارت حاصل کرنے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ لیکن دیگر قدرتی طور پر ودیعت شدہ صلاحیتوں کو نہایت خلوص نیت سے پالش کر کے چابک دستی سے بروئے کار لانے

میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اس سلسلے میں وہ یہاں تک بھی کر گزرتا کہ کسی پسندیدہ چنیدہ گھر میں ایک سوئچ ٹھیک کرتے کرتے دوسرا خراب کر آتا اور جونہی دن کو مرد حضرات ڈیوٹی پر چلے جاتے تو بعض اوقات بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے شکایت کا باقاعدہ اندراج ہونے سے قبل ہی اپنی پیشہ ورانہ خدمات سرانجام دینے پہنچ جاتا۔

دراصل نیکی کا زمانہ ہی نہیں رہا تھا۔ ہیرو کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے گاہے بگاہے بہت ہی بھونڈے انداز میں دل شکنی کی گئی۔ تُرش روئی اور کھینچا تانی کی حد تک خیر ہی تھی کہ یہ اب معمولاتِ زندگی کا حصہ بن چکا تھا۔ بے درد زمانے والوں نے چند ایک بار ہیرو کی مشقتوں سے کی گئی قلیل کمائی میں سے خریدی ہوئی شرٹ پتلون کا ہی سرقہ بالجبر کر لیا۔ ظالموں نے جوش میں یہ بھی خیال نہ کیا کہ پتلون کسی کھونٹی پر نہیں لٹک رہی بلکہ لحہ موجود میں تن ڈھانپے ہوئے ہے۔

ظالم سماج ہیرو کے مستقبل کے لیے ہمیشہ ہی سدِ راہ ہوئے رہا۔ ورنہ وہ اسی عہدے پر دستیاب سکیل میں بھی زندگی کی گاڑی دھکیلنے پر پورے عزم و ہمت سے ڈٹا رہنا چاہتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ باہمی تعلقات کو فروغ دے کر ترقی کا کوئی سنہری زینہ چڑھنے میں کامیاب ہو جاتا۔ بلکہ اس سمت میں وہ اپنی جملہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر جوں ہی کوئی پیش رفت کر لیتا تو اکثر گھروں کے بھائی اور باپ آڑے آ جاتے۔ وہ سوچتا' کاش یہ نامراد مرد شہر چھوڑ کر کہیں چلے جائیں جو بیل منڈھے چڑھنے ہی نہیں دیتے۔ لوگوں نے اپنی روش بدلی نہ اُس نے اپنی فطری مستقل مزاجی کا دامن چھوڑا۔ باپ محکمے میں اکاؤنٹس آفیسر تھا۔ بڑا سینئر ملازم اور اچھی شہرت کا حامل۔ لیکن دو بار تھانے میں اور پانچ بار ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن کے روبرو پیشی ہو گئی۔ وجہ وہی ہیرو بیٹے کی ہیرو ازم میں دن بدن بڑھتی ہوئی سرگرمیاں تھیں۔ ہیرو کے والد صاحب نے خود ہی اُس کے فرائضِ منصبی کا دائرۂ کار محض سرکاری دفاتر اور عمارات تک محدود کروا دیا۔ البتہ ایڈمن سیکشن نے حوصلہ افزائی کے لیے ہیرو کو جونیئر الیکٹریشن کے عہدے پر ترقی دے

دی۔ لیکن ہیرو کو چرخِ کج رفتار کا یہ سنگین ستم قبول نہ تھا۔ وہ اتنا بھولا بھی نہیں تھا کہ اپنی اس نام نہاد ترقی میں مضمر تنزلی کو سمجھ نہ پاتا۔

شہر کے لوگوں نے جب رستہ نہ دینے کی ٹھان لی تو اُس دل گرفتہ ہیرو نے بَن کی راہ لی۔ شہر کے باہر مضافاتی بستیوں کا رُخ کیا۔ ایک بڑا مسئلہ یہ بھی تھا کہ بصارت کمزور تھی لیکن نظر کا چشمہ لگانا پسند نہیں کرتا تھا۔ لہٰذا اِس نئے سلسلے کے ابتدائی دور میں اُسے بڑے دھوکے ہوئے۔ دُور سے کچھ سجھ نہ آتی۔ سرسبز کھیتوں میں جب وہ بڑی آس سے قریب جاتا تو نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ وہاں اسے اکثر اوقات بڑے معتبر رشتے جوڑنے پڑ جاتے۔ کسی کو ماسی پھپھی یا ماں جی کہہ کر آئیں بائیں شائیں کر کے اپنا سامنہ لے کر کسی نئی منزل کی مسافتوں پر نکلنا پڑ جاتا۔

یہاں ہیرو اپنی عقل اور گزشتہ تجربے سے مات کھا گیا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ کوؤں کے جھرمٹ میں رنگ برنگا اجنبی پرندہ گھس آئے تو اُس کا کوئی پَر سلامت نہیں رہا کرتا۔ ستم یوں ہوا کہ جونہی دیہاتیوں کی مہمان نوازی پر اُن کی فطری جہالت اور اُجڈ پن غالب آیا تو انہوں نے شرافت کے تمام پردے چاک کر دیئے۔ ناگفتنی جو ہوئی سو ہوئی کہ کوئی پَر تو پَر رُواں بھی نہ چھوڑا۔ نتیجتاً کسی نے تھانے میں اطلاع کر دی کہ مضافاتی بستی کے قریب کھیتوں میں ایک مختصر سا انسانی جسم لباس کا تکلف برطرف کیے عین فطری حالت میں زخموں سے چُور پڑا ہے۔ خدا معلوم زندہ ہے یا مردہ۔ لیکن جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ اپنے پاؤں پر پھر سے چلنے پھرنے میں اڑھائی ماہ کا عرصہ لگ گیا۔ لیکن ہیرو اب اپنے شہر کے لوگوں سے روٹھ کر لائل پور چلا گیا۔ وہاں کسی مِل میں الیکٹریشن کا جاب مل گیا اور ماہوار تنخواہ ۱۰۸ روپے مقرر ہوئی۔ اس کے بعد پرانے دوستوں کو کوئی خبر نہ ہوئی کہ ہیرو کہاں غائب ہو گیا۔ کبھی کبھار بڑی فکر دامن گیر ہوتی کہ خدانخواستہ ناہنجار زمانے کے ہاتھوں کہیں پھر مشقِ ستم نہ بن گیا ہو۔

٭

پچیس سال بعد بیرون ملک سے لوٹ کر جب میں نے یہ انڈسٹریل یونٹ قائم کیا تو اس میں تھری فیز ہیوی وائرنگ کے لیے کسی تجربہ کار الیکٹریکل انجینئر کی ضرورت درپیش ہوئی۔ گزشتہ روز چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی میٹنگ میں چند صنعت کار ساتھیوں سے مشورہ کیا تو اُن میں سے اکثر نے ایک ہی شخص کو بالاتفاق تجویز کیا جو تجربہ کار تھا اور معاوضہ بھی نہایت ہی موزوں لیا کرتا۔ آج میرے دفتر میں وہ شخص آیا بیٹھا تھا۔ نام حاجی رؤف صاحب تھا۔ بڑی نفاست سے شرع کے مطابق تراشی ہوئی سفید داڑھی اور مونچھوں پر مشین پھری ہوئی۔ لبوں کے گوشے اردگرد سے صفا چٹ۔ بائیں گوشے میں وہی بچپن کا گہرا نشان اور آنکھ کے نیچے موٹا تِل۔ وہی قد و قامت، بھاری پھٹی پھٹی سی آواز۔ بغور دیکھا' تمام تر ناک نقشہ وہی۔ نام بھی رؤف۔ فرق محض اتنا تھا کہ لباس شلوار قمیض' سر پر نماز والی سفید ٹوپی' نظر کا چشمہ اور صورت نورانی۔ اب رتی بھر بھی شک نہیں رہا تھا۔ اپنی کرسی سے اُٹھ کر میں نے حاجی صاحب کو گلے لگایا۔

''یار مجھے پہچانو۔ میں تمہارا کلاس فیلو ادریس ہوں۔''

وہ کچھ خجل سا ہوا اور کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا۔

میں نے تمہیں فوراً پہچان لیا تھا لیکن تم نے مجھے اِس حالت میں کیسے پہچانا؟''

بہت باتیں ہوئیں۔ میرا سارا شیڈول بدل گیا۔ لیکن مجھے بڑی خوشی تھی کہ اپنے آبائی قصبے کا کلاس فیلو اور ابتدائی دَور کا دوست اتنے طویل عرصے کے بعد یوں اچانک ڈرامائی انداز میں مل گیا تھا۔ بڑی خوش گوار حیرت کا احساس ہوا۔ کیونکہ وہ بڑے ہی مختلف روپ میں ملا تھا۔

معلوم ہوا کہ ماشاء اللہ چار بیٹیاں ہیں اور دو بیٹے۔ بیٹے ساتھ کاروبار میں شریک ہیں۔ دو بیٹیاں بیاہی ہوئی ہیں۔ ایک کا میاں مقامی کالج میں اسلامیات کا لیکچرار ہے۔ دوسرا داماد ڈاکٹر ہے۔ پرائیویٹ پریکٹس کرتا ہے اور ایک مذہبی جماعت کا عہدیدار بھی ہے۔ دوسری دونوں بیٹیاں کالج میں زیرِ تعلیم ہیں۔ بڑا اللہ کا فضل ہے۔

اپنے کام میں بڑی مہارت حاصل ہو چکی ہے۔ نیک نامی ہے۔ عرصہ دراز سے ہیوی پراجیکٹس پر کام کرنے کا تجربہ ہے جس وجہ سے عام کارخانے دار کوالیفائیڈ الیکٹریکل انجینئروں پر حاجی عبدالرؤف کو ترجیح دیتے ہیں۔ مالی حالت بڑی مستحکم ہو چکی ہے۔ ہر سال تبلیغی دورے پر بھی جاتے ہیں۔

باتیں کرتے کرتے ایک بجا تو حاجی رؤف ایک دم کھڑا ہو گیا۔

"یار مجھے جانے دو تمہاری بھتیجیوں کو کالج سے لانا ہے۔"

"یار بیٹھو ابھی کھانا ایک ساتھ کھائیں گے۔ بڑی باتیں کرنی ہیں۔ بھرا پڑا شہر ہے۔ ایسی بھی کیا فکر مندی۔"

میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر بٹھانا چاہا۔

"نہیں نہیں! اس مسئلے میں غفلت نہیں برتی جا سکتی۔ یہ ڈیوٹی صبح شام میں خود سرانجام دیتا ہوں، تمہیں معلوم نہیں زمانہ بڑا خراب ہے۔" حاجی نے بے ساختہ کہا۔

بے اختیار میری ہنسی نکل گئی اور وہ بھی ہنس دیا۔ میں نے کہا:

"ابے ہیرو! مجھے اچھی طرح معلوم ہے لیکن زمانہ اب محفوظ ہو گیا ہے۔ ذرا بات انصاف کی کر......"

اُس نے کھل کر قہقہہ لگایا اور آگے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے میرے ساتھ بغل گیر ہوا۔ ہنستے ہوئے بولا۔ "بکواس کرنا سخت منع ہے۔"

***

بے نوا

کمی صرف کمی ہوتا ہے' بس اچھے بُرے کی کیا تُک ہے؟ مجھے اُن رذیلوں کی شکل سے نفرت ہے۔ آپ نے کبھی اُس کا چہرہ غور سے دیکھا ہے؟"...... ملک فرمان اپنے دادا کی تاویلوں سے زچ ہو کر بولا۔

"بدمغزے! ہوش کے ناخن لو۔ اپنے عزائم دشمن پر ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ یہ صدیوں سے جاری کھیل کا حصہ ہے۔ تم اسے پھوہڑ پنے سے بگاڑ رہے ہو۔ اب وقت بدل چکا ہے اس لیے طریقہ کار بھی پہلے جیسا نہیں رہا۔ جو کام انتظامیہ کے ذریعے ہو سکتا ہے وہ خود سرانجام دے کر اپنے ہاتھ خراب کیوں کرتے ہو۔ میں آج ہی بات کر لیتا ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم خود پر قابو پانا سیکھو۔"...... ملک فتح خان نے اپنے پوتے کو نرم لہجے میں سمجھایا۔

فرمان کھول کر رہ گیا۔ اُسے اپنے دادا پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ تاہم وہ اِس کا اظہار براہِ راست نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے اِس بات کا رنج تھا کہ دادا جوانی میں خود جو چاہتا کر گزرتا تھا لیکن اولاد کو مرضی کرنے سے روکتا ہے۔ وہ پھر بحث پر اُتر آیا۔

"آخر آپ اس موچی کے بچے کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں؟ وہ ہے کیا چیز؟ ایک معمولی کارکن' ایسے لاکھوں پڑے ہیں۔ اب وہ یونٹ کا عہدے دار بھی نہیں رہا اور میرے پاس ضلعی قیادت ہے۔"

''تم اب شامل ہوئے ہو۔ اوپر بھی قیادت ہے۔ وہ بنیادی رکن ہے' بہت جانا پہچانا' اعلیٰ سطح کی قیادت تک۔ اُس نے بہت قربانیاں دی ہیں۔ تم بے صبرے نہ بنو' میں نے کہا ناں' میں سنبھال لوں گا۔''...... ملک فتح خان نے پوتے کو تحمل سے جواب دیا لیکن وہ بڑبڑانے لگا۔

''یہ ہوتے کس لئے ہیں؟...... قربانیاں دی ہیں تو کیا وہ سردار بن گیا ہے؟ رہے گا وہی موچی کا موچی۔''...... پھر وہ قدرے توقف سے بولا...... ''بات دراصل یہ ہے دادا! کہ میں خود اپنے ہاتھوں سے اُس کا دماغ درست کرنا چاہتا ہوں۔ ورنہ اُسے پتا کیسے چلے گا؟ آپ نے اُس کی مونچھیں دیکھی ہیں کبھی؟ جیسے کسی ریاست کا مہاراجہ ہو۔ سلام کرنا درکنار بات کرنے سے بھی کتراجاتا ہے۔ ایسے مگن رہتا ہے جیسے کسی سے کوئی سروکار ہی نہیں۔'' چند لمحے وہ خاموش رہ کر پھر بول پڑا...... ''دادا! آپ اپنے دور میں سب کچھ کرگزرتے تھے۔ مجھ پر یہ پابندی کیوں؟''

ملک فتح خان کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ جیسے چند لمحوں کے لیے کسی گہری سوچ میں ڈوب کر مسرور ہو گیا ہو۔ پھر اچانک ماضی کے فلیش بیک سے خود کو آزاد کرا کے آزردہ لہجے میں بولا:

''میرے بچے' میرے شہزادے! وہ اشرافیہ کا دور تھا۔ حاکم شرفا کا ساتھ دیتے تھے۔ وہ قدردان کب کے جا چکے۔ یہاں اب جمہوریت نے مشٹنڈ پنا مچا رکھا ہے۔ ہر بدنسلا بڑبڑ کرتا پھرتا ہے۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ تُو معاملے کی نزاکت کو کیوں نہیں سمجھتا۔ میں کہہ رہا ہوں ناں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن اس انداز سے نہیں جیسے تُو کہہ رہا ہے۔''

وہ کوئی غیر معمولی قد کاٹھ کا مالک نہیں تھا۔ جسم متناسب اور خدوخال اوسط درجے کے تھے لیکن چہرے کا زیادہ تر حصہ مونچھوں نے کیموفلاج کر رکھا تھا۔ ماتھا' ٹھوڑی' آنکھیں اور ناک کی پھنگی نمایاں طور پر نظر آتی تھی۔ وہ صرف ٹھوڑی پر سے بال

مونڈھ لیا کرتا تھا۔ چہرے کی دونوں اطراف پر قلموں سے نیچے داڑھی کے بال بھی بڑھا کر اپنے گل مچھوں میں شامل کر رکھے تھے۔ یہ مونچھیں ہی اُس کا واحد سرمایہ تھیں اور وجۂ امتیاز بھی۔ دن رات انہی کی فکر کیا کرتا۔ انہیں سنبھالنا سنوارنا گویا اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر کوئی کچھ بھی اندازہ قائم کرلے لیکن درحقیقت وہ ایک ایسا شریف، امن پسند اور حال مست شخص تھا جسے کسی بھی غیر پسندیدہ فعل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُس کا پورا نام یقیناً شیر محمد ہی تھا۔ وہ ذات کا موچی تھا اور اس معاشرے میں ایسے افراد کو اصل یا پورے نام سے پکارنا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

جب پارٹی بنی تھی تو شیرو کو ایسے لگا تھا جیسے اُس کا دل گواہی دے رہا ہو کہ اب ان خوابوں کی تعبیر ملنے والی ہے جو صدیوں سے اس کے آباؤ اجداد کی آنکھوں میں سلگتے رہے۔ پارٹی کی پیاسی زمین پر وہ بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوا۔ شروع میں علاقے کے سرکردہ لوگوں نے اس تبدیلی کو درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھا۔ مستقل اثر و رسوخ والی برادریاں اور بڑے دھڑوں کے حامل مؤثر لوگ شیرو کی دیوانگی پر ہنستے تھے لیکن آہستہ آہستہ نچلی سطح کے بہت سے لوگ اس کے ساتھ شامل ہوتے چلے گئے۔ تب بھی کسی بڑے نے اس صورتِ حال کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا۔ بلکہ گاؤں اور علاقے کے مقتدر حلقے پارٹی کو اس کے اصل نام سے پکارنے کی بجائے کمیوں کی پارٹی کہا کرتے تھے۔ پھر وہ وقت آیا جب اصل طاقت کا رُخ اسی جانب ہو گیا۔ معجزے رونما ہوئے۔ غالب قوتوں کی توقعات خاک ہوئیں اور انہونیاں ہو گئیں۔

کسب داروں کو پانچ پانچ مرلے کے پلاٹ بلا معاوضہ مالکانہ حقوق پر ملے تو شیرو کو ایسے لگا جیسے اس غیر معمولی واقعہ نے اُسے انتہائی انوکھا احساسِ تحفظ عطا کر دیا ہو۔ وہ لوگ نسلوں سے ایسی چھتوں تلے رہتے چلے آرہے تھے جو ملکوں کی ملکیتی اراضی پر کھڑی تھیں۔ اسے یہ بہت مشکل نظر آرہا تھا کہ وہ کیسے اپنے ذاتی پلاٹ پر گھر بنائے گا

لیکن یہ ایک ایسا سہانا سپنا تھا جسے وہ ہر صورت شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے گارے، گھاس پھونس اور سرکنڈوں سے ایک کوٹھا کھڑا کرلیا۔ اس طرح نئی آبادی میں پہلا گھر آباد ہوگیا۔ اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے کندھوں سے ذلتوں کے پہاڑ سرک گئے ہوں۔ اپنا کچا گھر اسے کسی قلعے کی طرح مضبوط اور محل جیسا شان دار لگتا۔ اُس نے دل سے عہد کرلیا کہ وہ اپنی پارٹی کے لیے زندگی وقف کردے گا اور کوئی کڑی سے کڑی آزمائش بھی اس کے عزم پر غالب نہیں آسکے گی۔

شیرو کا دادا مضبوط قوتِ ارادی کا مالک، نڈر اور ایک بہادر شخص تھا۔ اُس نے جب سے ایسی باتیں اپنے مرحوم دادا کے بارے میں سنی تھیں، ایک طرح کے احساسِ تفاخر سے معمور رہنے لگا۔ شیرو نے سن رکھا تھا کہ وہ دسمبر کی ایک سرد رات تھی۔ شیرو کے باپ دین محمد کو معمول کے مطابق عشاء کے بعد ڈاک بنگلے پہنچنا تھا تاکہ اپنے والد یار محمد کی جگہ رات کی ڈیوٹی دے سکے۔ اُس کے جانے میں ابھی وقت باقی تھا کہ اچانک کچھ لوگ ڈانگیں اٹھائے اندر گھس آئے۔ اُن کے چہرے منڈاسوں میں چھپے ہوئے تھے۔ بغیر کوئی وجہ بتائے پل پڑے اور اس کا اوپر کا دھڑ بچا کر ٹانگوں کو مونج کی طرح کوٹ کر رکھ دیا۔ دین محمد اور اُس کے گھر کی خواتین تمام رات چارپائیوں سے بندھی پڑی رہیں۔ اُن کے منہ کپڑے ٹھونس کر بند کردیے گئے تھے۔ وہ سب یار محمد کے منتظر رہے کہ شاید دین محمد کا کچھ دیر تک انتظار کرنے کے بعد خود ہی گھر آجائے لیکن رات گزر گئی اور وہ آج تک کبھی لوٹ کر گھر نہیں آیا۔

دین محمد کی ٹانگیں سوکھ گئیں۔ بہت عرصہ بعد دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر اوپر کے دھڑ کو ہلاتے ہوئے کچھ فاصلے تک سرکنے لگ گیا۔ وہ گھر بیٹھے جوتیوں کی مرمت کا کام کرتا رہا لیکن چند سال ہی زندہ رہا۔ شیرو نے اپنے دادا کو دیکھا ہوا نہیں تھا۔ تصور میں ہی اُس کی شخصیت کا خاکہ بڑے نمایاں اور واضح نقوش کے ساتھ وضع کرلیا تھا۔

جب بھی وہ دادا کے بارے میں سوچتا تو ایک جانی پہچانی سی شبیہ اُس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی۔ وہ یوں محسوس کرتا جیسے اُس نے اپنا بچپن دادا کی گود میں گزارا ہو۔ اُس سے کھیلا ہوا ہو۔ دونوں ایک ساتھ باہر گھومنے جاتے رہے ہوں۔ شیرو کو جیسے یقین تھا کہ گزری ہوئی زندگی کے کسی حصے میں اُس کی اپنے دادا سے بڑی گہری دوستی رہی تھی۔

ڈاک بنگلہ کبھی کبھار ہی مختصر وقفوں کے لیے آباد ہوا کرتا تھا۔ وہاں یار محمد چوبیس گھنٹے کا ملازم تھا۔ سرکار کے لوگ ہی وہاں آ کر ٹھہرتے تھے۔ شیرو نے سن رکھا تھا کہ اُس روز ڈاک بنگلے میں دو اجنبیوں کے ہم راہ ملک فتح خان بھی آیا ہوا تھا۔ یقیناً وہ بہت بڑے افسر ہوں گے۔ ملک فتح محمد اس علاقے کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ چھوٹے موٹے افسر خود اس کے دربار میں ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ وہ شہر سے گاؤں شاذ و نادر ہی آیا کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ یار محمد نے شام کے بعد کچھ آثار دیکھ لیے تھے جن کی پردہ پوشی کرنے کے لیے وہ خود پر جبر نہیں کر پایا۔ اُس نے ملک فتح خان سے ہاتھ جوڑ کر التجا کی تھی کہ وہ علاقے کا سردار ہونے کے ناتے اپنے سامنے غیروں کے ہاتھوں ایسا نہ ہونے دے۔ ملک فتح خان یہ کیسے برداشت کر لیتا کہ ایک نیچ ذات شخص اُسے ٹوک دے۔ جب وہ بار بار کی تنبیہ کے باوجود ڈٹا رہا تو اس بے وقت اور غیر متوقع پھڈے کو نپٹنے کے لیے یار محمد کی مشکیں کس دی گئیں اور جنوب مشرقی کمرے میں لے جا کر چھت سے اُلٹا لٹکا دیا گیا۔ یہ کمرہ جلانے والی لکڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ تاہم دسمبر کی اُسی سردرات کمرے کا فرش اکھاڑ کر دوبارہ جوڑ دیا گیا۔

شیرو ڈاک بنگلے کا اس طرح احترام کیا کرتا جیسے وہ کوئی خانقاہ ہو۔ دُور سے بھی وہ اس عمارت کو دیکھ لیا کرتا تو رُخ اس جانب موڑ کر فاتحہ پڑھنے لگتا۔

تقدیر کرشمہ ساز ہے یا تدبیر غالب آ جاتی ہے۔ بے نواؤں کے خون میں نہ جانے کیا تاثیر ہے کہ وہ جس چمن کی آبیاری اس سے کرتے ہیں اس کے پیڑ اتنے

سر بلند ہو جاتے ہیں کہ ان کے سائے کچے گھروندوں کو الانگ کر حویلیوں کو اپنی چھتر چھایہ میں لے لیتے ہیں اور رسیلے ثمر بلند فصیلوں کے اندر جھڑنے لگتے ہیں۔ وہی ہوا جو ہوتا آیا ہے۔ خون دینے والے مجنوں بے وقار ہو گئے اور دودھ پینے والے سبیلوں کے وارث ٹھہرے۔ ملک فتح خان کے جانشینوں کو ہی زیب دیتا تھا کہ وہ ایسی شایانِ شان ذمہ داریاں نبھائے اور برسر اقتدار پارٹی کی قیادت سنبھالیں۔

لیکن وقت نے کچھ ہی عرصہ بعد بساط اُلٹ دی۔ سبیلیں سوکھ گئیں تو وارثوں نے رُخ موڑ کر قبلے نئے سرے سے درست کر لیے۔ شیرو نے وفا کے تقاضے نبھانے کے لیے خود کو آزمائشوں کی صلیب پر لٹکا دیا۔ کئی سال بعد وہ جب لوٹا تو اس کا ایک ایک جوڑ بند جیسے اُکھڑ چکا تھا لیکن وہ اپنی ذات کے نہاں خانوں میں ایک مضبوط چٹان بن چکا تھا۔ اس کے جسم پر اذیتوں کے نشان اسے کمزور نہیں کر سکے۔ ادراک و آگہی نے اُسے ایک طرح کے اطمینانِ قلب سے فیض یاب کر رکھا تھا۔ اُس کی طویل غیر حاضری کے دوران اس کی بستی اُجڑ چکی تھی۔ جب سے کسب دار نئی آبادی میں مقیم ہوئے تھے' ان میں سے بیشتر مزدوریاں کرنے شہر چلے جاتے اور گاؤں کے اصل وڈیروں کے بہت سے کام ادھورے رہ جاتے۔ انہیں بار بار سمجھایا گیا کہ وہ سابقہ گھروں میں لوٹ آئیں۔ تقدیر نے جو فرائض انہیں تفویض کیے ہیں خوش دلی سے بجا لائیں۔ لیکن لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے تو تقدیر کے لکھے پر عمل درآمد کرانے کے لیے انہیں راہِ راست پر لانا ضروری ہو گیا۔ لاتوں' ڈنڈوں اور بندوقوں کے بٹ استعمال میں لا کر مقاصد کا حصول ممکن ہو سکا۔ گھر اُجڑ گئے لیکن ان کی چھتوں پر سابقہ مکینوں کی گمراہی کے نشان لہراتے رہے۔ کہیں کوئی فریاد ہوئی نہ داد۔ ایسے گم گشتہ راہ طبقات بڑے دربار سے بھی گردن زدنی ٹھہرے۔

شیرو نے پھر اپنے ملکیتی پلاٹ پر ڈیرہ جما لیا۔ وہ کسی کو کچھ نہیں کہتا تھا لیکن

اس راز کو نہیں پا سکا کہ جس معاشرے کا وہ حصہ ہے اس میں صدیوں سے قائم روایات سے انحراف درحقیقت اصل اقتدار اعلیٰ سے بغاوت کے مترادف ہے۔ ایسے لوگ سامنے آ جائیں تو ان شریانوں میں دباؤ خطرناک حد تک بڑھ جاتا ہے جن میں نسلی خون دوڑ رہا ہوتا ہے۔ شیرو کسی طور بھی باپ کے اڈے پر بیٹھ کر اپنا آبائی پیشہ اختیار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

چوروں کے بین الاضلاعی گروہ کا سرغنہ پکڑا گیا۔ کچھ مال مسروقہ بھی برآمد ہو گیا۔ تفتیشی افسر کے روبرو پیش ہوا تو وہ شیرو کو دیکھتے ہی ادب سے کھڑا ہو گیا۔ جھک کر اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا ہاتھ لے لیا' کرسی پیش کی اور پوچھا:

''جناب! میرے لائق کوئی کارخدمت ہو تو حکم کریں۔ ویسے جی گستاخی معاف' میں نے پہچانا نہیں۔ حضور کس علاقے کے سردار ہیں؟ ملک ہیں؟ راجے یا چوہدری؟''

پولیس افسر کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے شیرو نے جواب دیا...... ''میں شیرا موچی ہوں جناب! آپ کو اچھی طرح معلوم ہے اور مجھے بھی یہ پتا ہے کہ آپ نے یہاں مجھے کس لیے بلایا ہے۔''

دوران تفتیش سارے ہتھکنڈے ناکام ہو چکے تو تفتیشی افسر کو یہ ضد سی ہو گئی کہ شیرو اس سے معافی کی درخواست کرے۔ گڑگڑائے' التجا کرے' اس سے رحم کی بھیک مانگے۔ لیکن ایذا رسانی کا کوئی نسخہ کارگر ثابت نہ ہو سکا۔ اُس کی مونچھوں کا ایک ایک بال اکھاڑ دیا گیا۔ بالآخر افسر نے شرط عائد کر دی کہ وہ صرف ایک بار رحم کی اپیل کرے' ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لے تو اسے تفتیش سے خارج کر دیا جائے گا۔ شیرو کا ایک ہی جواب تھا...... ''کس بات کی معافی؟''

افسر اس کی ہٹ دھرمی اور اٹل ضد سے اس قدر چڑ گیا تھا کہ وہ خود اُٹھ اُٹھ کر مارنے لگتا۔ وہ حیرت انگیز مایوسی سے زچ ہو گیا تھا کہ ایک ایسے انوکھے ملزم سے پالا پڑ گیا جو معافی کی پیش کش کو رد کر رہا تھا۔ مارتے مارتے اس کا سانس پھول جاتا۔

وہ ہف کر پانی پینے لگتا لیکن شیرو اطمینان سے پڑا رہتا۔ پولیس افسر کے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہو چکی تھی کہ شیرو معافی نہیں مانگتا تو کسی ایسے زاویے سے اسے اذیت پہنچائی جائے کہ اس کے لبوں سے ''اُف یا ہائے'' کا کلمہ بے اختیار ادا ہو جائے۔ آنسو نہیں بہتے تو اس کی آنکھوں میں ایک نمی سی تیر جائے۔ افسر کے نزدیک یہ بات اب غیر اہم ہو چکی تھی کہ اسے چوری کے مقدمے میں اس لیے ملوث کیا گیا تھا کہ اسے کچھ آداب سکھائے جائیں لیکن اب اُس کا جرم صرف یہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنی مظلومیت پر فریاد کیوں نہیں کرتا۔ ہر اذیت کو پی جاتا ہے' کراہتا نہیں۔ ظلم کی دہائی کیوں نہیں دیتا۔ اگر گونگا ہو چکا ہے تو ہاتھ ہی جوڑے۔ اتنی سکت نہیں تو چہرے کو سوال بنالے اور اس پر جمی اَنا کی برف پگھل جائے۔ اب تو افسر خود کو مظلوم تصور کرنے لگا تھا۔ اُس کا جی چاہتا کہ وہ خود رو رو کر شیرو سے التجا کرے:

''چمار کی اولاد! خدا کے لیے مجھ سے معافی مانگ لو اور دفع ہو جاؤ۔''

عجیب گورکھ دھندا تھا کہ ایک بے نوا مغلوب شخص کی اَنا کا خول توڑتے توڑتے غالب کے تکبّر کا عظیم الشان برج ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ نسل درنسل موچی اُس کے سامنے ہتھیار نہیں ڈال رہا تھا۔ وہ اپنی ناقص کارکردگی پر شرمندہ تھا۔ کس منہ سے بڑے ملک صاحب کا سامنا کرتا۔ تاہم اُس نے بے بس ہو کر کھلے دل سے اپنی ناکامی کا اعتراف کرلیا اور رپورٹ دیتے ہوئے کہا کہ پتھر کو پیس کر ہوا میں اڑایا جا سکتا ہے لیکن اصلیت نہیں بدلی جا سکتی۔

*

شیرو لوتھ کی طرح گھر میں پڑا ہوا تھا۔ اُس کو جو بھی کوئی اپنا ملنے آتا دیکھ کر رو پڑتا۔ شیرو سب کو دلاسا دیتا۔ دور پار کی رشتہ دار خواتین اُسے صبر کرنے اور حوصلہ رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے خود بلک بلک کر رونے لگتیں۔ بڑی بوڑھیاں گلے سے لگا کر بین

کرتیں۔ وہ سب کو تسلیاں دیتا۔ اُس کے چاہنے والے جن کے ساتھ اُس کی نسلوں سے دکھوں کی سانجھ تھی' اُس کے جسم کو پیار سے سہلاتے تو ان میں سے بیشتر کے آنسوؤں کا تریلا کھلنے لگتا اور ہستی پہلے ہی ریلے میں کچے کوٹھوں کی طرح بہہ جاتی۔ خود شیرو نے اپنے آنسوؤں کا ذخیرہ ہمالیہ کے کہیں پار رکھ چھوڑا تھا۔ کچھ لوگ صرف یہ دیکھنے آتے کہ وہ ٹوٹ چکا یا ابھی تک سالم ہے۔ انہیں آگے بتانے کے لیے کوئی اچھی خبر ہاتھ نہ لگتی تو وہ مایوس ہو کر لوٹ جاتے۔

دادا اُسے کہہ رہا تھا:

"شیرو! میرا سوہنا! مجھے غیر کے دلالوں نے مارا تھا۔ یہ میرا مان تھا۔ میں نے ہنس کر جان دے دی تھی۔ میرے جگر کے ٹکڑے! اب وہ دلال خود حاکم ہیں۔ جھٹ سے اپنی "ضد کا نشان" اتار اور انہیں ہی بھیج دے۔"

دادا دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تو جگر پاش پاش ہو گیا۔ آنسوؤں اور آہوں میں ڈوبی ہوئی اُس کی آواز اُبھری۔

"لا! میری جان! مجھے اپنے زخم اور چوٹوں کے نشان تو دکھا۔ تجھے ان ظالموں نے بڑا مارا ہے۔"

وہ ایک عالم دیوانگی میں شیرو کے چہرے پر پڑے نیل چومنے لگا تو ہمالیہ زلزلے کی زد پر آ رہا۔ دراڑوں سے بہہ نکلنے والے آنسوؤں کے پہلے ہی ریلے نے اُسے اپنی لہروں پر اٹھا لیا۔

شیرو کی آنکھ کھل گئی۔ نہ جانے وہ کون سی گھڑی تھی۔ تاریک کمرے میں تنہا پڑا وہ تمام رات روتا رہا۔

دوزخ میں ایک پہر

طلبہ کو ٹیوشن پڑھانا ماسٹر گوہر کے نقطۂ نظر سے جائز نہیں تھا۔ وہ کہا کرتا کہ اگر پورے پیریڈ نیک نیتی سے پڑھائے جائیں تو اوقاتِ کار کے بعد مزید مغز کھپانا امرِ محال ہے۔ اس طرح کہیں نہ کہیں ناانصافی ہو جاتی ہے۔ تاہم اپنی بوڑھی والدہ اور اہل و عیال کی بہتر انداز میں کفالت کرنے کی غرض سے اُس نے کچھ رقم پس انداز کر کے ایک ٹیکسی اقساط پر حاصل کر رکھی تھی' جسے پیشہ ور ڈرائیور کے سپرد کر رکھا تھا۔ چھٹی کے وقت ڈرائیور گاڑی سکول لے آتا اور خود دو تین گھنٹے کے لیے گھر چلا جاتا۔ ماسٹر گوہر ایک محتاط ڈرائیور تھا لیکن لائسنس کے حصول کے لیے تحت ضابطہ کارروائی ابھی جاری تھی۔ چھٹی کے بعد وہ بیٹی کو کالج سے ہم راہ لے کر گھر لوٹ آتا۔

آج بھی معمول کے مطابق چھٹی ہونے پر کالج کی جانب چلا تو کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑی Missing کرنے لگی۔ گوہر نے ایک بہت بڑے سرکاری دفتر کی عمارت کے صدر دروازے سے چند گز آگے گاڑی روکی اور بونٹ اٹھا کر اندر جھانکنے لگا۔ اس اثنا میں ایک باوردی فوجی افسر دفتر کے گیٹ سے باہر آیا۔ اُس کے ہم راہ اونچے لمبے اور خوب تگڑے دو ادھیڑ عمر آدمی بھی تھے جو سفید براق دیہاتی پہناوے میں خوب جچ رہے تھے۔ اُنہوں نے اونچے شملے والی کلف لگی دودھ جیسی سفید پگڑیاں بڑے دیدہ زیب انداز میں سروں پر سجا رکھی تھیں۔ فوجی افسر موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا:

"گاؤں سے مہمان آ گئے ہیں۔ اس لیے میں پروگرام سے پہلے ہی اُٹھ گیا ہوں۔ ہمیں ذرا جلدی ہے۔ تم بیگم صاحبہ کو ڈراپ کرتے ہی ہماری طرف چل پڑو۔ ہم کوئی سواری لے کر اُسی طرف نکلتے ہیں۔ تمھیں راستے میں روک لیں گے۔"

گوہر کو اتنا ہی یاد تھا کہ فوجی افسر کے کالروں پر سرخ پٹیاں لگی ہوئی تھیں اور کندھوں پر چاند ستاروں کا جھرمٹ سا تھا۔ وہ کرنل تھا یا بریگیڈیئر' گوہر یہ امتیاز نہیں کر سکا۔ ڈسٹری بیوٹر کی تاریں چاروں پلگوں پر اچھی طرح جما کر اس نے بونٹ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ کی جانب بڑھا تو فوجی افسر نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھائی! ہمیں ایچ ٹی سی جانا ہے۔"

گوہر معذرت خواہانہ لہجے میں بولا: "سوری سر! میں نے بیٹی کو کالج سے لینا ہے۔"

فوجی افسر نے جواب میں اتنا ہی کہا: "او کے"۔

ڈرائیو کرتے ہوئے گوہر کو اس امر پر فخر کا احساس ہوا کہ وہ ایک آزاد شہری ہے اور اس کے بھی حقوق ہیں۔ بے شک وہ اس وقت ایک پبلک سروس ویکل چلا رہا ہے اور کسی بھی شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اس گاڑی سے استفادہ کرے۔ لیکن فی الوقت یہ مالک کے ذاتی استعمال میں ہے۔ تاہم اسے یہ خیال آیا کہ اس کے پاس ایک ایسی تختی ہونی چاہیے جس پر "Under Private Use" کے الفاظ لکھے ہوئے ہوں' تاکہ ایسی صورت میں کوئی قضیہ کھڑا نہ ہو۔

ایسی ہی غیر اہم سوچوں میں مگن وہ گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا موڑ کاٹ کر سٹی تھانہ کے قریب پہنچا تو سامنے دو پولیس کانسٹیبل کھڑے دیکھے' جنھوں نے آگے بڑھ کر اسے رکنے کا اشارہ دیا اور ایک عین سڑک پر آ گیا۔ گوہر نے بریک لگانے میں شاید ہی کوئی لمحہ ضائع کیا ہو لیکن گاڑی کی رفتار قدرے زیادہ تھی' لہٰذا کانسٹیبل کو بچانے کے لیے سڑک سے نیچے اتارنا پڑی۔ جہاں کھڑا دوسرا پولیس مین تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ گاڑی

رکتے ہی دونوں پولیس والے آگے بڑھے اور ان میں سے ایک فرنٹ اور دوسرا پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ گوہر نے خوش اخلاق سے کہا کہ گاڑی اس وقت ذاتی استعمال میں ہے۔ کیونکہ وہ بیٹی کو کالج سے لینے جا رہا ہے۔ براہ مہربانی کوئی دوسری گاڑی لے لی جائے۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے کانسٹیبل نے جواب دیا کہ SHO صاحب کے بچوں کو اسکول سے گھر پہنچانا ہے۔ ان اوقات میں کسی خالی گاڑی کے ملنے کا امکان کم ہے۔ لہٰذا اسے ہی جانا پڑے گا۔ گوہر نے معذرت کرتے ہوئے دوبارہ کہا۔

''گو یہ ٹیکسی کار ہے لیکن فی الوقت ذاتی استعمال میں ہے۔''

فرنٹ سیٹ پر بیٹھے کانسٹیبل نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''چلائی ٹیکسی اور نخرے افسروں والے۔ سواری اٹھانے سے انکار ویسے بھی جرم ہے اور ہم نے تمہارے ساتھ کوئی پکنک منانے نہیں جانا۔ تمہیں بتایا ہے کہ SHO صاحب کے بچے سکول سے لینے ہیں۔ سکول نہیں تو تھانے لے چلو۔ ویسے بھی رکنے کی بجائے تم ہمیں کچل کر جان سے مارنے لگے تھے''۔

بات تُو تُو میں میں سے بڑھ گئی اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچنے کو آئی تو گوہر نے یہی مناسب سمجھا کہ ان سے جھگڑنے کی بجائے خود چل کر SHO سے بات کرے۔

گاڑی تھانے کے وسیع احاطے میں ایک طرف پارک کی اور وہ بڑے اعتماد سے چلتا ہوا ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ وہ جلدی میں تھا کیونکہ کالج میں چھٹی ہو چکی تھی۔ اس کی بیٹی وہاں منتظر تھی۔ اُس نے سوچا کہ ذمہ دار پولیس افسر یقیناً معقولیت کا مظاہرہ کرے گا۔ وہ خود ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ معزز شہری ہے۔ اس کے بھی حقوق ہیں اور پھر استاد ہونے کے ناتے قابل احترام ہے۔ کانسٹیبلان کے ساتھ منہ ماری ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے وہ سرخ فیتوں والے فوجی افسر سے برابری کی سطح پر مکالمہ کر چکا تھا اور یہاں پولیس سٹیشن میں بڑے سے بڑا افسر ایک انسپکٹر ہی ہو سکتا ہے جو بلحاظ سرکاری عہدہ بھی

اس سے برتر نہیں۔ نہ جانے اس کے ذہن میں یہ خیال کس برتے پر جاگزیں ہو گیا کہ SHO اسے کرسی پیش کرے گا اور بات سننے کے بعد دونوں کانسٹیبلان کو سرزنش کر کے اس سے معذرت کر لے گا۔

ڈیوڑھی سے آگے کھلا صحن تھا اور پار برآمدے میں ایک کمرے کے باہر SHO کی تختی لگی ہوئی تھی۔ اسی طرح ایک طرف ایڈیشنل ایس ایچ او اور دوسری جانب محرر کے کمرے کی نشان دہی کی گئی تھی۔ گوہر تیز قدموں سے صحن پار کرتا ہوا مزید آگے بڑھنے لگا تو ایک سنتری نے اسے روک کر برآمدے کے انتہائی بائیں گوشے میں کھڑا رہنے کو کہا۔ اس اثنا میں دونوں سپاہی SHO کے کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ چند لمحوں بعد ان میں سے ایک نے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا اور گوہر کو اندر آنے کا اشارہ دیا۔ اس کے آگے بڑھنے سے پیشتر ہی ایک حوالدار SHO کے کمرے میں داخل ہوا' جس کے بازوؤں پر تین تین سرخ فیتے لگے ہوئے تھے۔ گوہر نے پردہ ہٹا کر اندر جھانکا اور بڑے سلجھے ہوئے انداز میں ''السلام علیکم'' کا متبرک کلمہ ادا کیا۔ یعنی سلامتی ہو تم پر۔ گویا اللہ کی رحمت۔ لیکن سامنے کرسی پر بیٹھی شخصیت کو غالباً ایسی کوئی نعمت درکار نہیں تھی۔ اُس نے وعلیکم السلام کہنے کی بجائے ایک ایسے جنگلی جانور کی نظروں سے اسے دیکھا جس کی تھوتھنی لبوتری اور دانت باہر کو نکلے ہوتے ہیں اور اس کا بال بھی جہاں گر جائے وہاں طوطا چشمی کی فصل اُگنے لگتی ہے۔ کمرے کی فضا بدلحاظی اور بے مروتی سے بری طرح بوجھل ہو گئی۔ وہ گرج کر بولا:

''اوئے تیری...... تم ملازموں کو کچلنے لگے تھے؟ ...... کون ہو تم؟''

پھر وہ دونوں سپاہیوں سے مخاطب ہوا: ''پرچہ درج کراؤ اس کے خلاف۔''

دوبارہ گوہر پر آنکھوں سے چنگاریاں برساتے ہوئے دھاڑا: ''کہاں ہے تمہارا لائسنس اور رجسٹریشن' شناختی کارڈ وغیرہ بھی نکالو۔''

گوہر نے اپنے حواس مجتمع کیے اور زخم خوردہ لہجے میں بولا: "میں گورنمنٹ ماڈل سکول میں سینئر ٹیچر ہوں۔ سلیکشن گریڈ۔ دوپہر کے وقت ڈرائیور دو تین گھنٹے کی چھٹی کرتا ہے۔ میں نے بیٹی کو کالج سے لے کر گھر جانا ہوتا ہے۔ لائسنس ابھی نہیں بنا۔"

SHO نے ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ نزدیک آ کر بولا: "تمہارا گریڈ ابھی...... کے راستے نکل جائے گا...... سینئر ٹیچر ہو کر غیر قانونی کام کرتے ہو۔ تمہارے باپ کنجر کا راج ہے۔ ڈرائیور سے خطرہ ہے کہ اغوا کر کے لے جائے گا؟ خود بغیر لائسنس سڑکوں پر دندناتے پھرتے ہو۔ لوگوں کو کچلنے کے لیے۔ چلو کان پکڑ لو جس طرح سکول میں لڑکوں کو مرغا بنایا جاتا ہے۔ جلدی کرو...... گوی......"

گوہر بت بنا کھڑا رہا۔ وہ اتنا ہی بول سکا کہ اس کے اسکول میں طلبا کو کان پکڑانا تو کجا' چپت بھی نہیں لگائی جاتی۔"

اس کے بعد اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اوسان خطا ہونے لگے ہیں۔ ایک چکر سا آیا۔ پیشتر اس کے کہ وہ زمین بوس ہو جاتا قریبی دیوار کا سہارا لیا۔ پاس ہی ایک چھوٹی سی میز پڑی تھی' جس پر جگ گلاس اور ایک تھرموس رکھا ہوا تھا۔ اُس کا جسم ذلت کے شدید احساس سے لرزنے لگا اور آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا منظر دھندلا گیا۔ نہ جانے پاؤں کس لمحے تپائی میں الجھ گیا اور اس کے الٹنے سے برتن نیچے گر گئے۔ فرش پر دری بچھی ہوئی تھی تاہم اُسے کچھ کچھ بجھائی دیا کہ ایک آدھ گلاس ٹوٹ گیا ہے' یا شاید تھرموس کا فلاسک۔

پیشتر اس کے کہ گوہر کوئی فیصلہ کرتا اُس کی بصارت میں سرخ فیتے کوند گئے اور ایک زوردار چانٹا گال پر پڑنے سے حواس مختل ہونے لگے۔ تب اُس نے جانا کہ قریب کھڑے حوالدار کے بازوؤں پر ٹانکے ہوئے بہت بڑے بڑے سرخ فیتے خون آشام بلا کی مانند جھپٹے ہیں۔ ملی جلی آوازوں میں غلیظ سے غلیظ ترین مفہوم کی حامل

گالیوں کی بوچھاڑ اُس کی سماعت کو بری طرح گدلانے لگی۔ جیسے شفاف پاکیزہ پانی میں گٹر لائن کھل گئی ہو۔ اسی دوران اُسے دو چار مزید تھپڑ اور گھونسے پڑ چکے تھے۔ وہ نیچے بیٹھ گیا لیکن جلد ہی کسی نے بازو سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔ اُس کا جسم بے جان لوتھ کی طرح ہو رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے دو مختلف اطراف سے ٹھنڈے پڑے اور دونوں بغلوں میں سہارا دے کر اُٹھا لیا گیا۔ گالیوں کی گردان جاری تھی۔ تقریباً گھسیٹتے ہوئے لا کر کسی کمرے میں بند کر دیا اور باہر سے کنڈی لگا دی گئی۔

انتہائی چھوٹے سے کمرے میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ منظر واضح ہونے لگا۔ ایک کونے میں کرسی رکھی تھی جس کے آگے چھوٹی میز پڑی ہوئی تھی۔ وہ نیچے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے مرحلے پر اُسے وہم ہونے لگا کہ وہ ایک پرجوش محب وطن استاد ہونے کی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر حب الوطنی پر لیکچر دیا کرتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کسی دشمن ملک کی خفیہ ایجنسی کے ہتھے چڑھ گیا ہو اور اس کے کارندے اسے ذہنی اور جسمانی اذیتیں دے دے کر مار دینا چاہتے ہیں۔ وہ تادیر اس خوش فہمی کا شکار نہیں رہا۔ اُسے اس شہر کے اہم مقامات کے بارے میں کوئی مغالطہ نہیں تھا اور یہ باور کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اس وقت اپنے ہی وطن کے ایک پولیس سٹیشن میں جسمانی طور پر موجود ہے۔ تب وہ اپنی روزمرہ زندگی کے معمولات پر غور کرنے لگا۔ اُس نے بہت سوچا کہ کہاں بھول ہوئی اور کون سے قبیح گناہ کا ارتکاب کیا' جس کی اتنی کڑی سزا دنیا میں ہی بھگتنا پڑی۔ لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا۔ کیونکہ وہ ایک معتدل مزاج نفیس انسان تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور صاحبِ مطالعہ۔ خوبصورت باتیں کرنے والا۔ جو اعلیٰ اخلاقی اقدار کی پاس داری کا صحیح ادراک رکھتا تھا اور احترامِ آدمیت کے تقاضوں کو بہت اہمیت دیا کرتا۔ بطور استاد زیادہ مقبول اور پسندیدہ شخصیت ہونے کی بھی یہی وجہ تھی کہ وہ بگڑے ہوئے طلبا میں سے بھی کسی کی عزتِ نفس کو مجروح نہیں کرتا تھا۔ وہ ایک

ایسا معاشرہ تعمیر کرنے کا خواہاں تھا جس میں محبت' اخوت' ایثار اور عدل ہو۔
درپیش ہولناک صورت حال میں بھی اس کی فطری رجائیت یکسر مفقود نہیں ہوئی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ جو اذیتیں اس پر وارد ہوئیں وہ زہریلے نوکیلے کانٹوں کی مانند اس کی روح میں پیوست ہو گئیں۔ لیکن پھر بھی ایک خوش نما خیال ابریشمی تار کی صورت اس کی سوچوں کے کویا سے اتر کر نرم و ملائم ردا بننے لگتا' جس میں اس کی زخمی روح کو پناہ کا احساس ہونے لگا۔ خود کو قائل کرنے میں کوشاں رہا کہ پولیس سٹیشن والوں کو یقیناً کوئی سنگین غلط فہمی ہوئی ہے۔ کسی انتہائی خطرناک ملک دشمن مجرم کے دھوکے میں دھر لیا گیا ہے' ورنہ وہ بلاوجہ اس کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کیوں کرتے۔ شاید کسی مکروہ کردار قومی دشمن سے اس کی مشابہت ہو۔ ابھی حقیقت ان پر واضح ہو گی تو وہ اسے کال کوٹھری سے نکالیں گے اور معذرت کر کے بڑے احترام سے رخصت کریں گے۔
اچانک دروازہ کھلا تو روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ دہشت کی علامت SHO دروازے میں کھڑا تھا۔ اُمید کی کرن جو گوہر کے ذہن میں پھوٹی' وہ SHO کے منہ سے برآمد ہونے والے قلقلے میں دب گئی: ''اوئے! یہاں کیوں ڈال رکھا ہے اس کتی کے بچے کو؟ اس کی ماں...... اٹھاؤ اسے اور Cell میں پھینکو۔''
پھر وہ براہ راست اس سے مخاطب ہوا۔
''کیوں اوئے! سرکاری ملازم ہوتے ہوئے پارٹ ٹائم کرتے ہو؟ اور وہ بھی بغیر لائسنس کے۔ تم استاد ہو؟ کنجر کی نسل! نئی پود کو کیا سکھاؤ گے؟ خود غیر قانونی کام کرتے ہو۔ تمہاری...... ٹیکسی چلانے کا شوق ہے تو میں تمہیں طریقہ بتاتا ہوں۔ دنوں میں امیر ہو جاؤ گے اور لائسنس کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم کار کی بجائے......''
گوہر کا جسم لرز کر رہ گیا اور وہ اُٹھتے اُٹھتے دھڑام سے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔
SHO نے آگے بڑھ کر گدی سے پکڑ لیا اور جھنجھوڑ کر بولا: ''نخرے دیکھو مادر...... بھڑوا

ماسٹر نہیں ایکٹر ہے۔"

گوہر جب تھانے میں داخل ہوا تھا تو اس کے تن پر سفید اور اُجلی شلوار قمیض خوب بچ رہی تھی۔ اب اس پر جا بجا داغ دھبے پڑ چکے تھے۔ بغل سے قمیض ادھڑ گئی اور گریبان سے دو بٹن بھی غائب ہو چکے تھے۔ چہرے پر ایک آدھ ہی نیل تھا لیکن روح زخموں سے چور چور ہوئی پڑی تھی۔ وہ مر جانا چاہتا تھا۔ سوچنے لگا کہ اس کی موت کے بعد بوڑھی ماں اور بیوی بچوں کا کیا بنے گا۔ اس نے اپنے دل کو اطمینان دلایا:

"مجھے ایسی زندگی نہیں جینا۔ میں اگر زندہ رہوں تو اپنے پیاروں کی کفالت کا ذمہ دار ہوں۔ جو مر جاتے ہیں ان کے پس ماندگان کسی نہ کسی طرح جی لیتے ہیں۔ جس نے انہیں پیدا کیا ہے وہی رازق ہے ان کا۔ میں محض وسیلہ تھا۔ وہ بھی اس وقت تک جب زندہ تھا۔ میں آج روحانی طور پر مر چکا ہوں۔ صرف جسمانی موت کا مرحلہ طے کرنا باقی ہے۔"

ڈیوڑھی میں دونوں حوالاتیں آمنے سامنے تھیں۔ گوہر دائیں والی Cell کے جس کونے میں بیٹھا تھا وہاں سے احاطے کی دیوار کے مسمار شدہ حصے کے پار شہر کی مصروف سڑک کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ڈیوڑھی میں ڈیوٹی پر مامور سنتری اگر سنگ دلی کا مظاہرہ نہ کرے تو آمنے سامنے والی حوالاتوں میں محبوس لوگ حال احوال پوچھ سکتے تھے۔ لیکن بائیں والی Cell غالباً خالی تھی جب کہ گوہر کے ساتھ چار لوگ اور بھی تھے۔ دو نوجوان' ایک ادھیڑ عمر خستہ حال نشئی سا شخص اور چوتھا مفلوک الحال بوڑھا زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ جب اُسے کھانسی کا دورہ پڑتا تو وہ دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر کہنیوں کے بل بکری کا سا انداز اختیار کر لیتا اور چھاتی کا پورا زور لگا کر کھانسی کچھ اس طرح کھانستا کہ گوہر کو بڑی اذیت محسوس ہوتی۔ کھانسی کا دورہ ختم ہونے پر وہ اسی جانور کی نقالی کرتے ہوئے پیٹ کے بل زمین پر لیٹ جاتا' جس کی کھانسی چرا کر جان کا روگ بنا

لیا تھا۔ ادھ موا تو وہ نارمل حالت میں ہی تھا لیکن کھانسنے کے بعد یوں گمان گزرتا جیسے آخری سانسیں لے رہا ہو۔

حوالات کا پوری طرح جائزہ لے چکا تو گوہر مایوس ہو گیا۔ وہاں موت کا کوئی سامان نہیں ہو سکتا تھا۔ کاش اسے کسی طرح باہر نکالا جائے تو کوئی تدبیر کرے۔ اسی لمحے ایک نوجوان حوالاتی نے سنتری کو انگلیوں سے اشارہ کیا تو اس نے جواباً ایک غلیظ سی گالی کچھ اس رغبت سے اُگل ڈالی کہ شرمناک حیوانی فعل کی جزئیات بیان کرتے ہوئے ایک ایک عضو کا حوالہ دیا اور پھر بولا: "تجھے ہر گھنٹے کے بعد لیٹرین جانے میں سواد آتا ہے۔ وہاں تیری بے بے بیٹھی ہوئی ہے؟"

کسی کا نام لے کر بلایا اور کہا: "جا اوئے! اسے اس کی پھوپھی کے گھر لے جا۔"

حوالاتی باہر نکل کر صحن کی طرف مڑنے لگا تو سنتری انتہائی تضحیک آمیز انداز میں بولا:

"تسلی کر کے آنا اوئے! ورنہ ایسا پکا بندوبست کروں گا کہ دوبارہ جانے کی حاجت ہی نہ ہو۔ ڈاٹ لگانے کا ماہر ہوں۔ بائیس سال کی سروس ہے میری۔"

گوہر کو اچانک خیال آیا کہ اسے بھی لیٹرین جانے کا بہانہ کرنا چاہیے۔ کیا خبر وہاں بلندی سے کودنے کا موقع مل جائے یا لٹکنے کے لیے کوئی کنڈا وغیرہ لگا ہوا ہو۔ اُس نے شلوار میں ڈلے نئے اور موٹے ازار بند کو انگلیوں سے ٹٹول کر اطمینان کر لیا تو حوصلہ کر کے سنتری سے لیٹرین جانے کی اجازت طلب کی۔ وہ بڑی بے زاری سے بولا:

"اوئے! تم لوگ اپنی نانی کے ویاہ پر آئے ہوئے ہو جو کھا کھا کر معدہ اُلٹ گیا ہے۔"

تاہم اُس نے ایک اور نام لے کر بڑی زوردار آواز میں پکارا تو سادہ لباس میں ایک شخص قریب آیا اور اسے ساتھ لے کر چل دیا۔ اس سادہ والے کے چہرے پر وہ

مخصوص خباثت نہیں تھی جو یہاں بیشتر چہروں پر گوہر نے دیکھی تھی۔ یا پھر یہ اس کا کوئی خاص روپ تھا۔ قریب آ کر بولا:

"ماسٹر صاحب! چنگے بھلے پڑھے لکھے شریف آدمی ہو۔ ذرا سمجھ داری سے کام لیا ہوتا تو گاڑی میں اتنا ہی پٹرول جلتا تھا جتنا ایک ٹیکے والی شیشی میں سما جاتا ہے۔ خود سوچیں' اس وقت آپ بیوی بچوں سے گپ شپ لڑا رہے ہوتے۔ سچی بات ہے کہ اب آپ بری طرح پھنس گئے ہو۔ یہ بڑا جابر تھانے دار ہے۔ کتنے ہی بندے ہضم کر چکا ہے۔ جلاد ہے جلاد۔ اسی طرح پہلے بھی جن تھانوں میں یہ رہا ہے وہاں کچھ شریف لوگوں نے بدقسمتی سے پنگا لے لیا تو اس ظالم نے گھر اُجاڑ کر رکھ دیئے۔ بعض بدقسمت گھرانوں کی عورتوں کو بھی نہیں بخشا۔"

گوہر نے سادہ والے کی گفتگو کا آخری حصہ سنا تو ٹانگوں میں سے جان ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ لڑکھڑا کر قریب ہی لیٹرین کے باہر بنے تھڑے پر بیٹھ گیا۔

پہلے سے باہر پہرے پر کھڑے کانسٹیبل نے اونچی آواز میں کہا:

"نکل اوئے باہر ممبر کی اولاد! یہ تیری ماسی کا گھر نہیں۔ ایک اور اُمیدوار باہر آ گیا ہے۔ سنا ہے بہت بڑے گریڈ کا ماسٹر ہے۔"

اُس نے تضحیک آمیز نگاہیں گوہر پر ڈالیں اور قدرے توقف سے دوبارہ بولنے لگا: "او ماما! اب آ بھی جاؤ۔ بڑے گریڈ والے کو موقع دو۔ دوبارہ چلے جانا اور جہاں سے چھوڑ کر آؤ وہاں سے شروع کر لینا۔ اتنا خیال رہے کہ بے ایمانی نہ ہو۔"

گوہر سوچ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ یہ لوگ کس طرح کی گفتگو کرتے ہیں۔ کہاں کی مخلوق ہیں۔ وہ خود یونیورسٹی تک پڑھا تھا۔ رنگ رنگ کی دنیا دیکھ رکھی تھی۔ بڑے بڑے اچھے اور بداخلاق لوگوں سے ملتا رہا۔ کئی طرح کی محفلوں میں شرکت کی۔ اچھی اچھی باتوں کے علاوہ بعض اوقات فحش کلامی بھی سنی۔ لیکن یہ جو دنیا آج اس نے

دیکھی' اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑی نرالی تھی۔ واہیات اور بے ہُودہ۔ جن کا ایک ایک لفظ ذو معنی' رکیک اور گھٹیا...... یا اللہ! یہ لوگ کن ماؤں کے بطن سے پیدا ہوئے۔ کیسے گھروں میں پلے بڑھے۔ کیا وہ اسی دھرتی کے باپ ہیں' جن کی سرپرستی میں انہوں نے پرورش پائی؟ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ گمان غالب آ گیا کہ وہ یقیناً کسی نا قابل معافی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا ہے' جس کی پاداش میں دوزخ کے ایسے حصے میں ڈال دیا گیا ہے' جہاں ابلیس بذاتِ خود اپنے ٹولے کی تمام خبیث ارواح کے ہم راہ موجود ہے۔

حوالاتی لیٹرین سے باہر آیا تو گوہر کو جانے کا اشارہ ملا۔ اندر جا کر اسے بہت مایوسی ہوئی۔ صرف ایک پلاسٹک کا چھوٹا سا ٹوٹا ہوا لوٹا پڑا تھا۔ ٹونٹی بہت ہی چھوٹی تھی اور فرش سے تقریباً آٹھ نو انچ کی اونچائی پر نصب کی گئی تھی۔ چھت ندارد۔ گویا کہیں بھی کوئی ایسی چیز دکھائی نہیں دی کہ جس کے ذریعے وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتا۔ کاش لوٹا کسی دھات یا مٹی سے ہی بنا ہوتا تو وہ اس سے اپنے سر پر زوردار ضرب لگا کر کام تمام کر لیتا۔ مایوس ہو کر وہ فوراً باہر نکل آیا۔ ایک ترکیب سوجھی کہ وہ ڈیوڑھی کے پار سڑک کی جانب بھاگ کھڑا ہو۔ اُمید واثق ہے کہ مسلح سنتری اسے گولی مار دے اور خلاصی ہو جائے۔ لیکن یہ سوچ کر اس کی روح لرز گئی کہ اگر اسے زندہ پکڑ لیا گیا تو جان سے مارنے کی بجائے گالیوں' تھپڑوں اور گھونسوں سے تذلیل کی جائے گی جو برداشت نہیں ہو سکے گی۔ وہ اپنے آپ کو اس آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ عبادت گزار ماں کا چہرہ سامنے آ گیا جو ہر دم دعائیں مانگتی رہتی ہے۔ دامن پھیلا کر: ''اللہ جی میرے بچے کی خیر ہو۔ عزتیں محفوظ رکھ میرے مولا۔ سارے جگ کی خیر ہو۔''

ایک تلخی سی اس کی روح میں سرایت کرنے لگی:

''اماں تیری دعائیں بے اثر کیوں ہوئیں۔ سارے جگ کی خیر مانگتی رہی۔ اسی لیے تحلیل ہو گئیں؟''

اُس نے جھر جھری لی اور توبہ استغفار پڑھنے لگا۔ اندر سے آواز آئی:

"اللہ کے خزانے میں کیا کمی ہے جو تیری ماں طلب کرتی رہی اور وہ عطا کرنے سے عاجز ہے؟...... یہ ناممکن ہے۔ کوئی آزمائش؟ نہیں...... میں اس کا بار اٹھانے کے لائق نہیں......اللہ! میں ٹوٹ گیا ہوں۔ مجھے سنبھال لے۔"

پھر وفا شعار بیوی کا پرکشش چہرہ سامنے آ گیا۔ تسلیم و رضا کی جیتی جاگتی تصویر۔ ایسی خوش قسمت بہو جس پر ساس کو بھی ناز ہے۔ پیارے سے دو بیٹے اور خوبصورت انتہائی ذہین بیٹی جو کالج کی لائق ترین طالبہ ہے اور باپ سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔

"نہیں"...... وہ بیٹھے بیٹھے بڑبڑایا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا...... سادہ لباس والا جو کچھ کہہ رہا تھا کہ SHO بڑا جابر ہے۔ خواتین کو بھی نہیں بخشتا۔ نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ اگر یوں کچھ بھی ہوا تو میں ہی اس کا ذمہ دار ہوں گا۔ پیشتر اس کے عملاً اس طرح ہو مجھے مرنا ہوگا۔ مجھے اس ظالم تھانے دار کو یہیں روکنا ہے۔ اپنی جان کی قربانی دے کر اپنے پیاروں کی حرمت کو بچانا ہے۔ وہ ایک بار اس عذاب سے نکل جائیں تو رفتہ رفتہ میری موت کا صدمہ بھول جائیں گے۔ مفلسی میں بھی زندگی کے دن کٹ جاتے ہیں۔ آبائی گھر چلے جائیں گے۔ اماں محلے کے بچوں کو قرآن پاک پڑھایا کریں گی۔ بیوی اور بیٹی اسکول میں نوکری کر لیں گی۔ گھر میں ٹیوشن سینٹر بنا لیں گی۔ زندگی کسی نہ کسی طرح کٹ جائے گی۔ بس اس خوفناک عفریت کے چنگل سے کسی طور نکلنا ہوگا۔ وہ مرنے پر پوری طرح آمادہ ہو چکا تھا۔ لیکن جس قوت سے دیوار کے ساتھ سر پھوڑنا چاہتا تھا وہ عود کر نہیں آ رہی تھی۔

پتا ہی نہیں چلا کہ سادہ لباس والا اُسے تھام کر کب کمرے میں لے آیا اور ایک چارپائی پر بٹھا دیا۔ اُس نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ لمبے سے بیرک نما کمرے میں

آٹھ دس چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں' جن کے نیچے ٹرنک پڑے تھے۔ ہر چارپائی کے قریب دیوار پر کھونٹیوں سے پولیس یونیفارمز اور دیگر کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ چند چارپائیوں پر لوگ بے خبر سوئے پڑے تھے اور خالی والی کے بستر لپیٹ کر رکھے ہوئے تھے۔ سادہ والے نے ایک گھڑے میں سے گلاس پانی کا بھرا اور لا کر گوہر کو تھما دیا۔ اُس نے پانی پی کر گلاس واپس کر دیا۔ سادہ والے نے سگریٹ کا پیکٹ اُس کے طرف بڑھایا لیکن اس نے انکار میں سر ہلایا اور گردن نیچے ڈال دی۔ اگلے ہی لمحے دیا سلائی کے جلنے اور سگریٹ کا دھواں پھیلنے کے ساتھ گوہر کو سادہ والے کی آواز سنائی دی:

''ماسٹر جی! آپ شریف آدمی ہیں۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اس لیے مدد کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی ترکیب سوچو اور اس درندے سے نجات حاصل کرو۔ انسان اسی لیے کماتا ہے کہ مشکل وقت میں کام آئے۔ ورنہ ایسی دولت پر لعنت جو عزت بے عزتی کے معاملے میں خرچ نہ کی جائے۔ ابھی کچا پرچہ کاٹا گیا ہے۔ لیکن بڑی خطرناک دفعات لگی ہیں۔ سزا تو ہو گی' ساتھ سرکاری نوکری بھی چھوٹ جائے گی۔ اگر جلد کوئی تدبیر نہ کی گئی تو یہ پکا پرچہ کاٹ دیں گے۔ پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔ ایک بات بتا دوں کہ یہ تھانے دار بڑا شاطر ہے۔ ۳۰۷ کا کیس مضبوط کرنے کے لیے گاڑی میں سے اسلحہ یا منشیات کی برآمدگی ضرور ڈالے گا تاکہ ملازموں کو کچل کر بھاگنے کا جواز مہیا ہو سکے اور عدالت سے سزا دلوانے میں دشواری نہ ہو۔''

گوہر نے مردہ سی آواز میں دریافت کیا کہ کتنی رقم سے کام چلے گا تو اُس نے اُلٹا سوال کر دیا: ''آپ بتائیں زیادہ سے زیادہ کتنی کا بندوبست کر سکیں گے؟''

قدرے توقف سے بولا: ''ایک بات آپ دماغ میں بٹھا لیں کہ یہ درندہ بوٹیوں پر منہ نہیں مارتا' سوچا نکلتا ہے۔ گائے بکرا یا ہرن نہ سہی' بھلے خرگوش ہی ہو۔''

گوہر تذبذب کا شکار ہو گیا۔ بے بسی کا عالم تھا۔ ملتجی نگاہوں سے سادہ کو دیکھا

اور کہنے لگا۔

''گھر میں چند سو سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ زیور بیچ کر گاڑی کی ڈاؤن پے منٹ کر دی تھی۔ بس ایک دو مخلص دوست ہیں جن سے سوال کیا جا سکتا ہے۔''

شکار کے دام میں آنے کی اُمید لگی تو سادہ والے نے کچھ فاصلے پر سوئے پڑے شخص کو کرخت آواز میں پکار کر جگا دیا۔ وہ اُٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملتا ہوا قریب آ کر سوالیہ نشان بن گیا۔ سادہ والے نے اسے پیار بھرے لہجے میں کچھ ایسے کلمات کہے کہ جن کی رو سے وہ باہم سالے بہنوئی کے رشتے میں بندھ گئے اور پھر حکم دیا کہ جلدی سے دو کپ چائے لائے۔ وہ تعمیل کے لیے مڑا تو اسے مزید کہا کہ ایک سموسا اور کریم رول بھی صاحب کے لیے لے آئے۔ گوہر نے بے دلی سے انکار کیا تو وہ بولا:

''ماسٹر جی! کھا لو کچھ۔ صبح کا ناشتا ہی کیا ہوگا۔ یہ SHO کی بلا ٹل جائے تو میں آپ کو کھانا بھی کھلا دوں گا۔ آج ایک بہت بڑی پسوڑی پڑی ہوئی ہے ورنہ کب کا جا چکا ہوتا۔ اب یہ شام کو آئے گا۔ اس سے پہلے پہلے آپ کو جان چھڑانے کا کوئی راستہ نکالنا ہے۔ کیونکہ رات کے لیے بغیر پکا پرچہ کاٹے یہ رکھ نہیں سکتے۔''

پیشتر اس کے کہ گوہر کوئی جواب دیتا وہ پھر بولنے لگا:

''ویسے ایک بات بتا دوں۔ جتنا یہ شخص ظالم ہے اتنا ہی اچھا بھی ہے۔ یاروں کا یار ہے۔ ایک مرتبہ آپ کڑوا گھونٹ بھر لیں' پھر سمجھ لیں کہ اس پولیس اسٹیشن سے آپ کی پکی پکی دوستی ہو گئی۔ جیسے چاہے گاڑی چلائیں۔ لائسنس ہو یا نہ ہو۔ گاڑی میں جو مرضی ہے لائیں لے جائیں۔ بس پھر کبھی کبھار اپنی خوشی سے کچھ حصہ ڈال دیا اور مزے سے نوٹ چھاپتے جائیں۔''

اُس نے قدرے توقف کیا اور پھر بات آگے بڑھائی:

''میرا اس میں کوئی مفاد نہیں۔ آپ شریف انسان ہیں۔ ایسے ہی ہمدردی ہو

گئی ہے۔ میں تو اس تھانے دار سے بات بھی کرنا گوارا نہیں کرتا۔ آپ کا معاملہ اس کے ایک خاص آدمی کے ذریعے طے کراتا ہے۔ وہی حوالدار ہے ناں؟ جس نے آپ سے بدتمیزی کی تھی۔ اس سے تھوڑی گپ شپ ہے۔"

چائے آ گئی تو گوہر بے دلی سے پینے لگا۔ سموسے کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھا لیکن اٹک کر رہ گیا۔ تاہم چائے ایک ایک گھونٹ گلے سے نیچے اتارتا رہا۔ سادہ نے کریم رول کھایا اور پھر سموسا بھی ہڑپ کر گیا۔ چائے کا کپ صرف تین گھونٹ میں خالی کر کے بولا: "بس اب آپ جلدی جلدی فیصلہ کر لیں۔ یہ نہ ہو کہ سوچتے سوچتے شام پڑ جائے اور پھر کوئی بھی کچھ نہ کر سکے۔"

گوہر نے بہت سوچ بچار کے بعد مردہ سی آواز میں کہا کہ وہ تقریباً دو ہزار روپے کا بندوبست کر سکتا ہے۔ سادہ جھٹ بول اُٹھا:

"بھیاڑ کے منہ میں چھپکلی دو گے تو وہ ہاتھ ہی نگل لے گا۔ سیانے بیانے بندے ہو۔ کوئی عقل کی بات کرو۔ اتنی رقم میں افسروں کی نسوار بھی نہیں بنتی۔ تمہارا ابھی وہی حال ہے کہ چمڑی جائے دمڑی نہ جائے۔ اچھے پڑھے لکھے ہو؟ جانتے بھی ہو کہ حکومت نے پولیس کو اختیار اور صرف وردیاں دے رکھی ہیں۔ پورا نظام چلانا ہوتا ہے...... تمہیں چائے پلا کر بھی حرام ہی کی ہے۔ یہاں ایک کپ چائے کی قیمت سینکڑوں میں پڑتی ہے اور جو تھانے کے برتن تم نے توڑے ہیں' تم تو اصل بل بھی ادا نہیں کر رہے۔ تمہاری نیت میں یقیناً کوئی فتور ہے۔ اب تمہارا خدا ہی حافظ ہے۔"

گوہر نے دیکھا کہ سادہ والے کا چہرہ یکسر بدل گیا ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تک جو بڑا ہمدرد اور اس کے لیے فکر مند نظر آ رہا تھا' اس پر اُسی بلا کا نقشہ اُبھرنے لگا ہے' جس کا محض ایک بال پڑ جائے تو آنکھ کا پانی ڈھلنے لگتا ہے اور مروت یکسر مفقود ہو جاتی ہے۔ گوہر نے عاجز آ کر کہا کہ اس کے پاس بس ایک گاڑی ہے جس کی آدھی قیمت ادا

ہو چکی ہے لیکن وہ بھی فوراً تو نہیں بک سکتی۔ سادہ نے بڑی بے زاری سے اسے دیکھا اور اُٹھ کر باہر نکل گیا لیکن پانچ دس منٹ کے بعد واپس آ کر پاس بیٹھ گیا۔ چند ہی لمحوں بعد بیرک کے دروازے میں SHO آن کھڑا ہوا۔ خونخوار نگاہوں سے گوہر کو دیکھتے ہوئے سادہ والے سے مخاطب ہوا: "اوئے! یہ تمہارا بہنوئی لگتا ہے۔ یہاں کیوں بٹھایا ہوا ہے؟ اُٹھا اس مادر......کو اور Cell میں پھینک۔"

حوالات میں گوہر پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔ ادھیڑ عمر نشئی بول اُٹھا: "مت رو باؤ یار! یہاں کوئی سننے والا نہیں۔ یہاں لوگوں کے دل اس بلڈنگ کے پتھروں سے زیادہ سخت ہیں۔ تمہارے رونے پر اور خوش ہوں گے۔ میرے والا طریقہ آزماؤ۔ مجھے جب یہ مارتے ہیں تو میں اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ مار لیں جتنا مرضی ہے۔ میرا کیا جاتا ہے۔ یہ جسم میرا ہے ہی نہیں۔ میں تو کب کا مر چکا ہوں۔ یہ بے بے کے یار لاش کو پیٹتے رہتے ہیں...... مارتے اس لیے ہیں کہ میں انہیں پیسے دوں۔ میں ایک ہی بات کہتا ہوں کہ چونی بھی نہیں دوں گا۔ میں گھر کا پتا ہی نہیں دیتا۔ یہ کہتے ہیں کہ میں جاسوس ہوں۔ میں کہتا ہوں' ہاں! جاسوس ہوں تمہاری رن کا۔ کرلو جو کرنا ہے۔"

گوہر کیا بتاتا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ اسے اپنی بے توقیری پر رونا آ رہا تھا اور ان خدشات پر جو اس کے پیاروں کو لاحق تھے۔ اس سے بھی کہیں بڑھ کر اس امر پر کہ اپنے وطن کے اہم ترین ادارے پر اس کا اعتماد چکنا چور ہو گیا تھا۔ ذہن میں عظیم ریاست کے پُراعتماد اور باوقار شہری ہونے کے ناتے مان محبت کا جو پُرشکوہ شیش محل اُس نے تعمیر کر رکھا تھا وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا۔ بے زمینی کا شدید احساس کچوکے لگانے لگا اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی متمدن دنیا کا باسی نہیں بلکہ خلا میں معلق ہے۔ وہ متضاد کیفیات کے دھندلکوں میں پرکاہ کی مانند بھٹکنے لگا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ سب

کچھ فی الحقیقت اُس پر بیت رہا ہے۔ سوچنے لگا کہ وہ کوئی بھیانک خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ درد کی رو میں بہتا ہوا تاریخ کے دریچوں سے پار ماضی میں اتر گیا۔

ایک ایسے دور میں جہاں ظالم و جابر حکمرانوں کی ایک جنبشِ اَبرو پر سر قلم کر دیئے جاتے تھے۔ بھوکے شیروں کے پنجروں میں ڈال دیا جاتا تھا۔ سانپ سے ڈسوا کر زندگی چھین لی جاتی تھی۔ چشم زدن میں نیزہ سینے کے پار ہو جاتا۔ جو بہت زیادہ اذیت پسند تھے وہ زندہ کھال اتارنے کا حکم صادر کرتے۔ چشمِ تصور سے ایسے سارے ظلم و ستم ہوتے دیکھے۔ لیکن کسی بھی بے رحم حاکم کو گالیاں بکتے ہوئے سنا نہ دیکھا۔ اُس نے ایک آہ بھری اور دل ہی دل میں فریاد کرنے لگا:

''اے اللہ! اگر یہ تیرا بندہ ایسا ہی گناہ گار تھا تو اپنی رحمت کی ایک نگاہ ڈال دی ہوتی اور اس متمدن عہد میں نہ بھیجا ہوتا۔ جہاں صاحبِ اختیار ماضی کے ظالم حکمرانوں کے برعکس جان سے مارتے نہیں لیکن انسانیت کی تذلیل کرتے ہیں۔ اور گالیوں سے روح کو ایک ایک لمحے میں کئی کئی بار قتل کرتے ہیں۔ یہاں ایک ریاست میں نہ جانے کتنے تھانے ہیں' جن میں مطلق العنان بادشاہ براجمان ہیں اور انہوں نے تیری خدائی میں نقب لگائی ہے۔ اپنی اپنی خدائی قائم کیے بیٹھے ہیں۔ ان کے کارندے ظلم و بربریت میں تاریک ادوار کے مردم آزار کرداروں کو مات دیتے ہیں''۔

وہ فوجی افسر کو کوسنے لگا' جس نے اسے جانے دیا تھا۔ کاش اُس نے روک لیا ہوتا۔ ڈانٹ کر گاڑی میں بیٹھ جاتا اور حکم دیتا: ''چلو' جلدی سٹارٹ کرو۔''

فوجی افسر کے مہمانوں کو دیکھ کر وہ جان گیا تھا کہ اُن کا تعلق کس ضلع سے ہے۔ ایک جھماکے سے اسے یہ خیال آیا کہ SHO کا تعلق بھی اسی علاقے سے ہے۔ وہی خاص لب و لہجہ اور قد کاٹھ۔ یہ لوگ دنیا کی کوئی سی زبان بھی بولیں' ان کا علاقائی رنگ اس میں ضرور جھلکتا ہے۔ گوہر وہاں کچھ عرصہ رہا تھا۔ وہ انتہائی پس ماندہ علاقہ تھا۔

SHO اور سرخ فیتوں والے فوجی افسر نے یقیناً ٹاٹ اسکول سے تعلیم حاصل کی ہوگی۔ کہاں کمی رہ گئی۔ پیشہ ورانہ تربیت ہی اس انداز سے دی گئی۔ پس پردہ ہاتھ کس بے رحم کا ہے جو بے کسوں کی عصمت و حرمت کی دھجیاں بکھیرتا ہے۔ ان کی انا کے لہو میں رنگا ہوا ہے۔ وہ ستم گر کون ہے' جس کے باطن کی پراگندگی اچھلتی ہے۔ خبیث ارواح کے پٹے کھل جاتے ہیں۔ بے نواؤں کی عزتوں کے لوتھڑے ایوانِ انسانیت میں ہر سو بکھر جاتے ہیں اور اس دل دوز منظر سے حظ اٹھایا جاتا ہے۔

سادہ والے نے تالا کھلوایا اور آہنی سلاخوں سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ غالباً اپنے اصل روپ میں تھا۔ دھڑ انسان کا ہی تھا لیکن کندھوں پر تھوتھنی اُگ آئی تھی۔ آنکھوں سے خباثت ٹپک رہی تھی۔ ہونٹ لپلپائے اور غلاظت اُگلنے لگے۔ نوجوان حوالاتی کو گالیاں بکتے ہوئے گردن سے دبوچ کر باہر لے گیا۔

صحن میں سے دھماں دھم کی آوازیں بلند ہوئیں اور حوالاتی کی آہ و بکا۔ گوہر رینگ کر حوالات کے بیرونی کونے میں آ گیا' جہاں سے صحن کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے ایک انسانیت سوز منظر دیکھا۔ حوالاتی پیٹ کے بل زمین پر لیٹا ہوا تھا اور تن پر کوئی ستر باقی نہیں رہنے دیا گیا تھا۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور ایک باوردی جوان نے اس کے دونوں پاؤں مضبوط گرفت میں لے رکھے تھے۔ سادہ والا ہاتھ میں بڑا سا چمڑے کا لتر لیے پورے جوش اور جذبے سے وہاں ضرب لگا رہا تھا جس کی حرمت پر SHO کے علاقے میں قتل بھی ہو جایا کرتے تھے۔ سادہ والا اپنے فن میں کلاسیفائیڈ سپیشلسٹ تھا۔ جب وہ پوری قوت سے ضرب لگاتا تو مضروب ایک جھٹکے سے اپنا سر اور اوپر والا دھڑ وہاں تک اٹھا لیتا جہاں تک اس کے اعصاب اور ہڈیاں کام کرتی تھیں۔ ہر ضرب کے جواب میں اس کے حلق سے ایک دل دوز چیخ برآمد ہوتی۔ گوہر اس منظر کی تاب نہ لا سکا۔ واپس اسی کونے میں آ بیٹھا جہاں سے مسمار شدہ چار دیواری

اور سڑک کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ سڑک کے پار عظیم الشان مدنی مسجد کا پرشکوہ مینار بڑی تمکنت سے آسمان کو چھو رہا تھا۔ گوہر کے لبوں سے فریاد نکلی:

"اے جلّ وعلیٰ! تُو دیکھ رہا ہے۔ تیرے بحرِ جلال کی ایک ہلکی سی لہر زمین پر جعلی خداؤں کو چشم زدن میں غرقاب کر سکتی ہے۔ کب اذن ہوگا؟ ان متکبر اور بزدل ظالموں کا گھمنڈ کب خاک میں ملے گا؟ مظلوم کی فریاد کن خلاؤں میں بھٹک کے رہ گئی ہے۔ کہیں ان صاحبانِ اختیار نے کوئی حصار تو قائم نہیں کر لیا' جن سے آہیں اور نالے ٹکرا کر واپس لوٹ آتے ہیں۔"

عصر کی اذان فضاؤں میں بلند ہوئی۔ صحن میں خاموشی چھا گئی۔ گوہر سرک کر پھر اسی کونے میں جا بیٹھا جہاں سے وہ اذیت ناک منظر دیکھ چکا تھا۔ مضروب زمین پر بے جان پڑا ہوا تھا۔ اس کی بے رس جلد رنگت میں گوری پیلی سی تھی۔ لیکن جہاں ضربات کی بھرمار ہوئی تھی وہ جگہ جامنی رنگ اختیار کر گئی تھی۔ سادہ اور باوردی جوانوں نے بڑی عجلت میں اس کی ٹانگوں پر شلوار چڑھائی۔ رانوں تک مرحلہ طے ہوا تو دونوں پاؤں سے پکڑ کر نچلا دھڑ خاصی بلندی تک اُٹھا لیا گیا اور متاثرہ حصے سے اوپر ستر پوشی کا اہتمام کر کے احترامِ آدمیت کے تقاضے پورے کیے گئے۔ وردی والا پانی کا گلاس لے آیا تو سادہ نے مضروب کو اُٹھا کر کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسے جھول گیا جیسے بیل سے توری لٹک رہی ہو۔ اسی لمحے مدنی مسجد سے بلند ہوتی مقدس صدا کے الفاظ سنائی دیے۔ "اللہ اکبر۔" گوہر کا جسم گویا پگھلنے لگا۔ جیسے سوا نیزے پہ آئے سورج کے سامنے موم رکھ دیا گیا ہو۔ اس پر رقت طاری ہو گئی۔ نشئی حوالاتی کی نقاہت بھری آواز سنائی دی:

"نہ رو باؤ یار! چپ کر جا۔ یہاں کوئی نہیں سنے گا۔ ان کی مار سے کچھ نہیں ہوتا۔ تمہارے رونے سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔"

باہر ڈیوڑھی کے گیٹ پر کچھ بوڑھی اور ادھیڑ عمر کی میلی اور خستہ حال خواتین

کھڑی تھیں۔ سنتری کے منہ سے کچھ ایسے جملے ادا ہوئے جن کے لغوی معنی تو غیر مناسب نہیں تھے لیکن لہجہ اور انداز ایسا تھا کہ مفہوم بدل گیا۔ گوہر کو ایسے لگا جیسے کوئی نجس جانور برتن میں منہ ڈالنے لگا ہو اور سنتری نے اسے دھتکار دیا ہو۔ سنتری سے سامنا کیے کھڑی بوسیدہ لباس والی عورت کے سر پر ملگجا دوپٹا پڑا تھا جو جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ جیسے وہ کاغذ جس پر اُس کا مقدر لکھا گیا تھا۔ سنتری کے حضور تار تار دامن پھیلا دیا۔ ہاتھ جوڑے۔ لجاجت سے بولتے ہوئے ہونٹوں کے گوشے کانوں سے جا ملے۔ چند لمحوں کے لیے ملاقات کی بھیک عطا ہوئی تو سنتری کے درجات میں ترقی کی دعائیں بلند ہونے لگیں۔ معتوب حوالاتی پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ زمین سخت تھی۔ شاید تشریف نہیں رکھ سکتا تھا۔ سانڈے کی طرح سر اٹھایا اور غصیلی آواز میں بولا:

''اماں! سو بار منع کیا ہے یہاں مت آیا کر۔ میں نہیں مرتا۔ مجھے اس طرح ذلیل نہ کرو۔''

ماں نے دونوں ہاتھوں پر جا بجا پھٹا ہوا دوپٹا ایک بار پھر پھیلا دیا اور بولی:

''جگ جگ جئے میڈا لعل۔ مولا سائیں رحم چا کریسی۔''

گوہر بڑبڑایا:

''تیرے دامن میں چھید ہی چھید ہیں۔ رحم ہوا تو کہاں سمیٹو گی؟''

اتنے میں سنتری نے گرج دار آواز میں حکم دیا:

''چل ہٹ مائی۔ افسر آنے والے ہیں۔''

بے سہارا لوگ بڑے فراخ دل ہوتے ہیں۔ دھتکارے جانے پر بھی بالا دستوں کو جھٹ دعائیں دینے لگتے ہیں۔

''اللہ بھلا کرے۔ شالا دور بلائیں۔ بھاگ لگیں۔ رُتبے اُچے تھیون۔''

غریب سمجھتے ہیں کہ سب رتبے اُن کی دعاؤں کے طفیل ہی اونچے ہوئے

ہیں۔ یا دعاؤں کے سوا اُن کے پاس دینے کو کچھ نہیں ہوتا اور سر پر آئی ہوئی کوئی بلا ٹلتی نہیں۔ شاید کوئی اسم اعظم انہیں یاد نہیں جو ان کی تقدیر بدل ڈالے اور اس زمین پر قائم متکبر معاشرے کا ہر زور آور مفلسوں کی دعاؤں سے عاجز آ چکا ہے۔ اسے نفرت ہے ان کی دعاؤں اور التجاؤں سے۔ لجاجت سے پوتے چہرے دیکھ کر اسے گھن آتی ہے۔ اسی لیے دربار سرکار کی ہر چوکھٹ پر انہیں دعاؤں کے عوض منہ پر جوتے پڑتے ہیں۔ غرور کے پیکر ایسے بھی خوش ذوق نہیں کہ ان کی شامہ کستوری سے مسرور ہو۔ یہ کستورے کا پیٹ پھاڑ کر لطف اُٹھاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مفلوک الحال کی بددعا ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تو دعا کیا سنوارے گی۔

گوہر کی آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں۔ منظر گدلا گدلا سا تھا۔ لیکن ٹوٹی ہوئی دیوار کے پار لبِ سڑک کھڑے ملک کامران کو وہ دیکھ سکتا تھا۔ جو کسی سے محوِ گفتگو تھا۔ بگڑا ہوا امیر زادہ جو چند سال پہلے تک اس کا شاگرد رہا تھا۔ بہت کم استاد تھے جن کی وہ پرواہ کیا کرتا تھا۔ تاہم گوہر سے وہ بہت متاثر تھا اور اس کی عزت کرتا۔ وہ بلا کا ذہین اور حاضر جواب تھا۔ گوہر اسے علم کی افادیت اور اہمیت پر لیکچر دیتے ہوئے کہتا کہ زندگی میں کچھ بھی ہو لیکن تعلیم زیادہ سے زیادہ حاصل کرو۔ خوب محنت کرو۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کہتا کہ پڑھ لکھ کر بھیک بھی مانگنے نکلو گے تو عورتیں ہاتھ کی بجائے پلیٹ میں آٹا بھر کر دیں گی۔ کامران کے چہرے پر شرارت جھلکنے لگتی۔ وہ جواب دیتا:

''لیکن سر! میں نے فقیر نہیں وزیر بننا ہے۔ آپ کیوں اپنے ایک ہونہار شاگرد کا مستقبل تاریک کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر میں زیادہ پڑھ گیا تو بری طرح پھنس جاؤں گا۔ میرے دادا خان بہادر پرائمری فیل تھے۔ تمام عمر ضلع کونسل کے چیئرمین رہے۔ والد صاحب میٹرک فیل تھے' دو بار صوبائی وزیر رہ چکے ہیں۔ میں ایف اے سے آگے نہیں جاؤں گا' چونکہ مجھے وفاقی وزیر بننا ہے۔ میں نے اپنے پڑھے لکھے

رشتے داروں سے عبرت پکڑی ہے۔ جس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی وہ ٹکے ٹکے کی نوکریوں میں جکڑا گیا۔ سارے لائق کزنز کا یہی انجام ہوا ہے۔ کوئی ڈاکٹر ہے' کوئی انجینئر اور باقی کے سول یا آرمی سروس میں۔ خالو کمشنر ہیں اور ماموں بریگیڈیئر۔''

گوہر نے اس پر بہت محنت کی تھی۔ اس لیے اچھے نمبروں میں میٹرک کا امتحان پاس کر گیا۔ اُسے ہیرو بننے کا بہت شوق تھا۔ ہر کسی کا کام کروانے ساتھ چل پڑتا۔ سر راہ دوسروں کے پھڈوں میں ٹانگ اڑایا کرتا۔ گوہر اسے ٹوکتا تو وہ فطری شوخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتا:

''سر آپ بھی حکم کیا کریں۔ کوئی بندہ وندہ اٹھوانا ہو۔ ٹانگ بازو توڑنا ہو یا مدعا ہی غائب کروانا ہو۔''

گوہر مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے ڈانٹ دیتا:

"You shut up naughty boy."

سڑک پر گوہر نے دیکھا کہ ایک کار والے نے باہر نکل کر رکشہ ڈرائیور کو تھپڑ مار دیا۔ کامران نے آگے بڑھ کر کار والے کو پکڑ لیا اور دھنائی شروع کر دی۔ اتنے میں تھانے کی موبائل پاس آ کر رکی اور SHO نیچے اُتر آیا۔ اُس نے کامران کو دھکا دیا اور گریبان سے پکڑ کر پولیس وین میں دھکیلنے کی کوشش کی۔ لیکن اگلے ہی لمحے منظر یک لخت بدل گیا۔ کامران نے SHO کو سڑک پر پٹخ ڈالا اور چھاتی پر بیٹھ کر گھونسے برسانے لگا۔ سنتری نے یہ تماشا دیکھا تو ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا۔ فوراً ہی کچھ نفری موقع پر پہنچ گئی اور کامران کو پکڑ کر اُٹھایا تو SHO بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ گوہر نے یہ نوٹ کیا کہ سپاہیوں میں سے کسی نے بھی کامران پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ سڑک پر بھیڑ ہونے لگی تھی۔ SHO نے کامران کو بازو سے پکڑ کر تھانے کی طرف قدم بڑھایا تو اُس نے زور سے کہنی چلائی اور خود ہی چل پڑا۔

ڈیوڑھی میں مجمع لگ گیا۔ SHO حکم دے رہا تھا کہ کامران کو حوالات میں ڈالو اور پرچہ درج کرو۔ لیکن کوئی آگے نہیں بڑھا۔ جب کہ عملے میں سے کسی نے کہا:

"سر! یہ ملک کامران صاحب ہیں۔ ملک سلطان صاحب کے صاحبزادے اور خان بہادر صاحب کے پوتے۔"

SHO کی جیت کنذائی پر کئی لوگوں نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کر رکھی تھی۔ وردی کا برا حال۔ بٹن ٹوٹے ہوئے۔ ٹوپی ایک سپاہی کے ہاتھ میں۔ چہرے پر چند ایک نیل اور خراشیں۔ ہوائیاں اُڑی ہوئیں۔

SHO کی انا کا مسئلہ تھا۔ سامنے والی حوالات کھلوا کر کامران کو اندر دھکیلنے لگا تو وہ ایک بھرپور مغلظ گالی بکتے ہوئے اونچی آواز میں دھاڑا:

"خبردار! ہاتھ لگایا تو...... بیوی کے بھڑوے۔ تمہیں یاد نہیں۔ تیری...... ابھی تین ہفتے پہلے تم نے اس تھانے کا چارج لیا ہے۔ کس کی دلالی کر کے؟...... یاد نہیں؟۔"

ایک سناٹا چھا گیا۔ صرف کامران بول رہا تھا۔ وہ خود حوالات کے اندر چلا گیا اور چلایا: "چل شروع کر کارروائی۔ Rape کا پرچہ درج کر۔ میں بیان دیتا ہوں۔ اپنی بیٹی کی طرف سے خود لکھ لینا۔"

سارا عملہ خاموش تھا۔ حوالات کے باہر تالا ڈلوا کر SHO اپنے دفتر میں چلا گیا۔ جو ملازمین وہاں کھڑے رہ گئے تھے باری باری دبی زبان میں اپنی صفائی پیش کرنے لگے اور SHO کے خلاف ہرزہ سرائی میں جت گئے:

"دیکھ لیں جی ملک صاحب! ہم نے کتنی بار اسے بتایا آپ کے بارے میں...... ہم جی! انسان کی قدر کرنے والے لوگ ہیں...... او جی! اس نے قسم اُٹھا رکھی ہے کہ ہر تھانے میں ایک بار بے عزت ضرور ہوتا ہے...... پتا نہیں اسے ترقی کیسے مل گئی۔ تھانے دار وہ ہوتا ہے جسے الہام ہو جائے کہ بندے پر ہاتھ اٹھانا ہے یا سلیوٹ

مارتا ہے۔"

رنج و الم کے ایک دبیز غبار نے گوہر کی ہستی کو اپنے حصار میں لے لیا۔ یہ سوچ کر کہ عمر میں اس کی اولاد کے برابر نوعمر لڑکے نے' جو اِس کا شاگرد رہا' ایک ایسے شخص کو رگید کر رکھ دیا جس کے بپھرے ہوئے تکبّر کے حضور پولیس اسٹیشن کی پتھریلی دیواریں لرز رہی تھیں۔ انہیں حوالاتیوں کے سامنے گالیاں سن رہا ہے اور اُس کا عملہ لاتعلق ہوا کھڑا ہے۔ وہی محبوس اور مجبور حوالاتی' جن کے جسموں اور ناموس کو بوٹوں تلے روندر رہا تھا' ان کے سامنے۔ گوہر ایک ناقابلِ بیان بوجھل احساس تلے دبا جا رہا تھا۔

اصل حقائق کس قدر روح فرسا ہیں۔ آزاد شہری ہونے کے ناتے وہ کن خوش فہمیوں میں مبتلا رہا۔ ایک اذیت ناک دُکھ اسے اندر سے نوچنے لگا کہ جس ریاست کے پولیس افسر ایسے ہوں' جو مظلوم پر بھوکے درندوں کی طرح پل پڑیں اور زور آور کے مقابل بھیگی بلی بن کر پاؤں میں لوٹنے لگیں' وہ کسی ستم رسیدہ کی دادرسی کیا خاک کریں گے؟ ایسی نامرد فورس تو دو کوڑی کی بھی نہیں۔ جہاں قانون کے محافظ ایسے ہوں' وہاں عام شہری کی آزادی اور حقوق پانی کے بلبلے سے بھی زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

تھانے کے باہر ابھی سڑک پر یہی ہوا تھا کہ غلطی کار والے کی تھی لیکن اُس نے رکشہ ڈرائیور کو تھپڑ مار دیا تو کامران نے آگے بڑھ کر گاڑی والے کی پٹائی کر دی۔ اسی لمحے SHO پولیس وین میں وہاں پہنچا اور پیٹنے والے کو گریبان سے پکڑ لیا۔ کامران شاید پہلے ہی کسی ایسے سنہری موقع کی تلاش میں تھا کہ مخصوص نوعیت کی اپنی شہرت کو مزید مستحکم کرنے کے لیے کوئی نمایاں کارنامہ سرانجام دے۔ سو تھانے دار کو زمین میں پٹخ دیا اور سینے پر بیٹھ کر گھونسے برسانے لگا۔

ابھی دو تین منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ سادہ کے بقول SHO کا خاص حوالدار آیا اور حوالات کا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ کامران سے کہنے لگا:

"ملک صاحب! آپ جائیں۔ یہ سب کچھ غلط فہمی میں ہو گیا۔ صاحب آپ کو پہچانا نہیں تھا۔"

کامران نے باہر آنے سے انکار کر دیا اور بولا:

"میں یہاں ٹھیک ہوں۔ ایسے نہیں جاؤں گا۔ اس مادر...... کو اچھی طرح پہچان کروا لوں۔ کیا پتا ابھی کوئی کسر رہ گئی ہو اور یہ پھر بھول جائے...... ویسے بھی اس بد نسلے کے نوکیلے دانت توڑ کر تھانے سے نکلوں گا۔ ورنہ یہ پھر کسی کو کاٹ کھائے گا اور میں اپنے شہر کے لوگوں کو تیس تیس ٹیکے کہاں سے لگواتا پھروں گا؟"

فرعون خصلت حوالدار بے بسی کے عالم میں وہاں کھڑا رہا۔ پھر قدرے قریب ہو کر بولا:

"اب معاف کر دیں۔ بڑی بے عزتی ہو گئی ہے۔ آپ نے خوب ٹھکائی کر لی اور گالیاں بھی جی بھر کے دیں۔ کیا کسر باقی رہ گئی ہے؟ بے چارے کی بدقسمتی ہے کہ وہ آپ کو پہچانا نہیں تھا۔ ویسے اُس نے روٹین کی کارروائی ہی کی تھی ناں۔ خدا کے لیے اب چلے جائیں۔ وہ بڑے ملک صاحب سے معافی مانگنے خود گھر جائیں گے۔"

گوہر کونے میں سے اُٹھ کر کھڑا ہوا اور آہنی سلاخوں کے قریب آ گیا تو کامران نے اسے دیکھ لیا۔ حیرت ناک لہجے میں بولا:

"سر! آپ!! یہاں کیسے؟" پھر وہ حوالدار سے مخاطب ہوا:

"اوئے کُتے کی نسلو۔ انہیں یہاں کیوں رکھا ہوا ہے۔ یہ میرے سر ہیں۔ اتنے اعلیٰ انسان...... تمہاری ماں......"

اسی اثنا میں شور و غوغا بلند ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے تھانے کا احاطہ گاڑیوں سے بھر گیا۔ لینڈ کروزرز، پجارو، کاریں اور جیپیں۔ باہر سڑک بھی بلاک ہو گئی۔ اتنی بھیڑ لگ گئی کہ ڈیوڑھی سے گزرنا محال ہو گیا۔ نعرے سنائی دینے لگے۔ "تیری شان

میری شان ...... کامران کامران"۔

پورے شہر کی چینٹری اور انتظامیہ پہنچ گئی۔ کمشنر نے کامران کو ڈانٹتے ہوئے باہر آنے کو کہا۔ ایس ایس پی بھی ساتھ کھڑا تھا۔ لیکن وہ مسلسل اصرار کیے جا رہا تھا کہ تھانے دار کو ایسی جگہ پوسٹ کیا جائے جہاں صرف حلال کھانے کو ملے اور یہ پکا مومن بن کر ریٹائر ہو۔ ایس ایس پی نے یقین دہانی کرائی کہ وہ ابھی چارج چھوڑ رہا ہے۔ گدھا ثابت ہوا ہے۔ ایسا تھانے دار یہاں نہیں چل سکتا۔ آپ باہر آئیں۔ کامران نے باہر آ کر دوسری حوالات کا دروازہ کھلوایا اور گوہر کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ حوالدار بھی جھٹ اندر آ گیا اور مضروب حوالاتی کے ساتھ ساتھ بوڑھے کو بھی چپکے سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ SHO اندر آیا تو اس نے گوہر سے نظریں نہیں ملائیں۔ کامران سے مردہ آواز میں مخاطب ہوا۔

"ملک صاحب! ویری سوری۔ میرا آپ سے براہ راست تعارف نہیں تھا۔ میں آپ کے والد صاحب کے برابر ہوں' پھر بھی معافی مانگتا ہوں۔"

کامران نے بھڑک کر جواب دیا:

"ڈرڈر بے غیرت! تم میرے باپ کے برابر کیسے ہو گئے؟ سُور بوڑھا ہو جائے تو قابلِ احترام نہیں ہو جاتا۔"

SHO ڈھٹائی سے ہنس کر چپ ہو گیا۔ کامران دوبارہ بولا:

"سر گوہر کو یہاں کیوں رکھا ہوا ہے؟ ابلیس کی اولاد! فرشتوں کو بھی قید کر لیتے ہو؟ ان پر چارج کیا لگایا ہے؟ اپنی کسی سگی کا اغوا ڈالا ہو گا۔ لیکن یہ تو ایسا کوئی کام نہیں کرتے۔ ان کا نام کاٹ کر میرا لکھ لو۔"

SHO چپکے سے نکل گیا تو ایس ایس پی نے اتنا ہی کہا: "Its too much"

کمشنر نے بھی لقمہ دیا: "Behave you spoiled child"

کامران نے تپ کر کہا:

''انکل میں نہیں' یہ لوگ Spoil ہو چکے ہیں۔ انہیں ٹھیک کریں۔ آپ جانتے ہیں۔ یہ میرے استاد ہیں۔ جن کی میں دل سے عزت کرتا ہوں اور آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کیسے لوگوں کا احترام کیا کرتا ہوں۔''

اُس نے گوہر کا ہاتھ پکڑ کر احتراماً سینے سے لگایا تو وہ آبدیدہ ہو گیا اور کوشش کے باوجود ہچکیوں پر قابو نہ رکھ سکا۔ اسی لمحے نشئی حوالاتی بول اُٹھا:

''نہ رو باؤ یار! کتنی بار کہا ہے بڑی تکلیف ہوتی ہے تمہیں روتا ہوا دیکھ کر۔ روئیں ہم جو اِن گلیوں کا کوڑا ہیں۔''

پھر وہ براہ راست کامران سے کہنے لگا:

''چپ کرواچھوٹے ملک اسے' نہیں تو میں بھی رونے لگوں گا۔''

کامران کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ کہنے لگا:

''سر! آپ کیوں روئے ہیں؟ سچ سچ بتائیں۔ انہوں نے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی۔ ایک ایک کے بدلے دس دس جوتے نہ ماروں تو ملک سلطان کی اولاد نہیں۔''

گوہر نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا:

''نہیں مجھے انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ رونا اس لیے آیا کہ کس قسم کا معاشرہ تشکیل پا گیا ہے۔ کتنا مغز کھپایا تھا تمہارے ساتھ لیکن سب رائیگاں چلا گیا۔ تم بھی اس دوزخ کے داروغہ بننے جا رہے ہو۔ کہیں یہ اس عہد کا ہولناک عذاب الٰہی تو نہیں کہ ایسے حکمران اور کارندے مسلط کر دیئے گئے ہیں؟''

***

بے غیرتی

میرے بچپن کے دوست اور کلاس فیلو جان محمد ملک عرف جانو شدید خواہش کے باوجود میٹرک پاس نہ کر سکا۔ غربت نے اس گھرانے کی خوب دُرگت بنا رکھی تھی۔ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لیے باپ کا ہاتھ بٹانے کی خاطر جانو نے چھوٹے موٹے ڈاکے بھی ڈالے۔ مرغیاں چوری کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ دو تین بار قصبے کے مضافات سے بھیڑیں بھی اُٹھا لیں۔ دکانوں سے اشیا پار کرنا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ ان کارگزاریوں کو زیادہ برا نہیں سمجھتا تھا۔ حالانکہ اُس کا تکیہ کلام تھا "بے غیرتی۔" وہ بات بے بات کہا کرتا۔ "یہ تو بے غیرتی ہوئی ناں۔" اُس کی غیرت کے تمام تر تقاضے ایک ہی نقطے پر مرتکز ہو گئے تھے اور وہ تھا معاشرے میں خواتین کا کردار۔ کوئی عورت ہنس دیتی تو وہ بولتا۔ "توبہ توبہ کیسی بے غیرتی ہے۔" کوئی لڑکی اپنے من کی موج میں چلی جا رہی ہوتی' تب بھی وہ یہی ریمارکس پاس کرتا۔ لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں وہ اپنی رائے محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اُس کے نزدیک ملک وقوم اور معاشرے کا سب سے اہم مسئلہ خواتین کے پردے سے منسلک ہو کر رہ گیا تھا۔ گویا ملک کی خواتین اگر جانو کی سوچ کے عین مطابق پردے کی پابندی کرنے لگیں تو پلک جھپکنے میں تمام مسائل حل ہو جائیں۔

ہم دونوں دوستوں کی سوچوں میں جو تضاد تھا وہ کبھی بھی باہمی تعلقات کے

لیے وجۂ نزاع نہیں بنا۔ چونکہ اُس کے انوکھے نظریات سے میں لطف لیا کرتا تھا بلکہ خود گفتگو کا رُخ کسی نہ کسی طرح ایسے موضوع کی طرف موڑ دیتا جس پر پُر جوش ہو کر وہ قطعیت سے فیصلے صادر کیا کرتا اور کہتا کہ فلاں طرزِ عمل مستحسن ہے اور فلاں بے غیرتی۔

میں ایس وی ٹیچر بھرتی ہونے کے بعد پرائیویٹ اُمیدوار کی حیثیت سے انٹر پاس کر چکا تھا اور وہ اب کلینرز سے ترقی کر کے ٹرک ڈرائیو کرنے لگ گیا تھا۔ جس ٹرک کا وہ ڈرائیور تھا اس کے کاغذات شاید شروع میں کہیں بنے ہوں گے لیکن اب وہ عرصے سے قصبے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ جانو کا ڈرائیونگ لائسنس بننے کے امکانات بھی روشن نہیں تھے۔ چونکہ ٹرک کے مالک کی یقیناً یہی مرضی تھی کہ جانو کے پر نہ نکلیں اور وہ اسی پنجرے میں رکھے چوگے پر قناعت کیے پڑا رہے۔

ایسے ہی باتوں باتوں میں ہم نے ایک بار کہہ ڈالا کہ جب ہمارے بچے پیدا ہوں گے تو ہم اپنی دوستی کو رشتہ داری میں بدلنے کے لیے ان کی باہم شادیاں کر دیں گے۔ حالانکہ پردے کے بارے میں وہ جس نوعیت کی انتہا پسندانہ رائے رکھتا تھا وہ اس کے کسی متوقع سمدھی کے چھکے چھڑانے کے لیے کافی تھی۔ تاہم میں دعا گو رہا کہ اللہ پاک مجھے ابتدا میں ایک بیٹے سے نواز دے تاکہ میں کسی کڑی آزمائش میں پڑنے سے صاف بچ نکلوں۔ دراصل مجھے ذاتی طور پر پردے سے چڑ نہیں تھی لیکن جس پردے کا وہ قائل تھا' اس کا تصور کر کے میرے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔ اول تو وہ عورت کے گھر سے نکلنے کے ہی خلاف تھا' تاہم اگر ایسا کرنا ناگزیر ہو جائے تو اُس کی دانست میں عورت سر سے پاؤں تک اس طرح شٹل کاک برقعے میں لپٹی ہوئی ہو کہ ہاتھ کجا' انگلی کی پور بھی دکھائی نہ دے۔ پردہ دار خاتون کے بولنے کے بھی خلاف تھا۔ وہ کہا کرتا کہ کئی لوگ صنفِ نازک کی آواز سن کر حظ اٹھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ عورت کے لیے ایسے جوتے تجویز کیا کرتا جو بے آواز ہوں۔ اگر کسی راہ چلتی برقعہ پوش خاتون کے

پاؤں میں ایڑی والی جوتی سے ٹک ٹک کی آواز سنائی دیتی تو وہ جھٹ بول دیتا۔ "بڑی بے غیرتی ہے۔" میں اُس کے بے رحمانہ ریمارکس پر حسبِ معمول صدائے احتجاج بلند کرتا تو وہ کہتا۔ "یار! یہ مردوں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش ہے۔ اس کے پس پردہ کوئی اور ہی طرح کی نیت کارفرما ہے۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔"

معاشرے کو بے راہ روی سے محفوظ رکھنے کے لیے اس نے کچھ اور بھی تیر بہدف نسخے تجویز کر رکھے تھے۔ وہ کہتا کہ اگر کسی عورت کو غیر محرم سے مخاطب ہونا پڑ جائے تو ماتھے پر بل ڈال کر بڑی کرخت آواز میں بولے۔ گویا عورت پرلے درجے کی بدتمیز ہو تا کہ کسی مرد کے دماغ میں راہ و رسم پیدا کرنے کی تحریک ہی نہ اُٹھے۔

ہمارا قصبہ گو تحصیل ہیڈ کوارٹر تھا لیکن انتہائی پس ماندہ۔ گنتی کے چند آفیسر تھے جو آپس میں ہی میل جول رکھنے کو ترجیح دیتے۔ ان میں سے بھی بیشتر یہاں تنہا رہ رہے تھے۔ غالباً اُن کے اہلِ خانہ اپنے اپنے آبائی یا بڑے شہروں میں رہائش پذیر تھے۔ مقامی لوگ سادہ تھے اور کوئی ایسی معاشرتی خرابی بھی نہیں تھی۔ البتہ پردے سے متعلق جانو کے وضع کردہ اصول و ضوابط چونکہ خاصے کڑے اور بے لچک تھے' اس لیے زیادہ تر خواتین ان پر عمل پیرا ہونے کی مالی سکت ہی نہیں رکھتی تھیں۔ میں نے اپنے دوست سے کئی بار التجا کی کہ وہ اہلِ قصبہ کی معاشی حالت کے پیشِ نظر کم از کم عبوری عرصے کے لیے نرمی اختیار کرتے ہوئے "بے غیرتی" سے قدرے کم سنگین الفاظ استعمال کیا کرے۔ تاہم جوں ہی خوش حالی اِدھر کا رُخ کرے گی تو پردے کے مطلوبہ تقاضوں سے انحراف کرنے والی خواتین کو "بے غیرتی" سے بھی زیادہ سخت ریمارکس سے نوازا جا سکتا ہے۔ وہ نہیں مانا۔ میں نے اُسے کہا۔ "یار! ذرا سوچو تو' جہاں بہت سے لوگ ایک بنیان خریدنے سے عاجز ہوں' وہاں تمہارے پسندیدہ تمبو نما برقعے کے لیے کپڑا کہاں سے مہیا کیا جائے؟

اُن دنوں کالا برقع نیا نیا چلا اور اس کا رواج ابھی بڑے شہروں تک ہی محدود تھا۔ ہمارے جیسے چھوٹے قصبوں میں کسی کی ہمت نہیں پڑی تھی کہ اس طرح کا برقع لیا جائے۔ تاہم بڑے شہروں سے کبھی کبھار کوئی مہمان خاتون ایسا برقع لیے آ جاتی تو اسے کسی عجوبے سے کم تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ مجھے یہ برقع بہت اچھا لگا۔ ریشمی کالا کپڑا اور شٹل کاک کے مقابلے میں معقول حد تک مختصر اور پرکشش۔ اسے ان دنوں فیشنی برقع کہا جاتا تھا۔ میں نے اس کی حمایت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تو جانو بھڑک اُٹھا اور اسے بلا تردد "بے غیرتی" قرار دے ڈالا۔ اسے مزید چھیڑنے کے لیے میں نے اس برقعے کی تراش خراش کی تعریف کر ڈالی اور کہا کہ شٹل کاک میں ملفوف ہستی کا پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ اسی سال کی بڑھیا ہے یا سترہ اٹھارہ سالہ دوشیزہ۔ اُس نے چمک کر کہا۔ "یہی تو میں کہتا ہوں۔ اسی لیے یہ بے غیرتی ہے۔ وہ برقع ہی کیا ہوا' جس میں نسوانی جسم کے خطوط مزید واضح ہو کر مردوں کے جذبات کو بھڑکانے لگیں۔ کچھ اور لوگ بھی ہماری بحث سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ خاص طور پر ان میں جانو کے دو کزنز اور رشتے کے ایک ماموں۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں جانو کو تپا رہا ہوں' اس لیے سب میری بات کو بڑھاوا دینے لگے۔ باتوں باتوں میں میرے لبوں سے یہ الفاظ ادا ہوئے کہ کیا خبر' مستقبل قریب میں آج کا یہ معیوب فیشن ہمارے گھروں میں رواج پا جائے۔ جانو بڑے پُر جوش انداز میں بولا۔ "آج میں یہاں سب کی موجودگی میں عہد کرتا ہوں کہ اگر میرے گھر میں کسی نے فیشنی برقع لیا تو آپ لوگ گدھے کے پیشاب سے میری شیو کر دینا۔ میں کسی کا ہاتھ نہیں روکوں گا۔"

اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ میرے ہاں پہلی ولادت بیٹے کی ہوئی اور جانو کے بیٹی کی۔ وہ سخت اُداس رہنے لگا اور یوں شرمندہ شرمندہ جیسے اُس سے کوئی غیر اخلاقی فعل سرزد ہوا ہو۔ میں نے اُس کی دل جوئی کے لیے بھرپور دلائل دیئے اور کہا کہ بیٹی اللہ کی

رحمت ہوتی ہے۔ وہ رنجیدہ ہو کر بولا۔ ''یار! اللہ کے گھر میں بے شمار رحمتیں ہیں۔ میرے لیے یہی رکھ چھوڑی تھی۔ کاش وہ یہ رحمت کسی اور کو دے دیتا''...... میں نے فوراً ٹوک دیا اور استغفار پڑھتے ہوئے سخت الفاظ میں سرزنش کی کہ وہ کفر بک رہا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف بلند کیے اور معافی بھی مانگ لی لیکن بڑی ڈھٹائی سے اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ بولا۔ ''اللہ میاں جی! میں تیری اس رحمت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا''...... وہ مزید نہ جانے کیا بولتا' میں نے اُسے ایک گھونسا مارا اور اظہار ناراضگی کرتے ہوئے وہاں سے اٹھ گیا۔

چند روز تک میں اُس سے نہیں ملا' تا کہ وہ میری ناراضگی کو سنجیدگی سے لے۔ حالانکہ میں دل سے ناراض نہیں تھا۔ یہ محض اُس کے خیالات میں توازن پیدا کرنے کی ایک تدبیر تھی۔ پانچویں روز گھر کے باہر اُس کا ٹرک رکنے کی آواز سنائی دی تو میں بیٹھک میں آ بیٹھا اور چہرے پر بڑی بھرپور سنجیدگی طاری کر لی تا کہ ناراضگی کا تاثر قائم رہے۔ وہ اندر داخل ہوا۔ اُس کے چہرے سے ہلکی سی خجالت مترشح تھی۔ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا اور مجھے بازوؤں سے پکڑ کر کھینچنے لگا۔ میں نے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے نیم دلی سے مزاحمت کی لیکن اُٹھ کھڑا ہوا تو وہ مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ کہنے لگا۔ ''یار! تم میرے جذبات کو سمجھتے نہیں۔ سچ پوچھو تو بیٹی مجھے بہت پیاری لگتی ہے۔ شاید کسی کو بیٹا بھی اتنا پیارا نہ ہو لیکن میں خوفزدہ ہوں کہ اس بگڑے ہوئے معاشرے میں کیا میں اپنی غیرت کی حفاظت کر سکوں گا؟''

میں جس پرائمری سکول میں تعینات تھا وہاں بچوں کے ساتھ بچیاں بھی پڑھتی تھیں۔ جانو سے کئی بار کہا کہ بیٹی سکول جانے کے لائق ہو گئی ہے اس لیے اُسے داخلہ دلا دے تا کہ وہ تعلیم کا سلسلہ شروع کر سکے۔ میں نے اُسے قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی کہ بیٹی کے لیے تعلیم زیادہ ضروری ہے۔ وہ دل سے میری بات کو درست تسلیم کرتا تھا

اور زبان سے بھی اقرار کیا لیکن بدستور ہچکچاہٹ کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔ میں نے اُسے وہ وعدہ یاد دلایا اور کہا کہ اُس کی بیٹی درحقیقت میری بیٹی ہے۔ یا تو وہ وعدہ پورا کر کے مرد ہونے کا ثبوت دے اور میری امانت کو میرے حوالے کرے تا کہ میں اُس کی تعلیم کا سلسلہ شروع کروں۔ یا پھر وہ صاف صاف عہد شکنی کرے۔ اُس نے کہا کہ نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ زبان سے پھر جانا مرد کے لیے انتہا درجے کی بے غیرتی ہے۔ بیٹی واقعی اُس کے پاس امانت ہے' لہٰذا اسے کل سے سکول داخل کروا دے گا۔

اگلے روز وہ پھول سی پیاری بیٹی کو سکول لے آیا اور میرے حوالے کر کے بولا۔ "یہ لو اپنی امانت۔ لیکن ایک بات کان کھول کر سن لو کہ پانچ جماعتوں سے زیادہ میں نہیں پڑھنے دوں گا۔ خواہ تم میری گردن اتار دو۔" مجھے ہنسی آ گئی اور گڑیا کو اپنی گود میں لے کر اُسے کہا کہ فی الحال وہ دفع ہو جائے۔ جب پانچ سال گزریں گے تو دیکھا جائے گا۔

پہلے پہل میں ازراہِ شغل اُسے عورت ذات کے معاملے میں چھیڑ دیا کرتا تھا لیکن اب مجھے اُس کی ذہنی کیفیت پر ترس آنے لگا کہ وہ کس اذیت میں مبتلا ہے۔ انسانی زندگی کے اس جزو لاینفک کو کھلے ذہن سے قبول نہیں کرتا۔ میں نے ایک بار اُسے شرم دلاتے ہوئے یہاں تک کہہ ڈالا کہ اگر وہ عورت سے اتنا ہی الرجک ہے تو اس ہستی سے جنم کیوں لیا اور پھر مزید یہ کہ گھر بسانے کے لیے بھی اسی کا انتخاب کر ڈالا۔ میں چونکہ اُس کا شہ بالا بھی بنا تھا اس لیے کہا کہ اگر عورت کوئی ایسی بارود قسم کی شے ہے جس سے اُس کی غیرت بھک سے اڑ جانے کا خدشہ تھا تو وہ سہرے باندھ کر خوشی خوشی اس خوفناک بلا سے بیاہ رچانے کیوں چل دیا تھا؟ کسی ایسی جنس کا انتخاب کر لیتا جس سے اُس کی غیرت کو دھچکا لگنے کا سرے سے احتمال ہی نہ ہوتا۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔ میں فکرمند رہنے لگا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا کہ وہ اُس کے ذہن میں پڑی اس نامعقول گرہ کو کھول دے تا کہ بلاوجہ کے عذاب سے اُسے نجات حاصل ہو۔

اپنے قصبے کی خواتین کے بارے میں اُس کی ذہنی کیفیت میں کافی حد تک اعتدال آ گیا تھا۔ تاہم اب وہ اپنے اُن ساتھی ڈرائیوروں کے حوالے سے لاہور اور دیگر بڑے شہروں کی خواتین پر گفتگو کیا کرتا جو لمبے روٹس پر چلتے تھے۔ وہ حیرت زدہ ہو کر بتایا کرتا کہ لاہور اور راولپنڈی میں عورتیں ہر روز نئے نئے لباس پہن کر گلے میں دوپٹے ڈالے کھلے عام پھرتی ہیں۔ برقع در کنار چادر بھی نہیں لیتیں اور خوشبو لگاتی ہیں۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے انکشاف کیا کہ ان بڑے شہروں کی خواتین عینک لگا کر کاریں بھی چلانے لگی ہیں اور کلائی پر گھڑیاں عام شام نے باندھ رکھی ہیں۔ غالباً اُس نے بھرپور کوشش کی لیکن زبان کو لگام دینے میں بری طرح ناکام رہا اور بولا۔

''یار! بے غیرتی کی حد ہو گئی ہے۔''

میری رگِ ظرافت پھڑک اُٹھی' بڑی سنجیدگی سے کہا: سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہمارے اس اسلامی ملک کی خواتین گھڑی باندھیں اور عینک لگا کر کاریں چلاتی پھریں۔ یہ بہت بڑی گپ ہے۔ ہمارے ملک کی خواتین نے کیا کسی کو ٹائم دے رکھا ہوتا ہے اور عینک لگا کر وہ کیا کن انکھیوں سے مردوں کو تاڑتی پھرتی ہیں؟ میں نہیں مانتا۔'' اُس نے بڑے پرجوش انداز میں میرا بازو پکڑ کر کھینچنا شروع کیا کہ میں ساتھ چل کر حاجی اللہ یار سے اِس امر کی تصدیق کر لوں۔ حاجی صاحب خاصے معروف اور معزز شہر دار تھے۔ بڑے معتبر اور پارسا۔ پیشے کے اعتبار سے ٹرانسپورٹر تھے اور آئے روز راولپنڈی' پشاور اور لاہور گئے ہوتے۔ میں نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لاہور راولپنڈی کی خواتین کے بارے میں انکشافات کو یکسر رد کر دیا اور بڑی ڈھٹائی سے حاجی اللہ یار سے اس طرح کی تصدیق کرنے سے منکر ہو گیا۔ جانو کو بڑا غصہ آیا تاہم ضبط کر گیا اور اگلے ہی لمحے میں نے محسوس کیا کہ اُسے میرے رویے پر بڑا دکھ ہوا ہے۔ گویا میں نے اُس کو قابلِ اعتبار نہیں جانا۔

جانو دل کا سادہ ہی تھا۔ یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ میں اُسے تیار رہا ہوں۔ حالانکہ وہ ذرا سا بھی ذہن پر زور دیتا تو اُسے یاد آ جاتا کہ میں تعلیمی بورڈ اور ادیب فاضل کے امتحان کے سلسلے میں کئی بار لاہور جا چکا ہوں اور دو بار راولپنڈی جانے کا اتفاق بھی ہوا تھا لیکن وہ اللہ کا بندہ جوش میں ہوش کھو بیٹھتا تھا' لہٰذا میری چال نہ سمجھا اور مات کھا گیا۔

ایس ڈی ایم صاحب کا تبادلہ ہو گیا تو جانو کے ٹرک مالک نے اُسے حکم دیا کہ وہ صاحب کا گھریلو سامان لوڈ کر کے رات کو نکل پڑے اور صبح پو پھٹتے ہی لاہور پہنچ جائے۔ وہاں منٹو پارک چوک میں اس کی راہنمائی کے لیے کوئی شخص موجود ہو گا جو اسے منزل تک لے جائے گا۔ جانو کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے۔ وہ پر جوش بھی تھا لیکن میری خوشامد پر اُتر آیا کہ میں اس کے ساتھ چلوں۔ اگلے روز اتوار کی چھٹی تھی اور میرا لاہور میں کام بھی تھا کہ پھر پھرا کر کہیں سے ادیب فاضل کی پرانی کتابیں اکٹھی کر لوں لیکن اپنی اہمیت جتلانے کے لیے نخرے کر رہا تھا۔ جانو کے پاس پولیس تھانے کی چالان چٹ موجود تھی تا کہ راستے میں کوئی اتھارٹی اس سے ٹرک کی دستاویزات اور ڈرائیونگ لائسنس ملاحظہ کرانے کا تقاضا نہ کرے۔ تھوڑی سی رد و کد کے بعد میں راضی ہو گیا لیکن یہ شرط عاید کی اگر وہاں کوئی عورت اچھے اچھے کپڑے پہنے' گلے میں دوپٹا ڈالے' خوشبو لگائے' کلائی پر گھڑی اور آنکھوں پر عینک سجائے گاڑی چلاتی ہوئی دکھائی نہ دی تو اسے پاک وطن کی عفت مآب بیٹیوں پر بہتان تراشی کے جرم میں بطور سزا واپسی پر شٹل کاک برقع پہن کر ڈرائیونگ کرنا پڑے گی۔ ہاں! اگر یہ الزام سچ ثابت ہو گیا تو وہی شٹل کاک برقع میں اوڑھ لوں گا جو ہم یہاں سے ہم راہ لے کر چلیں گے۔ اُس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ کہنے لگا۔

''یار ماسٹر! تم بڑے ظالم ہو۔ مجبوری سے ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ۔ میں نے سنا ہے کہ ایسی عورتیں مال روڈ اور انارکلی میں ہوتی ہیں۔ کیا خبر ہمارا سامنا نہ ہی ہو۔'' میں

اپنی بات پر اڑ گیا اور کہا کہ نہیں اُسے برقع اوڑھنا پڑے گا۔ ہاں ایک رعایت دی جا سکتی ہے کہ وہ ٹرک چلاتے ہوئے چہرے پر سے نقاب اُٹھا سکے گا۔ لیکن یہاں گھر پہنچ کر ٹرک سے نیچے اترتے ہوئے پردہ کے وہی جملہ تقاضے پورے کرنا پڑیں گے جو اُس نے وضع کر رکھے ہیں۔ میں نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کہا کہ اگر میں شرط ہار گیا تو واپسی پر تمام راستے برقعے کا نقاب ڈال کر ٹرک میں فرنٹ سیٹ پر سفر کروں گا۔ اُس نے کئی تاویلیں پیش کیں کہ منہ اندھیرے لاہور پہنچتا ہے اور منٹو پارک کے موڑ پر بادشاہی مسجد کے قریب ٹرک روک دیتا ہے۔ وہاں کوئی منتظر شخص ٹرک کا نمبر دیکھ کر از خود ہم سے رابطہ کرے گا اور ہمیں منزل تک لے جائے گا۔ اُس نے مزید کہا کہ ایسے وقت میں لاہور کے باہر باہر کسی فیشن ایبل عورت کا سامنا ہونا بعید از قیاس ہے۔ اُس نے تجویز پیش کی کہ آئندہ کبھی لاہور کے بارونق علاقوں میں جائیں گے تو اس شرط پر عمل درآمد کر لیں گے۔ میں نے محسوس کیا کہ اُس کا اعتماد متزلزل ہو رہا ہے۔ حالانکہ قبل ازیں اُسے یقین تھا کہ اُس کی معلومات سو فیصد درست ہیں۔ میں نے اتنی رعایت دے دی کہ اگر ہم واقعی لاہور کے مضافات سے پلٹ آئے تو یہ شرط ساقط ہو جائے گی لیکن بارونق علاقے میں جانے کی صورت لاگو رہے گی۔

ٹرک میں وزن برائے نام ہی تھا۔ ہم دونوں کیبن میں بیٹھے گپیں ہانکتے تیز رفتاری سے لاہور کی جانب بڑھ رہے تھے۔ میرے پاس کینوس کا ایک پھولا ہوا بیگ سیٹ پر رکھا تھا۔ جانو نے پوچھا کہ اس میں کیا ہے تو بتایا کہ شٹل کاک برقع ڈال رکھا ہے۔ وہ بدمزہ ہو کر کہنے لگا۔ "یار ماسٹر! تم بہت ضدی ہو۔ تم سے دوستی نبھتی نظر نہیں آتی۔"

پو پھٹتے ہی ہم لاہور میں داخل ہوئے۔ مینار پاکستان کی تعمیر شروع ہو چکی تھی۔ بے ہنگم ٹریفک اور آبادی سے محفوظ ہونے کے باعث لاہور کا حسن ابھی ماند نہیں پڑا تھا۔ بڈھا راوی پل کے پار چوک سے بائیں جانب بادشاہی مسجد والی سڑک پر ٹرک

موڑ کر ہمیں تھوڑی دور آگے رکنے کے لیے کہا گیا تھا۔ سورج کی کرنیں منظر کو روشن کرنے لگی تھیں۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ جوں ہی ہم چوک میں پہنچے تو عین سامنے سے ایک کار ہماری طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دی جسے ایک خاتون چلا رہی تھی۔ سٹیئرنگ پر دھرے اُس کے گورے ہاتھ دکھائی دیئے اور کلائی پر چمکتی گھڑی پر بھی ہماری نظر پڑی۔ کار جوں ہی اور زیادہ قریب ہوئی تو سکرین کے پیچھے پرکشش خاتون گلے میں دوپٹا ڈالے زیادہ واضح طور پر نظر آنے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ ٹرک کا انجن رہ رہ کر گڑگڑانے لگا ہے اور ساتھ ہی جھٹکے بھی لگنے لگے ہیں۔ ہمیں بائیں مڑنا تھا لیکن جانو کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''اے ے ے ے یہ دیکھو عورت' گھڑی اور کار بھی۔'' ساتھ ہی ٹرک کا انجن خوفناک آواز سے دھاڑنے لگا۔ معلوم نہیں جانو کے دونوں پاؤں کیا کرتب دکھا رہے تھے کہ کوارڈی نیشن ختم ہو گیا۔ ایک بار پھر اس نے جملہ دہرایا۔ ''اے ے ے ے دیکھو اپنے سامنے یہ عورت' گھڑی اور کار۔ وہ خود چلا رہی ہے۔'' میری جان حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ ٹرک کا انجن ایک بار پھر دل دہلا دینے والی آواز میں چنگھاڑا اور بائیں مڑنے کی بجائے آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ غالباً کلچ اور ایکسی لیٹر ایک ساتھ پوری طرح دب گئے تھے اس لیے شور زیادہ اور رفتار کم تھی۔ عورت نے خطرہ بھانپ لیا اور گاڑی کو روک کر ہمیں دیکھنے لگی۔ غیر ارادی طور پر میں نے سٹیئرنگ کو پکڑ کر اپنی جانب گھمایا تو ٹرک کا رُخ قدرے بائیں ہو گیا لیکن اس سے زیادہ کچھ کرنا میرے اختیار میں نہیں تھا۔ کار سے ہماری ٹکر تو نہ ہوئی لیکن ٹرک پینتالیس کے زاویے سے لڑھکتا' لرزتا اور گرجتا ہوا فٹ پاتھ سے جا ٹکرایا اور زوردار جھٹکے کے ساتھ بند ہو گیا۔

چوک میں اس وقت کوئی زیادہ رش اور ٹریفک نہیں تھا۔ ہمارے ٹرک کے انجن سے کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی آوازیں برآمد ہونے سے اردگرد موجود ہر کوئی

چوکس ہو گیا تھا۔ اللہ کا کرم ہوا کہ جانو نے شدید حیرت و استعجاب اور جذباتی کیفیت کے زیر اثر ایکسی لیٹر اور کلچ ایک ساتھ پوری طرح دبا رکھے تھے اور ٹرک غالباً اپنی ہیبت ناک آواز کی لرزش سے لڑھک رہا تھا۔ اُن دنوں سکرین ٹوٹ کر تلوار بن جایا کرتی اور جانو جیسے ڈرائیوروں کی حماقت پر انہیں گردن زدنی قرار دیتے ہوئے وار کر دیا کرتی تھی۔ میں خطرہ بھانپ کر قبل از وقت ہی غیر ارادی طور پر کھسکتا ہوا کھڑکی کے ساتھ چپک گیا تھا۔ بھلا ہو سال خوردہ ٹرک کے ناقص دروازے کا جو کئی او چھے ہاتھ مارنے کے باوجود نہیں کھلا ورنہ میں سڑک پر پڑا ہوتا اور ٹرک کے پچھلے پہیے مجھے کچل کر نکل گئے ہوتے۔

جانو حواس باختہ لہو میں تر ہونقوں کی طرح دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ مجھے اس کی بات کا یقین آیا ہے یا نہیں۔ لوگ فوراً مدد کو پہنچے۔ پلک جھپکتے ہی دروازے کھول کر ہمیں باہر کھینچا اور ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ میں ٹھیک تھا لیکن اس اچانک حادثے کے باعث گنگ سا ہو کر رہ گیا۔ مجھے فٹ پاتھ پر ہی چھوڑ کر سب جانو کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کار والی خاتون سر پر کھڑی سب کو ہدایات دے رہی تھی۔ پولیس پہنچ چکی تھی۔ عورت نے بڑی پر اعتماد آواز میں انہیں بھی کچھ احکامات دیئے تو اس کی کار میں سے فسٹ ایڈ بکس اٹھائے ایک کانسٹیبل تیزی سے قریب آیا۔ لوگوں کو پیچھے ہٹا دیا گیا اور عورت جانو کا بڑی مہارت سے معائنہ کرنے لگی۔ جہاں جہاں سے خون بہہ رہا تھا اس نے عجلت میں پٹیاں باندھیں۔ ایک پولیس آفیسر کو اپنا کارڈ دکھا کر ٹرک کو منزل تک پہنچانے کی ہدایت کی اور لوگوں کی مدد سے جانو کو اپنی گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈلوایا۔ مجھے فرنٹ سیٹ پر بٹھا کر ہوا ہو گئی۔

ہسپتال میں بھی کار والی جانو کے بیڈ پر موجود رہی۔ نرسیں اس کی نگرانی میں زخم صاف کرتی رہیں۔ ٹیکے لگائے اور ادویات دے کر قدرے بڑے زخموں کے منہ ٹانکے لگا کر بند کر دیئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اللہ کا کرم ہوا ہے کہ کوئی خطرناک زخم نہیں

آیا۔ جانو اب سنبھل چکا تھا۔ اُس کے اردگرد نرسیں گھوم پھر رہی تھیں۔ وہاں تمام لوگ اور نرسیں کار والی کو میڈم کہہ کر مخاطب کر رہی تھیں۔ میں جلد ہی سمجھ گیا کہ وہ سرکاری ڈاکٹر ہے۔اس لیے سارا عملہ جاں فشانی سے ہماری نگہداشت کر رہا ہے۔

پانچویں روز میڈم ہمیں اپنی کار میں بٹھا کر گھر لے گئی تو وہاں کوٹھی کے باہر ہمارا ٹرک کھڑا تھا۔ وہ ایس ڈی ایم صاحب کی بیگم تھیں۔ حادثے کے روز بوڑھا ڈرائیور اچانک بیمار پڑ گیا تو وہ خود ہی ہمیں لینے کے لیے چوک میں پہنچ گئی تھیں۔ اُس عورت نے ہماری خدمت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ بے دریغ جانو کی کلائی اور کبھی ماتھے پر ہاتھ رکھ دیتی۔ خود پٹی کھولنے لگتی اور معائنہ کر کے بغیر کسی تردد کے زخم صاف کر کے دوبارہ ڈریسنگ کر دیتی۔ جانو احسان مند تو تھا ہی۔ خاتون کے ہاتھ سے روئی لے کر زخم خود صاف کرنے لگتا۔ وہ بڑے خلوص سے کہتی۔ ارے تم میرے بھائی ہو اور یہ میرا فرض بھی ہے۔ مزے کی بات ہے کہ اس تمام عرصہ میں اُس سے خوشبو آتی رہی اور وہ ہر روز نئے نئے لباس تبدیل کرتی۔ جس روز ہم نے پہلی دفعہ اسے گاڑی چلاتے دیکھ کر دھما کا کیا تھا' اُس نے عینک نہیں لگا رکھی تھی۔ لیکن اب ہم نے اسے بیسیوں مرتبہ عینک لگائے دیکھ لیا تھا۔ وہ دن میں کئی بار گاڑی لے کر کوٹھی سے باہر جاتی اور واپس آتی۔ ہمیں لان میں بیٹھے دیکھ کر بڑی خوش اخلاقی سے مسکرا کر حال احوال پوچھتی تو جانو پانی پانی ہو جاتا۔

ٹرک کا مالک اور ایس ڈی ایم صاحب بھی آن پہنچے۔ ٹرک کی اسکرین ڈلوائی گئی۔ ہمیں نولکھا گڈز سے مال لوڈ کروا کر مالک نے واپسی کا حکم دیا اور خود لاہور میں ہی رک گیا۔ دورانِ سفر میرا خیال تھا کہ جانو مجھے برقع اوڑھنے کے لیے کہے گا لیکن وہ بڑا مسرور سا اپنی دھن میں مگن ٹرک ڈرائیو کرتا رہا۔ میں نے کہا۔ ''یار جانو! بڑے شہروں میں واقعی بڑی بے غیرتی ہے۔'' اُس نے مجھے زہر خند سے دیکھتے ہوئے ایسے برے کلمات سے مخاطب کیا کہ میں حیران رہ گیا۔ آج تک اُس نے کبھی بھی میرے ساتھ

اس طرح کی بدتمیزی نہیں کی تھی۔ کہنے لگا۔

"ماسٹر! بکواس نہیں کرنی۔ اگر تم نے بیگم صاحب کے بارے میں ایک لفظ بھی غلط کہا تو دھکا مار کر ٹرک سے نیچے پھینک دوں گا اور آئندہ زندگی بھر کے لیے دوستی ختم۔" میری ہنسی چھوٹ گئی تو وہ بولا۔ "بے غیرتی کسے کہہ رہے ہو۔ وہ تو فرشتہ ہے۔ میں نے اپنے دل میں اتنی پاکیزگی کبھی سگی ماں اور بڑی بہن کے لیے محسوس نہیں کی جتنی اس کے لیے محسوس کرتا رہا۔" مجھے اُس کی کایا کلپ پر حیرت ہو رہی تھی اور عجیب سی نظروں سے دیکھ کر تکنے لگا۔ اُس نے بائیں ہاتھ سے مجھے زوردار دھپ مار دی۔ مجھے فکر لاحق ہو گئی کہ وہ پھر کہیں ڈرائیونگ کرتے ہوئے کنٹرول نہ کھو دے اس لیے مزید چڑانے سے باز رہا۔

جانو کو لاہور راس آ گیا۔ دو تین ہفتوں کے وقفے سے چالان چٹ بنوائی اور فل لوڈ لے کر کلینر ہم راہ لیے لاہور چلا گیا۔ وہ اپنے ساتھ دیسی گھی، دیسی مرغیاں اور دیسی انڈے لے کر گیا۔ واپسی پر ہمیں معلوم ہوا کہ بیگم صاحب کو ملنے گیا تھا۔ اُن کا شکریہ ادا کیا۔ بیگم صاحب نے اُسے گڑیا کے لیے تحفے دے کر روانہ کیا۔

اگلے ماہ جانو کو ڈرائیونگ لائسنس مل گیا۔ اُس نے بتایا کہ میڈم نے لاہور سے جاری کروایا ہے۔ جانو اس کے بارے میں بات کرتا تو "باجی جی۔ باجی جی" کہہ کر یاد کرتا۔ ٹرک مالک نے جانو سے ایک ماہ کی مہلت مانگ رکھی تھی تاہم تین ہفتوں میں ہی اسے ایک اور ڈرائیور مل گیا تو جانو لاہور چلا گیا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ وہ میڈم کے پاس ملازم ہو گیا ہے۔ چند ماہ بعد وہ بیوی بچوں کو بھی ہم راہ لے گیا اور سننے میں آیا کہ کوٹھی کی انیکسی میں رہائش پذیر ہے۔

خبریں ہم تک پہنچتی رہتی تھیں کہ جانو اب ملک جان محمد بن چکا ہے۔ ایس ڈی ایم نے ملازمت چھوڑ دی ہے۔ لاہور سے دیگر شہروں تک بہت منفعت بخش روٹ

پرمٹ حاصل کر لیے ہیں اور ملک جان محمد کو ٹرانسپورٹ کی نگرانی پر مامور کر رکھا ہے۔ صاحب شراب کے نشے میں بہک کر کبھی کبھار زیادتی پر اُتر آیا کرتا لیکن جان محمد بڑی حکمت سے سنبھال لیتا۔ جان محمد کو وہاں بہت سی باتوں کا پتا چلا کہ صاحب کسی بڑے رئیس گھرانے کا بگڑا ہوا سپوت جب کہ بیگمؔ والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ وہ میڈیکل میں پڑھتی تھی کہ صاحب اُس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا۔ بیگم نچلے درجے کے متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ باپ نے دل پر پتھر رکھ کر اکلوتی بیٹی کا رشتہ دے دیا لیکن صاحب' بیوی سے محبت کرنے کے باوجود بھی کبھار وحشی ہو جاتا۔ نارمل ہونے پر کہا کرتا کہ وہ ویسے ہی بیوی کو مارتا ہے۔ اس پر تشدد کرنے سے مزا آتا ہے۔ بیگم نہ جانے ظلم کیوں برداشت کر لیتی تھی۔ ایک بار صاحب نے جانو کی موجودگی میں بیگم پر ہاتھ اُٹھایا تو جان محمد نے اسے دبوچ کر گھٹنوں کے نیچے دبا لیا۔ صاحب کو وارننگ دی کہ اگر آئندہ کبھی اُس کی بہن پر ہاتھ اُٹھایا تو وہ اس کی ٹانگ بازو توڑ ڈالے گا۔ صاحب حیرت سے اُس کا منہ تکنے لگا۔ جان محمد نے پھر اپنا عزم بڑے واضح اور صاف لہجے میں دہرا کر کہا کہ وہ زیادہ سے زیادہ اُسے تھانے میں بند کرا دے گا یا تھوڑی بہت سزا دلوا سکتا ہے لیکن ایک بات کان کھول کر سن لے کہ اُس کی بہن پر اُٹھنے والا ہاتھ وہ یقیناً توڑ دے گا۔ صاحب کے دل میں نہ جانے موج کی کیسی لہر اُٹھی کہ قہقہہ لگا کر بولا۔ ''اچھا جی سالا صاحب! معاف کر دیں' آئندہ کبھی بھی آپ کی بہن سے زیادتی نہیں ہو گی۔''

جان محمد نے ''بہن اور بہنوئی'' سے وفاداری کچھ اس حسن و خوبی سے نبھائی کہ مثال قائم ہو گئی۔ تاہم انہوں نے بھی اس کا حق ادا کر دیا۔ مختارِ کل بنائے رکھا اور تمام تر کاروبار' زرعی زمین اور جائیداد اس کی نگرانی میں دے دی۔ گڑیا کالج میں بی۔اے فائنل کر رہی تھی اور ہم نے سنا کہ وہ پڑھائی میں بہت لائق ہے۔ کار میں کالج آتی جاتی ہے۔

میں وایا بھٹنڈہ بی۔اے کرنے کے بعد ایک ایسے مضمون میں ایم۔اے کر چکا تھا' جس کا ذکر کرنے سے میرے وقار میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوگا' تاہم لیکچرار بن گیا۔ میرا بیٹا نشتر میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم تھا۔ میں جب بھی لاہور جاتا تو اپنے بچپن کے دوست جانو' لیکن لاہور کے ملک جان سے ملنے ضرور جایا کرتا۔ میڈم مجھ سے بھی سگی بڑی بہنوں کی طرح پیش آتیں۔

گزشتہ ہفتہ میں رات بھر کے لیے جان محمد کے پاس رک گیا تھا۔ وہ اب نسبتاً ایک بڑے اور پُر آسائش گھر میں رہائش پذیر تھا۔ قیمتی کار اس کے تصرف میں تھی اور میں نے دیکھا کہ گڑیا بغیر کسی پردے کے کالج جاتی ہے۔ وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ میرے دماغ میں شرارت والی رگ بُری طرح پھڑک رہی تھی۔ میں نے بڑی سختی سے اپنے آپ پر قابو پا رکھا تھا۔ تاہم بے اختیار اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اُسے کہوں کہ شیو کروانے کے لیے تیار رہے۔ لاہور میں یقیناً گدھا تا پید نہیں ہوگا۔ میرے چہرے سے شرارت جھلکتی محسوس کر کے جانو بولا۔ ''کوئی بکواس وغیرہ نہیں کرنا۔'' میں نے اُس سے کہا کہ نوجوانی میں ہم نے ایک وعدہ کیا تھا' اپنی اولاد کے بارے میں۔ وہ بولا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں اور اس رشتے کو ہمیشہ کے لیے جوڑنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ آئندہ تم باپ بیٹا اکٹھے ہمارے پاس آؤ اور ایک دو دن رہو تا کہ لڑکی اور لڑکا ایک دوسرے کو دیکھ کر فیصلہ کریں۔ میں نے بڑی بے ساختگی سے کہہ دیا۔ ''یار یہ بڑی بے غیرتی ہے۔'' وہ جھٹ بولا۔ ''بے غیرتی یہ ہے کہ ہم اولاد کی مرضی کو اپنے فیصلے میں شامل نہ کریں۔'' بے اختیار میری ہنسی نکل گئی اور اُسے ایک زوردار دھپ مارنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا لیکن وہ پہل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم دونوں کے ہاتھ چند سیکنڈ کے فرق سے ایک دوسرے پر پڑے اور قہقہے بلند ہوئے تو باہم بغل گیر ہو گئے۔

❋❋❋

کفایت

اب وہ عمر کے اُس حصے میں داخل ہو چکا تھا' جہاں عام ایشین اڑیسہ کی بجائے کموڈ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بیٹے کو دو تین بار اپنی مجبوری سے آگاہ کرتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا کہ کسی روز واش روم میں گرنے سے اس کی کوئی ہڈی ٹوٹ سکتی ہے۔ اُس کے بیٹے کی یہ خصوصیت تھی کہ انکار بھی نہ کرتا تاہم کرتا وہی جو اُس کی مرضی ہو۔

پوتے نے اولیول میں امتیازی پوزیشن حاصل کی تو گھر میں بڑی خوشی منائی گئی۔ آئندہ کے لیے اسے الگ سے آراستہ و پیراستہ کمرہ دینے کی منصوبہ بندی ہونے لگی تا کہ وہ آرام اور کامل یک سُوئی سے اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکے۔ وہ بہو اور بیٹے کی گفتگو کئی بار سن چکا تھا جو دراصل اسے سنانے کے لیے ہی کرتے تھے۔ وہ جان چکا تھا کہ اس کے زیرِ استعمال کمرہ بہت جلد خالی کرنا پڑے گا۔ چونکہ گھر میں پوتے کے لیے سب سے مناسب جگہ وہی ہے۔

آنے والے چند روز میں کچھ تعمیراتی سامان صحن میں ڈھیر ہونے لگا اور عقبی برآمدے کے دائیں جانب دیواریں کھڑی کر کے تقریباً 12x11 فٹ سائز کے ایک کمرے کی شکل دے دی گئی' جس سے متصل صحن میں ایک مناسب سائز کا واش روم بھی تعمیر کر دیا گیا۔ لگ بھگ تین ہفتوں کے عرصے میں کمرہ اور ملحقہ غسل خانہ تیار ہو گیا۔

وہ سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہا تھا تاہم لاتعلق اور حسبِ عادت خاموش رہا۔ کسی سے نہیں پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے اور اس قدر اہتمام کس لیے؟ جب سے وہ تنہا ہوا تھا کچھ نہ بولتا اور گھر میں ہونے والی کسی بھی سرگرمی کے بارے میں کبھی استفسار نہیں کیا۔ بہو اکثر گلا کرتی کہ ابا جی کو کسی سے کوئی دلچسپی نہیں۔

اس اثنا میں بہت سا قیمتی اور جدید طرز کا سامان سینٹری بھی گھر میں لایا گیا۔

بہت ہی خوبصورت اور ہلکے سے انگوری رنگ کا کپل سیٹ' میچنگ ٹونٹیاں' اسیسریز اور ٹائلیں۔ اسے خوش گوار حیرت کا احساس ہونے لگا کہ بیٹے سے صرف عام سادہ سا کموڈ لگوانے کی فرمائش ضرور کی تھی لیکن نہ جانے اس قدر محبت کیوں اچھلنے لگی کہ خواہ مخواہ کثیر رقم جدید طرز کے کپل سیٹ اور دیگر لوازمات پر خرچ کر ڈالی۔ حالانکہ بہو اور بیٹا اسے جتانے کے لیے اکثر و بیشتر مہنگائی اور محدود مالی وسائل کا رونا رویا کرتے تھے۔ تاہم اب اسے افسوس ہونے لگا تھا کہ بیٹے نے اس کی فرمائش پوری کرنے کے لیے نہ جانے کہاں سے اتنی رقم حاصل کی ہوگی۔ ایک بار سوچا کہ وہ انہیں مشورہ دے کہ یہ سب کچھ واپس کر دیں اور محض ایک سادہ سا کموڈ لگوا دیں۔ ٹائل اور دیگر لوازمات کی قطعاً کوئی افادیت نہیں۔ وہ اس موضوع پر بات کرنے کے لیے کسی مناسب موقع کا منتظر رہا۔ چونکہ باپ بیٹے میں شروع ہی سے ایک تکلف کی دیوار حائل رہی تھی اور بہو کا رویہ ہمیشہ سے اس کی سمجھ سے بالاتر رہا تھا۔ وہ کہہ کچھ رہی ہوتی جب کہ مطلب اور ہی ہوتا تھا۔

نیا تعمیر شدہ کمرہ تیار ہو گیا۔ اس میں ایک پرانا قالین بچھا کر چند کرسیاں اور ایک میز رکھ دی گئی۔ فرنیچر وہی رکھا گیا جو بہت عرصے سے گھر میں زیرِ استعمال چلا آ رہا تھا۔ وہ صحن میں پڑے موہڑے پر بیٹھا اخبار کے مطالعہ میں مگن ہوا رہتا۔ گویا لاتعلق سا ہو اور اسے کچھ خبر نہ ہو کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ کون کس سے کیا بات کر رہا ہے۔ بہو کو اکثر کہتے ہوئے سنتا۔ ''ابا جی نے کبھی رتی بھر دلچسپی گھر میں نہیں لی۔'' وہ چپ رہتا جیسے

کچھ سنا ہی نہیں۔ رفتہ رفتہ بچوں نے یہ باور کرلیا تھا کہ دادا ابو اونچا سنتے ہیں۔ بہو دھیمے لہجے میں بولتی۔ ''میں تو جانوں یہ بھی مچلا پن ہی ہے۔'' وہ سنتا کہ بیٹا اپنی بیگم کو بڑے دُلار سے ڈانٹ رہا ہے۔ ''خبردار! جو میرے ابا جی پر الزام دھرا...... نہیں تو'' ...... دونوں مسکراہٹوں کا تبادلہ کرتے ہوئے نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے پر واری صدقے ہورہے ہوتے۔

بہت عرصے سے اس نے یہ معمول بنا رکھا تھا کہ ناشتا کرنے کے بعد صحن میں اخبار کا مطالعہ کرتا اور پھر گھر سے نکل جایا کرتا۔ چند ایک دوستوں کے پاس وقت گزارتا اور دوپہر کو گھر لوٹ آتا۔ کھانا کھا کر ظہر کی نماز پڑھنے کے لیے قریبی مسجد میں چلا جاتا اور مغرب پڑھنے کے بعد ہی گھر آیا کرتا۔ اس دوران وہ مسجد کے قریب ایک دو ایسی دکانوں کے باہر رکھی ہوئی کرسیوں اور بینچ سے استفادہ کیا کرتا جن کے مالک ازراہِ تکلف اسے وہاں بیٹھنے سے منع نہیں کیا کرتے تھے۔ وہاں اسے مختلف اخبارات بھی مطالعہ کے لیے مل جاتے اور ایک کان سے رنگ رنگ کی باتیں بھی سنتا رہتا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ دکاندار اسے وہاں بیٹھنے سے روکتے نہیں مگر پسند بھی نہیں کرتے۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ جب بھی اسے منع کیا گیا تو بھی وہ برا نہیں منائے گا۔ تاہم دل ہی دل میں ان لوگوں کا شکر گزار ہوا رہتا کہ وہ سب وضع داری نبھا رہے ہیں اور اسے زبان سے کچھ نہیں کہتے۔

جب سے گھر میں توڑ پھوڑ اور تعمیر کا کام شروع ہوا تھا وہ زیادہ سے زیادہ وقت باہر ہی گزار رہا تھا۔ مسجد میں تبلیغی جماعت کے ارکان دورے پر آجاتے تو وہ دل ہی دل میں خوشی محسوس کرتا۔ کئی بار وہ اپنے اللہ سے ہم کلام ہوتے ہوئے کہتا۔ ''میں اپنی غرض کا بندہ ہوں۔ وقت گزارنے کے لیے تیرے گھر میں بیٹھا رہتا ہوں۔ تُو سب کچھ جانتا ہے کہ میری عبادت کے پسِ پردہ میری کچھ مجبوریاں ہیں۔ یہ سجدے جیسے بھی

ہیں اپنے پیارے کے صدقے میں قبول فرمالے۔"

ظہر کی نماز پڑھنے کے لیے وہ مسجد کے قریب پہنچا تو کارپوریشن کا ٹرک اور بہت سا عملہ وہاں کھڑا پایا جو مجسٹریٹ کی معیت میں دکانوں کے باہر پڑا ساز و سامان اُٹھا کر ٹرک میں ڈال رہا تھا اور دکاندار افراتفری میں اپنا بچا کھچا سامان سمیٹ رہے تھے۔ جس بینچ پر خاص طور پر وہ بیٹھا کرتا' کارپوریشن کے عملے کے ہاتھوں ضبط ہو چکا تھا۔ کچھ دیر وہ وہاں رک کر تماشا دیکھتا رہا اور پھر نماز ادا کرنے کے بعد وقت گزاری کے لیے موقع محل غیر مناسب جانتے ہوئے غیر ارادی طور پر گھر کی جانب چل پڑا۔

کسی کو خبر نہیں ہوئی کہ وہ کب گھر میں داخل ہوا ہے۔ وہ برآمدے میں نئے تعمیر شدہ کمرے میں چلا آیا۔ وہاں اس کی نظریں پلنگ پر ٹک گئیں۔ وہ شہاب ثاقب کی سی رفتار میں ماضی کی عمیق گہرائیوں میں گرتا چلا گیا۔ چالیس سال پہلے یہ اور اس جیسا ایک اور پلنگ وہ نیلام گھر سے خرید کر لایا اور دونوں اپنے مرحوم والدین کے کمرے میں رکھے تھے۔ اسی کمرے میں جو لاؤنج میں کھلتا ہے اور گھر میں نسبتاً سب سے اچھا ہے۔ اسی لیے اب اس کے پوتے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ پلنگ دونوں بہت اچھے لیکن استعمال شدہ تھے۔ ایک عرصہ تک اس کے دل میں یہ خلش ہوتی رہی تھی کہ اس نے اپنے بیٹے کے لیے نیا فرنیچر خریدا جب کہ ماں اور باپ کے لیے پرانے پلنگ لے آیا۔ اپنے اس اقدام پر اسے خواہ مخواہ ندامت کا احساس ہوتا رہا تھا حالانکہ اسے درست قرار دینے کے لیے اس کے پاس بہت سے دلائل تھے۔ وہ بہت جلد اپنے آپ کو قائل کر لیتا لیکن اگلے ہی لمحے خود کو اپنی ذات کی عدالت میں ایک مجرم کے طور پر کھڑا پاتا۔ اذیت اور ندامت کے اس دورانیے سے وہ رفتہ رفتہ ہی نکل پایا تھا تاہم اسے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے اُس نے بڑی ڈھٹائی سے خود آپ اپنا سامنا کیا ہو۔

غیر ارادی طور پر وہ باتھ روم میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہاں ایک کموڈ لگا ہوا

ہے۔ اُس نے نوٹ کیا کہ کموڈ کے پیچھے دیوار پر وہی پرانی پلاسٹک کی فلش ٹینکی لگائی گئی ہے جو اس کے سابقہ کمرے میں ڈبلیوسی کے ساتھ نصب ہوا کرتی تھی' جس کا ڈھکنا کنارے کے قریب جلتی ہوئی موم بتی رکھنے سے بہت عرصہ پہلے خراب ہو گیا تھا۔ وہ باتھ روم میں سے باہر نکل آیا اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ یہ پلنگ اس کی والدہ مرحومہ کے استعمال میں رہا تھا یا والد کے۔ چونکہ ضروری مرمت اور نئی پالش کے بعد اس کی حالت کچھ بدل سی گئی تھی۔ وہ نڈھال ہو رہا تھا۔ اسے ماں باپ بڑی شدت سے یاد آنے لگے۔ وہ اِس پلنگ سے اُن دونوں محبت بھری ہستیوں کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ اُس کا دل چاہا کہ وہ اِس پر سے پالش کی تہ کھرچ ڈالے تا کہ پرانی سطح نمودار ہو جائے' جسے وہ اپنی پوروں سے چھو لے۔ کپکپاتے ہاتھوں سے پلنگ کو سہلاتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے بدن سے جان ٹوٹ رہی ہے۔ وہ پلنگ پر دراز ہوا اور جوانی کے دور سے بھی پیچھے مزید تیں پینتیس سال ماضی میں اُتر گیا۔ چند سال کا بچہ' کبھی ماں کی آغوش میں تو کبھی باپ سے لپٹ کر اس کے بوسے لینے لگا۔ غنودگی کی کیفیت طاری ہونے لگی لیکن اسے آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''یہ بہت زیادہ رقم ہے۔ ایک باتھ پر اٹھائیس ہزار روپے خرچ ہو گئے؟...... میں نے کہا بھی تھا کہ ٹائلیں نہ لگوائیں۔ ابھی اُس کی فیس اور داخلہ جمع کرانا ہے۔''

''حد کرتی ہو۔ بیٹے سے زیادہ کون سی شے قیمتی ہے؟''

''ابا جی کے باتھ پر کتنا خرچ اُٹھا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔ سارا سامان پرانے باتھ والا کام آ گیا ہے۔ کموڈ سیکنڈ ہینڈ ہے۔ دکاندار نے چار سو روپے بل میں ڈال رکھے تھے۔ میں نے کاٹ لیے۔ بس وہی اٹھائیس ہزار ہی دیا ہے۔''

***

غنڈہ راج

گاؤں کے انتہائی مغرب میں کچھ دور ایک خوبصورت قطعۂ زمین پر نسل در نسل ایک ایسا خاندان آباد تھا جس سے کبھی کسی کو گزند نہیں پہنچا۔ وہ اپنے حال میں مست رہنے والے لوگ تھے اور انہیں گاؤں کے دور یا نزدیک کے کسی باسی سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ قدرت کو نہ جانے کیا منظور تھا کہ اس خطۂ امن کے باسیوں پر افتاد آن پڑی اور اچانک کہیں سے غنڈوں کا گروہ عذاب بن کر نازل ہوا۔ زمین کے بیٹوں کو خون میں نہلا کر یہاں کا مالک بن بیٹھا۔ سب کچھ اس کی دسترس میں آ گیا اور اس کے اصل وارث خاک کا رزق بن کر ناپید ہو گئے۔

کاش! گاؤں کے لوگوں نے غاصب غنڈوں کے اس گروہ کا ہاتھ بروقت روک لیا ہوتا تو ان کے حوصلے نہ بڑھتے اور آنے والے وقتوں میں ہر کوئی ان کی بدمعاشی کی زد میں نہ آیا ہوتا۔ بہت کم لوگوں نے اس بدقماش گروہ کے اصل عزائم کو سمجھا ہوگا۔ جو عقل وشعور رکھتے تھے وہ جان گئے کہ غاصبوں کا یہ ٹولہ نسل در نسل بدمعاش ہے اور ان کے خمیر کا یہ خاصہ ہے کہ اپنے سے کمزور اور زیر دستوں کو ملیا میٹ کر کے ان کے اثاثوں پر اپنے لیے آسائشوں سے مزین محل تعمیر کرتے ہیں۔ گویا غنڈہ گردی' لوٹ مار اور مار دھاڑ ان لوگوں کے خون میں گردش کر رہی تھی۔

غنڈہ عناصر نے اپنے ظلم وستم کا سلسلہ اڑوس پڑوس کی چھوٹی چھوٹی آبادیوں تک دراز کر دیا اور پہلے مرحلے پر گاؤں کے مضافات میں جہاں کہیں بس چلا دھونس

دھاندلی سے مال و زر سمیٹ کر گھر بھرنا اپنا وطیرہ بنا لیا۔ رفتہ رفتہ یہ لوگ مالی طور پر بہت مستحکم ہو گئے اور انہوں نے گاؤں والوں کو یہ تاثر دینا شروع کر دیا کہ وہ سب سے زیادہ مہذب اور معتبر ہیں لہٰذا انہیں اپنا سرپرست تسلیم کر لیا جائے۔

ماضی کے یہ کھلے غنڈے اس قدر شاطر تھے کہ بعض حلقے ذہنی طور پر ان کے زیر اثر آتے چلے گئے اور حقیقی معنوں میں انہیں افضل تصور کرنے لگے۔ پورے گاؤں کو زیر نگیں کرنے کی غرض سے بظاہر شریف لیکن باطن کے سکہ بند بدمعاش ہر جائز اور ناجائز حربہ بے دریغ استعمال کرنے لگے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے اپنے گھر کو جہاں عیش و عشرت کا گہوارہ بنا ڈالا وہاں آتش و آہن کے انبار بھی لگا دیئے۔

غنڈہ راج قائم کرنے کے لیے اگلے مرحلے پر انہوں نے گاؤں کے ایک ایسے مضبوط گھرانے کا انتخاب کیا جس کے بارے میں یہ باور کیا جاتا تھا کہ وہ ان کے مذموم مقاصد کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا کچھ دیگر لوگوں کو اپنی دوستی کا یقین دلا کر ساتھ ملا لیا اور اپنے مد مقابل کو مختلف سازشوں اور ہتھکنڈوں سے ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔

پورے گاؤں اور اس کی مضافاتی چھوٹی چھوٹی آبادیوں کے باسیوں میں سے کسی میں دم خم نہیں رہا تھا کہ وہ شرافت کا لبادہ اوڑھے ان غنڈوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو سکے۔ تاہم اکا دکا ایسے گھرانے باقی بچ رہے تھے جو اس کی بدمعاشی کے مقابل سر تسلیم خم کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے تو گاؤں کے دیگر لوگوں میں یہ مشہور کر دیا کہ وہ سب کی جان و مال کا تحفظ کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے رہے ہیں لہٰذا جس کسی کے گھر میں کسی قسم کا کوئی ہتھیار موجود ہو وہ ان کے حوالے کر دے اور چپ چاپ امن و امان سے رہے۔ زبردست کا ٹھینگا سر پر کے مصداق اس نے کھلے عام یہ عندیہ دے ڈالا کہ گاؤں کے مشرق شمال یا جنوب میں کہیں کسی بھی گھر میں ایسی کوئی معمولی سے معمولی شے بھی نہ ہو جو ضرر پہنچا سکے۔

اکثریت نے اپنی غیرت اور حمیت ان غنڈوں کے پاس گروی رکھ کر ہاتھ اٹھا دیئے اور زر خرید غلاموں کی طرح ان کے قدموں میں سر جھکا دیئے۔ گاؤں کے دور نزدیک کے کچھ چھوٹے غنڈے بھی ان بڑے بدمعاشوں سے مل گئے اور متفقہ فیصلہ کرلیا کہ وہ پورے گاؤں کو اپنے بیگار کیمپ میں بدل ڈالیں گے اور جو کوئی بھی اکڑ کر ان کے سامنے آیا وہ مل کر اس کو اتنے جوتے ماریں گے کہ وہ بلبلا اُٹھے گا اور ایک وفادار کتے کی طرح ہمیشہ کے لیے ان کی غلامی کا پٹا اپنے گلے میں ڈال لے۔

کسی میں دم خم نہیں رہا تھا۔ تاہم اِکا دُکا سر پھروں نے مستقبل قریب میں گاؤں پر مسلط ہونے والے اس متوقع غنڈہ راج کو کھلے بندوں قبول نہیں کیا اور خاموش رہے۔ غنڈوں کو یہ طرز عمل پسند نہیں آیا تو انہوں نے ہر ایک سے فرداً فرداً پوچھا کہ وہ اس کی بدمعاشی کو تسلیم کرتا ہے یا نہیں۔ جس نے بھی مثبت میں جواب نہیں دیا' غنڈوں نے کھلے بندوں اس گھر کو آگ لگا دی' مال و اسباب لوٹ لیا اور مکینوں میں سے بیشتر کو قتل کر دیا۔ بچوں کی ٹانگیں اور بازو کاٹ ڈالے' چہرے مسخ کر دیئے' اذیت ناک سزائیں دیں۔ نوجوان لڑکیوں کو اُٹھا کر اپنی سواریوں میں ڈال لیا۔ جن پر سوار ہو کر وہ انہی حرماں نصیبوں کے لواحقین کو کچل رہے تھے۔ گھر میں محفوظ پڑے پرکھوں کے ورثے اور توشہ خانہ میں جمع پونجی کو بے دردی سے لوٹ کر باقی جو کچھ بچا جلا کر خاکستر کر دیا۔ اپنے شکار کو نشانِ عبرت بنانے کے لیے ایسا مواد استعمال کیا کہ اس کا گوشت گل کر ہڈیوں سے الگ ہو گیا۔ آفت زدہ گھرانے کے بچے کھچے افراد نے جان کی امان کے لیے دامن پھیلا دیا تو غنڈوں نے خیرات میں انہیں زندگی کی بقیہ سانسیں لوٹا دیں اور بھیک کے طور پر انہیں جھوٹے نوالے پیش کرنے کی آس بھی دلائی۔

ایسی ننگی بدمعاشی کے شرمناک اور روح فرسا مظاہرے پر بھی گاؤں کے بیشتر لوگ ماسوائے چند ایک چپ رہے۔ غنڈوں نے انہیں باور کرانے کی کوشش کی کہ اہل

گاؤں کو کسی ان دیکھے خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے ہر اکڑفوں کی گردن توڑنا ازبس ضروری ہے۔ چونکہ اسی میں سب کی عافیت ہے۔

دراصل بڑے غنڈے کو اپنے ناجائز اور بگڑے ہوئے بیٹے کی فکر کھائی جا رہی تھی؛ جس نے کسی کے گھر پر غاصبانہ قبضہ کر لیا اور اڑوس پڑوس میں ہر ایک کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ بے گھر ہونے والے جھنجلاہٹ میں کبھی کبھار باہر سے اپنے سابقہ مسکن پر پتھر پھینک دیتے تو انہیں پکڑ کر سخت سزائیں دی جاتیں۔ مار مار کر ادھ موا کر دیا جاتا اور ناک رگڑنے کا حکم دیا جاتا۔ اڑوس پڑوس میں سے کوئی اس صریح ظلم پر احتجاج کرتا تو بڑا غنڈہ اپنے ناجائز بیٹے کی حمایت میں خم ٹھونک کر مقابلے پر اُتر آتا اور احتجاج کرنے والے کے خلاف سازشیں کرنے لگتا اور ہر پہلو سے اس کا ناطقہ بند کر کے رکھ دیتا۔

اپنی ناجائز اولاد کے قبضے کو ہر لحاظ سے مستحکم کرنے کے لیے غنڈے نے آس پاس کے ہر گھر کی تلاشی لینا شروع کر دی اور جہاں کہیں آوارہ کتّے کو دھمکانے کے لیے چھڑی بھی پائی گئی تو واویلا کھڑا کر دیا کہ اس سے گاؤں والوں کو گزند پہنچنے کا احتمال تھا۔ غنڈے کی دہشت اس شدت سے قائم ہو گئی کہ بے گھر ہونے والے مظلوموں کے قریبی رشتہ دار بھی غنڈے کے ہم نوا ہو گئے۔ ماسوائے اِکا دُکا گھرانوں کے گاؤں کے تمام لوگوں میں سے کسی نے ذرا برابر بھی غیرت اور حمیت کا مظاہرہ نہیں کیا تو غنڈے کا تکبر آسمان کو چھونے لگا اور اس نے حکم دیا کہ جو ایک دو خودسر بچ رہے ہیں ان کی مشکیں کس دی جائیں۔ چونکہ اب اسے روکنے والا کوئی نہیں رہا تھا اس لیے اس کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ جن خودسروں کو باندھ کر اس کے قدموں میں ڈالا گیا' ان کے بازو کندھوں کے قریب سے کاٹ دیئے گئے۔

بہت ہی جلد یہ رسم عام ہوئی کہ غنڈے کی ناجائز اولاد کے ایما پر اڑوس پڑوس والوں کو صبح دوپہر شام قطار میں کان پکڑوائے جاتے اور انہیں دو دو جوتے مار کر گھر بھیج

دیا جاتا۔ جنہوں نے کان پکڑنے سے انکار کیا تھا ان کے بازو کاٹ ڈالے گئے۔ اب اس گاؤں میں امن ہی امن قائم ہو گیا تھا چونکہ یہاں صرف تین طبقے بچ رہ گئے تھے ایک غنڈوں پر مشتمل؛ جس کا راج قائم ہو چکا تھا۔ دوسرا وہ جس کے ارکان حکم ملتے ہی رضاکارانہ آ کر قطار میں اس طرح جھک جاتے کہ سرزمین کو چھو رہے ہوتے اور پیٹھ اِس زاویے سے اُٹھائے رکھتے کہ جُوتے مارنے والے کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے۔ تیسرا مختصر سا گروہ ٹنڈوں پر مشتمل تھا۔

❋❋❋

سانولی سلونی

وہ دونوں آپس میں خالہ زاد تھے۔ ہم عمر' قریباً اٹھارہ سال کے۔ ایک کا نام عطا محمد اور دوسرے کا فتح محمد تھا۔ لیکن بگڑ کر عطنہ اور پھتنہ بن گیا تھا۔ وہ جیسے ایک دوسرے کا لازم وملزوم ہوں' ہر وقت اکٹھے۔ قریباً ایک جیسی شکل وصورت' اچھا قد کاٹھ' سانولی رنگت اور پُرکشش ناک نقشہ۔ دونوں بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ دریا کے شمالی کنارے پر میلوں تک پھیلا ہوا وسیع بیلا ان کے تصرف میں تھا۔ جہاں ان کے لوک گیت فضاؤں میں بکھرا کرتے تھے۔ بظاہر وہ ہر وقت خوش اور ہنستے کھیلتے رہتے لیکن اکثر ایسے لوک گیت اور دوہے گایا کرتے کہ سننے والوں کے دل غم سے معمور ہو جاتے۔ شاید ان کے دلوں میں کوئی ان کہی بے نام اداسی سرایت کر چکی تھی یا فطرت نے ہی ان کی روحوں میں سوز ایک عنصر کے طور پر شامل کر رکھا تھا۔

دریا جب باڑھ پر ہوتا تو جنوبی کناروں سے اُمنڈ آیا کرتا لیکن شمالی کناروں پر بکھرے بلند ٹیلوں پر کبھی بھی مار نہ کر سکا۔ عطنہ پھتنہ اور ان کا مختصر سا خاندان یہاں قریباً سو سال سے آباد تھا۔ یہاں سے دو اڑھائی کوس دور آج جو بہت بڑا قصبہ تھا وہاں کبھی ایک گاؤں آباد ہوا کرتا تھا جس کے باہر بڑی سی کچی سڑک کے کنارے پرانے بڑ کے قریب غلام رسول لوہار رہتا تھا' جو عطنے اور پھتنے کی نانی کا بھی نانا تھا۔ وہاں ہی اُس نے ایک کچی سی مسجد بنائی ہوئی تھی جس کے ساتھ ایک بڑا کشادہ چھپر تھا۔ عقب میں دو

رہائش کرے تھے۔ مستطیل نما چھپر کی عقبی دیوار کے ساتھ بھٹی اور مختصر سی ورکشاپ بھی قائم تھی۔ چھپر تین اطراف سے کھلا تھا۔ سامنے کی طرف سے دو موٹی سی چوبی بلیوں کو گاڑ کر چھت کو سہارا دیا گیا تھا' جیسے دو ستونوں والا بڑا سا برآمدہ ہو۔

گاؤں کے لوگوں کو پیشہ ورانہ خدمات دینے کے علاوہ غلام رسول گھوڑوں کے نعل بھی لگایا کرتا تھا۔ وہ ایک دیندار شخص تھا اور کچھ حرف شناس بھی۔ تندرست اور مضبوط جسم کے مالک اس شخص کی بیوی اپنے پیچھے ایک بیٹی چھوڑ کر مر چکی تھی۔ غلام رسول نے اپنی بیٹی کو بڑی محبت سے پالا تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے دن کا زیادہ وقت اُس کے پاس گزارتے۔ کام کاج سے فارغ ہو کر وہ اپنے ہم نشینوں کو قصے کہانیاں اور مذہبی کتابیں پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ اُس کے بزرگ دوست اُس سے بہت متاثر تھے۔ پچھلے پہر کی تینوں نمازیں اکثر اُس کی امامت میں پڑھا کرتے لیکن اندھیرا پھیلنے سے قبل ہی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تھے۔

سردیوں کی ایک کہر یلی رات کا آغاز ہوا تو سر شام ہی تاریکی پھیل گئی۔ سردی خلاف معمول بہت زیادہ ہو گئی۔ چراغ بتی کا وقت ہوتے ہی غلام رسول کے بوڑھے دوست گھروں کو جا چکے تھے۔ غلام رسول مسجد میں سرسوں کے تیل سے بھرے مٹی کے دیوں میں ہاتھ سے بٹی رُوئی کی بتیاں سلیقے سے رکھ کر روشن کر چکا تھا۔ اب وہ اپنی چھپر نما دکان میں سامان سمیٹ رہا تھا۔ اُس کی بیٹی زینب' بھٹی میں سے آگ لینے آئی تا کہ کمرہ گرم کر سکے۔

اسی لمحے باہر کچی سڑک پر دلکی چال چلتے گھوڑوں کے سموں کی دھمک سنائی دی۔ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز غلام رسول کے احاطے کے بغیر کواڑ والے کھلے در کے سامنے آ کر معدوم ہو گئی۔ گھوڑے کی بڑی زوردار ہنہناہٹ سنائی دی اور ساتھ ہی کسی اجنبی کی پاٹ دار آواز گونجی جس میں کھنک تھی' تاہم لہجہ خالص دیسی تھا۔

"یہ غلام رسول لوہار کا گھر ہے؟"...... ساتھ ہی یکے بعد دیگرے تین گھوڑ سوار اندر آ گئے۔ زینب لوہے کے پترے پر دہکتے انگارے رکھ چکی تھی جن کی آتشی گلابی لو میں اُس کا سرخ عنابی چہرہ دمک رہا تھا۔ گو چھپر میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا لیکن اُس نے فوراً ہی سر سے چادر کھسکا کر چہرہ ڈھانپ لیا اور رہائشی کمروں کی جانب پلٹ گئی۔ غلام رسول نے جلدی سے چراغ روشن کیا اور اجنبیوں کی جانب بلند کر کے آنکھیں میچ کر انہیں دیکھنے لگا۔ وہ تینوں وردی پوش تھے۔ غلام رسول جان گیا کہ ان میں سے ایک انگریز نوجوان فوجی افسر ہے اور اس کے دونوں دیسی ساتھی عہدے کے لحاظ سے سپاہی ہیں۔

"جی فرمائیں' کیا حکم ہے؟"...... اُس نے جواب میں کہا۔

"لفٹین صاحب کے گھوڑے کا نعل لگانا ہے۔"...... ان میں سے ایک نے بارعب آواز میں کہا...... "جلدی کرو' ہمیں بہت دور جانا ہے۔"

"آپ یہاں کچھ دیر آرام کریں۔" غلام رسول نے دیوار کے ساتھ لگی دونوں چارپائیاں زمین پر بچھاتے ہوئے کہا...... "میں دکان سمیٹ چکا ہوں۔ نماز کا وقت نکلنے کو ہے۔ میں فارغ ہو کر نعل لگا دوں گا۔"

"ویل مسٹر گلام (غلام) تم پہلے نعل لگائے گا"...... انگریز لیفٹیننٹ نے تنک کر کہا...... "ہم جلدی جانا مانگتا۔"

"صاحب! میرا نام غلام رسول ہے غلام نہیں۔"...... غلام رسول نے تحمل سے جواب دیا...... "پہلے اللہ کا حکم بجا لاؤں گا پھر کسی اور کا۔"

اس جواب پر گویا لیفٹیننٹ کا ننگا پاؤں بھٹی کے دہکتے انگاروں پر آن پڑا ہو۔

"تم کیا بک بک کرتا گلام کا بچہ!" وہ دھاڑا...... اور اس دریدہ دہن شخص نے اپنے میزبان کے نام کا دوسرا حصہ ایسے بگاڑا کہ غلام رسول نے بجلی کے کوندے کی طرح لپک کر اسے گھوڑے سے نیچے گرا لیا اور ایک ہی جھونک میں بھٹی پر پھینک دیا۔ بھٹی میں

بچے کھچے دہکتے کوئلوں نے لیفٹیننٹ کے جسم پر منڈھی برجس کے کپڑے کو ایک مخصوص مقام پر سے خاکستر کر کے جلد کو داغ دیا۔ وہ بلبلانے لگا لیکن اس اثنا میں دونوں سپاہی غلام رسول کو قابو کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ اسے دھکیلتے ہوئے چھپر کے کنارے تک لے گئے' جہاں چھت کے سہارے کے لیے چوبی بلی کھڑی تھی۔ سپاہیوں نے غلام رسول کو بلی کے ساتھ کھڑا کر کے اُسی کی پگڑی سے جکڑ دیا۔ لیفٹیننٹ بھی اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے آن واحد میں طمنچہ نکال کر اس کی ڈیڑھ فٹ لمبی نال غلام رسول کے سینے پر رکھ دی۔ وہ جسمانی اذیت کا شکار تھا۔ انگشت شہادت کو ٹرائیگر پر ٹکا کے دبانے ہی والا تھا کہ معاً کسی خیال سے ایک دم ساکت ہو گیا۔ تکلیف میں ہونے کے باوجود مسکرایا اور طمنچہ ہٹا لیا۔

"او۔ نو۔ یو بلڈی گلام۔" ...... وہ خباثت سے بولا ...... "ہم تم کو نہیں مارے گا۔ دس نائٹ ہم تم کو فادر اِن لا بنائے گا۔ تمہارا بیٹی اور تم خوش ہوئینگا۔ انگریز کے ساتھ...... ٹھیک ہے۔"

"ویل جوان۔" ...... وہ قدرے توقف سے اپنے سپاہیوں کو مخاطب کر کے بولا ...... "گلام کا لونڈی اِدھر لاؤ۔"

دونوں سپاہیوں کے پاؤں جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے اور وہ ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔ اسی لمحے غلام رسول نے اپنے دونوں پاؤں کی ایڑیاں زمین پر مضبوطی سے ٹکائیں اور اپنے آہنی جسم کی پوری قوت صرف کر کے پشت سے لگی ہوئی ایستادہ چوبی بلی کو ایک زوردار دھکا دیا۔ بلی کا اوپر والا سرا چھپر کے نیچے سے کھسک گیا۔ غلام رسول لکڑی سے بندھا بندھایا شہتیر کی مانند کھلے صحن میں جا گرا جب کہ چھت اُس کے مدِ مقابل تینوں دشمنوں کے سروں پر آن پڑی۔ زینب ہاتھ میں روشن لالٹین لیے دوڑتی ہوئی باپ کے پاس پہنچی اور پگڑی کے بل کھول کر اسے بلی سے آزاد کرایا۔ غلام

رسول نے لپک کر لالٹین کو ہاتھ میں لیا۔ اس کی بتی اتنی زیادہ اونچی کر دی کہ روشنی کی بجائے چمنی میں سے کثیف دھواں اور شعلہ برآمد ہونے لگا۔ اگلے ہی لمحے دھواں اور شعلے اُگلتی لالٹین زمین بوس چھپر پر پھینک دی تو سرکنڈوں نے آناً فاناً آگ پکڑ لی۔

صبح ہوتے ہی دریا کے کنارے بیلے میں آباد چرواہوں کے ڈیرے پر ایک نوجوان سے زینب کا نکاح غلام رسول نے خود پڑھایا۔ اس کے بعد وہ روپوش ہو گیا۔ اصل واقعات کا کسی کو علم نہیں ہو سکا تھا۔ ہر طرف یہی خبر مشہور ہوئی کہ غلام رسول لوہار نے کسی بات پر جھگڑا بڑھ جانے کی وجہ سے انگریز لفٹین اور اس کے ساتھی دونوں دیسی سپاہیوں کو جلا کر ہلاک کر دیا۔ پولیس نے اسے بہت تلاش کیا لیکن کہیں سراغ نہ ملا۔ بالآخر انگریز سرکار نے اس کے سر کی قیمت ایک ہزار روپے مقرر کر دی۔ دس سال کا عرصہ گزر گیا۔ غلام رسول شاید کبھی نہ پکڑا جاتا لیکن وہ کہتے ہیں کہ سر جائے تو جائے' عادتیں نہیں جاتیں۔ عید قربان کے نزدیک وہ شہر میں بکرے فروخت کرنے آیا' تو چوک میں کھڑے ایک دوسرے بکروال کی نئی خرید کردہ کلہاڑی کے پھل کا لوہا جانچنے کے لیے زبان سے چاٹ کر بولا۔ ''یہ میٹھا لوہا ہے۔''

ملک حاکم خان نے غور سے دیکھا۔ سفید داڑھی میں گھرا ہوا چہرہ کچھ جانا پہچانا لگا اور زبان سے چاٹ کر لوہے کی خاصیت بتانے پر ذہن فوراً دس سال پیچھے چلا گیا۔ انگریز سے اپنی دوستی اور وفاداری نبھانے کا نادر موقع سامنے پا کر بکرے خریدنے کا پروگرام ملتوی کر دیا اور آگے بڑھ کر غلام رسول کو کولی میں بھر لیا۔ ساتھ آنے والے اپنے دیرینہ خادموں کو ہوشیار کرنے کے لیے باآواز بلند پکارا۔ ''قابو۔''

غلام رسول اتنا ہی جانتا تھا کہ ملک حاکم خان اس کے آبائی گاؤں کا مالک اور علاقے کا معزز شخص ہے جسے ضلع کچہری کے علاوہ ہر سرکاری دفتر میں کرسی پیش کی جاتی ہے۔ اسے کیا خبر تھی کہ اپنے علاقے سے کئی سو کوس دور اتنے بڑے شہر میں ملک حاکم

خان سے مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔ دراصل یہاں شہر میں بھی ملک حاکم خان کی رہائش گاہ تھی جہاں اس نے اپنی شہری بیوی کو رکھا ہوا تھا۔

غلام رسول کے خلاف بغاوت' ایک فوجی افسر اور دو جوانوں کے قتل کا الزام تھا۔ مقدمے کی کارروائی بڑی سرعت سے مکمل ہوگئی۔ ملزم کے پاس کوئی وکیل' دلیل اور اپیل کی گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ کسی کو خبر نہ ہوئی کہ غلام رسول پر آخری لمحے کیسے گزرے۔ تاہم جب اُس سے آخری خواہش پوچھی گئی تو اُس نے کہا:

''میری ایک ہی سب سے بڑی اور آخری خواہش ہے کہ میرے علاقے سے کافرنکل جائے۔''

اس نے اپنے پسماندگان کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ گاؤں سے فرار ہو کر جب وہ بیلے میں پہنچا تھا اور اپنی بیٹی زینب کو ایک وفادار اور قابلِ اعتماد سہارے کے سپرد کر کے روپوش ہونے لگا تو اُس نے سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ خواہ وہ زندہ رہے یا سزا پا جائے' کبھی بھول کر بھی کوئی اس سے اپنا رشتہ ظاہر نہ کرے۔ اُسے معلوم تھا کہ غیر ملکی آقاؤں سے زیادہ کمینے دشمن اس کے اپنے وہ ہم وطن ہیں جو انگریز پرست ہیں۔ وہ اس کی اپنی زمین خود اس کے لیے اور اس کی آل اولاد کے لیے تنگ کر دیں گے۔

عطے اور بھتے کو معلوم تھا کہ وہ چاروں بہن بھائی غلام رسول لوہار کی بیٹی کے بطن سے ہونے والی اولاد میں سے ہیں۔ یہ کہانی نانیوں پر نانیوں سے مرحلہ وار سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھی۔

اب وہ نسل در نسل چرواہوں کا ایک بے ضرر اور بے نام سا خاندان بن چکا تھا۔ ان کے ماں باپ کسی ایک ہی طرح کی بیماری سے یکے بعد دیگرے مر چکے تھے۔ دونوں کی ایک ایک بہن تھی جو ہم عمر تھیں۔ دونوں کی عمریں قریباً سولہ برس تھیں۔ بزرگوں میں صرف نانی زندہ تھی' جس نے عطے کی بہن کو بھتے اور بھتے کی بہن کو عطے

سے منسوب کر رکھا تھا۔ اب ان کا کوئی دشمن اس سرزمین پر نہیں رہا تھا۔ وطن کب کا آزاد ہو چکا تھا۔ انگریز سات سمندر پار جا کر اپنی حدود میں سمٹ گیا تھا۔

تاریخ کے جبر نے غلام رسول لوہار کے نام پر بغاوت کا داغ لگا کر اسے گم نامی کی تاریکیوں میں گم کر دیا تھا۔ جب کہ ملک حاکم خان کا خانوادہ مسلسل ترقی اور شہرت کی منزلیں طے کرتا رہا۔ وہ اب ملک نہیں بلکہ خان بہادر کہلاتے تھے۔ انگریز کے دور میں اپنے گاؤں اور علاقے میں ان کا سکہ چلتا تھا۔ لیکن جوں ہی آزادیٔ وطن کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آیا تو خان بہادر گھرانہ لپک کر لشکرِ حریت کے ہراول دستے کے ساتھ شانے سے شانہ ملا کر چلنے لگا۔

اب پورے صوبے میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ خاندان کے تعلیم یافتہ افراد بڑے بڑے عسکری و سول عہدوں پر فائز تھے۔ جو پڑھائی میں نالائق ثابت ہوئے وہ سیاست میں عملی کردار ادا کرنے میں پیش پیش ہوتے۔

خان بہادر خانوادے کے آدھے افراد وطن کی خالق سیاسی جماعت کے ساتھ ہوتے اور بقیہ وفاقی سطح کی دوسری بڑی سیاسی قوت سے وابستہ رہتے۔ ملک میں حالات خواہ کیسے ہوں اس خاندان کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ خان بہادروں کے مقدر میں اقتدار لکھا جا چکا تھا۔ عزت' شہرت' دولت' طاقت' اقتدار اور دبدبہ ایک زرخرید لونڈی اور زبان کٹے زرخواہ غلام کی طرح ان کے ایوانوں کی غلام گردشوں میں ہر دور کے اندر ہمہ وقت ہاتھ باندھے' سر جھکائے کھڑا رہتا تھا۔ کئی عشرے پہلے اس شاہراہ پر جہاں کبھی گاؤں کے باہر بوہڑ کے پاس غلام رسول لوہار آباد تھا' اب وہاں ایک اچھا خاصا بارونق قصبہ بس چکا تھا جس کے مضافات میں بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔

خان بہادر گھرانے کے دم سے اس قصبے کو تحصیل ہیڈ کوارٹر کی حیثیت حاصل ہوئی اور یہی علاقہ ان کا انتخابی حلقہ بھی تھا۔ آس پاس کے دیہاتوں سے اس جانب

ہونے والی مسلسل نقل مکانی اور آبادی میں روز افزوں اضافے کے باعث جاری وسعت پذیری کے نتیجے میں بیلے کا فاصلہ سمٹ کر رہ گیا۔ دور نزدیک ڈیروں کی عورتیں بیر پیلوں لسوڑے اور ڈیلے قصبے میں بیچنے آ جاتی تھیں۔ عطنے اور پھتنے کی دونوں بہنیں بھی کبھی کبھار دیگر عورتوں کے ہم راہ کچھ ایسے ہی موسمی پھل بیچنے آ جایا کرتی تھیں لیکن زیادہ تر مضافات میں ہی اپنا سودا بیچ کر گھر لوٹ جاتیں۔

بیلے کی جانب سے قصبے میں داخل ہونے والا کچا راستہ آبادی کے قریب امرا کے محلوں کے قدموں میں بچھتے ہی کشادہ اور پختہ سڑک کا روپ اختیار کر لیتا تھا۔ یہاں آباد مقامی سول انتظامیہ کے حکام اور سیاسی رہنما یعنی خان بہادر خاندان کے مختلف گھرانے باہمی رواداری محبت اور یگانگت کے جذبات سے سرشار رہائش پذیر تھے۔ انہی میں سے ایک کوٹھی کے مقیم سردار خان کے منجھلے سپوت نے دوستوں کے ساتھ مل کر عطنے اور پھتنے کی بہنوں کو اُچک لیا تھا۔

نانی نے اپنے چاندی بالوں میں خاک ڈال کر بوڑھا سینہ اس بے دردی سے پیٹا تھا کہ بے ہوش ہوگئی۔ ''او میریا ربا! ہم اپنے ہی دیس میں لٹ گئے:''

عطنے اور پھتنے کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں' کس کا دامن پکڑیں' انصاف کے لیے کس در پر دستک دیں۔ چراگاہوں میں ریوڑ ہانکتے ہوئے جو سریلے لوک گیت وہ الاپتے تھے' سب بھول گئے۔ ان کے ہونٹوں نے مسکرانا چھوڑ دیا۔ دل مرجھا گئے۔ بہنوں اور منگیتروں سے نظریں چرائے پھرتے۔ نانی سے کہتے: ''اماں! ہماری مائی زینب کی طرف صرف میلی آنکھ اُٹھی' ہمارے بزرگ غلام رسول نے چھوڑ دی۔ اب تو سب کچھ برباد ہوگیا ہے۔ ہم انہیں معاف نہیں کریں گے۔''

''وے میرے بچیو!''...... بدنصیب بوڑھی عورت رو رو کر کہتی...... ''وہ ایک صاحب تھا' یہاں بے شمار صاحب ہیں' تم کس کس سے لڑو گے؟''

نانی کو بہت جلد انصاف مل گیا۔ خدا نے بلا لیا اور وہ سرخرو ہو گئی۔

وہ جولائی کی آگ برساتی ایک سہ پہر تھی' دو اڑھائی کا وقت ہو گا۔ چرند پرند بھی کہیں سایوں میں دبکے ہوئے تھے۔ ملک سردار خان شہر میں تھا۔ گھر کے دیگر نوجوان اپنے من پسند مشاغل میں مشغول گھر سے کہیں دور تھے۔ عطنہ اور بھتنہ اس کوٹھی کے پچھواڑے سے دیوار پھاند گئے' جس کے اگواڑے کے ایک کمرے میں چھوٹے خان بہادروں نے ان کی عزت کا خون کیا تھا۔ برآمدے میں سے گزر کر سیدھے ہاتھ پر پہلے کمرے میں دو خواتین بے سدھ سوئی پڑی تھیں۔ ان میں سے ایک بڑے خان بہادر ملک سردار خان کی بیٹی اور دوسری سالی تھی۔ دونوں یونیورسٹی کی طالبہ تھیں اور موسم گرما کی تعطیلات پر گھر آئی ہوئی تھیں۔ عطنہ اور بھتنہ جنگلی بھیڑیوں کی طرح وحشی بن چکے تھے۔ انہوں نے اس بری طرح سے ان دونوں کو خوفزدہ کیا اور شکنجے میں جکڑا جیسے فاختائیں شکروں کے مقابلے میں بے بس ہو جاتی ہیں۔

اگر کسی عورت کی مت واقعی کھری تلے ہوتی ہے تو وہ یقیناً بڑی ملکانی سردار خان کی بیوی تھی۔ اُس نے فون کر کے پولیس بلوالی۔ نوکرانیوں نے رسوائی کی بات ہر سُو پھیلا دی۔ خان بہادر کا خاندان یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یوں ان کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ بالفرض ایسا ہو بھی گیا ہوتا تو بڑی آسانی سے دونوں لڑکوں کی لاشیں بیلے میں کہیں گل سڑ گئی ہوتیں۔

عطنہ بھتنہ گرفتار ہوئے تو تھانیدار کو ساری حقیقت کا علم ہو گیا۔ وہ عجب سر پھرا شخص کچھ ہی عرصہ قبل یہاں تعینات ہوا تھا۔ شائد کسی قائد کے اقوال و فرمان دل پر زیادہ ہی اثر انداز ہو گئے تھے۔ قائد کی تصویر اپنے دفتر میں دیوار پر آویزاں کر رکھی تھی۔ سر میں سودا سما گیا کہ زمانے کا چلن بدل دے گا۔ عطنے بھتنے جیسے نارسا لڑکوں کے ایک بیان پر یقین کر لیا اور دوطرفہ پرچہ کاٹ کر نوجوان خان بہادروں کی گرفتاری کے لیے

چھاپے مارنے شروع کر دیے۔

تہلکہ مچ گیا اور انتظامیہ ہل گئی۔ صوبائی حکومت کے ستون تھر تھر کانپنے لگے۔ اسمبلی میں تحریکِ استحقاق پیش ہوگئی کہ تھانیدار نے مخالف سیاسی شخصیت سے بھاری رشوت کے عوض غیر اخلاقی جرائم کے دوطرفہ من گھڑت مقدمے درج کیے۔ سرے سے ایسا کوئی جرم ہر دو طرف سے ہُوا ہی نہیں۔

تھانیدار کی منطق نرالی تھی۔ وہ کہتا کہ قانون سب کے لیے برابر ہے۔ جرم دونوں طرف سے ایک جیسا ہوا ہے۔ سزا دونوں پارٹیوں کو قانون کے مطابق ملنی چاہیے۔ عزت ہر شہری کی محترم ہے۔ بھلا عزت ہر شہری کی برابر کیسے ہوسکتی ہے؟ ایک طرف علاقے کا سیاسی راہنما' حکومت کا ستون' انگریز کے زمانے کا معزز خان بہادر' دوسری جانب دو چرواہے۔ بھلا ملک سردار خان کی بیٹی اور سالی دونوں' جنگل کی باسی دو گنوار لڑکیوں کے ساتھ ایک ترازو میں برابر تل سکتی ہیں؟ وہ بھی ایک معمولی تھانیدار کے ہاتھوں؟ غضب خدا کا' ایسا اندھیرا کبھی دیکھا نہ سنا' گویا قربِ قیامت کے آثار نمایاں ہوئے ہیں۔

تھانیدار کی اسی بات پر سردار خان کے نتھنوں' منہ اور کانوں سے دھواں اور آنکھوں سے شرارے پھوٹنے لگتے۔ مقامی انتظامیہ کے افسران کا بھی یہی موقف تھا۔ ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اقرار کرتے کہ تھانیدار سراسر زیادتی کر رہا ہے۔ معززین کی پگڑیاں اچھال رہا ہے اور یہ سب کچھ وہ مخالف سیاسی خاندان کے ایما پر کر رہا ہے۔ بڑی ڈھٹائی سے کہتے کہ جو لڑکیاں ڈیروں سے شہروں میں آتی ہیں' بیر بیچنا ایک بہانہ ہی ہوتا ہے۔ وہ خود رنگین مزاج لڑکوں کی تلاش میں ہوتی ہیں اور بڑے لوگوں کے لڑکے نوجوانی میں ایسے شغل میلے کرتے ہی رہتے ہیں۔ بالفرض خان بہادر لڑکوں نے زبردستی کر ہی ڈالی تھی تو مٹی ڈال دی جاتی۔ لڑکیوں کے بھائیوں کو کچھ دے دلا کر یا

ذرا دھمکا کر مسئلہ حل کرنا چاہیے تھا۔ یہ سب تھانیدار کی ناقص حکمتِ عملی کی وجہ سے ہوا کہ اتنا گند اچھلا۔ عطے پھتے جیسے لڑکوں کو یہ جرأت نہیں ہونی چاہیے تھی کہ وہ شرفا کے گھروں میں گھس کر عزت و ناموس لوٹ لیں۔ اس طرح بنا بنایا معاشرتی سیٹ اپ تباہ ہو جائے گا۔

بالآخر تھانیدار معطل ہو گیا۔ نئے سرے سے انکوائری ہوئی تو خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ ثابت ہوا کہ سابقہ تھانیدار کے دور میں درج ہونے والے دونوں کیس من گھڑت اور کسی گہری سازش کا شاخسانہ تھے۔ دونوں جانب سے کوئی بھی ایسا شرمناک جرم سرے سے ہوا ہی نہیں تھا۔ البتہ بیر بیچنے والی دونوں لڑکیوں نے کوٹھی کا مہمان خانہ خالی پا کر کچھ نقدی اور گھڑیاں چوری کر لی تھیں اور انہی کی مخبری پر بعد ازاں دونوں چرواہوں نے گھر میں ڈاکا ڈالا تھا۔ نئے تھانیدار نے چرواہوں کے ڈیرے پر چھاپہ مار کر کچھ برآمدگیاں بھی کر لیں۔ اس کے علاوہ نو انچ لمبے پھل والے دو خنجر' کلہاڑیاں' برچھی' ایک ممنوعہ بور کا ریوالور بمعہ پانچ عدد ولایتی گولیوں کے برآمد ہو گیا۔

نئے تھانیدار کی اعلیٰ کارکردگی اس کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ پریس ریلیز کے مطابق کچھ عرصہ سے گھروں میں ہونے والی چھوٹی موٹی چوریوں کا سراغ مل گیا تھا۔ دونوں لڑکے سابقہ کیس سے رہا ہوئے لیکن چوری کے جرم میں بند کر لیے گئے۔ دونوں مجرم لڑکیاں بھی پابند ہوئیں۔ عطے پھتے کو آئندہ کے لئے پُرامن اور قانون پسند شہری بنانے کے لئے سبق سکھانا ضروری تھا۔ لہٰذا دورانِ تفتیش کچھ تھرڈ ڈگری ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑے۔ دونوں کے سامنے لڑکیوں کو بے لباس کیا گیا اور جلتی ہوئی دیا سلائیوں سے فاضل بال جلا ڈالے گئے۔ نوجوان لڑکوں کے دماغ میں پرورش پانے والے بغاوت اور شر کے جراثیم یکسر نیست و نابود ہو گئے۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر دونوں لڑکوں کو مردانہ صفات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا گیا' تا کہ آئندہ کسی

شریف شہری کی عزت برباد ہونے کا احتمال ہی نہ رہے۔ تھانیدار نے سارے معاملات ایسی چابک دستی اور مہارت سے نپٹائے کہ تمام معززینِ علاقہ' افسرانِ بالا بشمول سردار خان اور دیگر ہمعصر سیاسی و سماجی راہنما' عش عش کر اُٹھے۔ اُس کی صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر تعریفی اسناد' نقد انعام' سرکاری و غیر سرکاری ذرائع سے عطا کیے گئے اور ترقی کی پرزور سفارش کی گئی۔

ملک سردار خان کوئی ایسا بھی ظالم شخص نہیں تھا۔ وہ بہر حال ایک عظیم سیاسی و سماجی شخصیت تھی۔ "فادر آف دی سٹی" یعنی کہ شہر کا باپ کہلاتا تھا۔ اسے اپنے علاقے کے مفلس نادار اور بے سہارا لوگوں کا بڑا خیال رہتا۔ اُس نے اپنا پورا اثر و رسوخ استعمال کر کے لڑکیوں کو چوری کے مقدمے میں سے خارج کروالیا۔ تاہم عطنے اور بھتنے کو جیل ہو گئی۔ دونوں لڑکیاں بے سہارا رہ گئیں۔ سردار خان کے ہوتے ہوئے ایسی لڑکیاں بے یار و مددگار کیونکر رہ سکتی تھیں۔ اُس نے کمال مہربانی سے کام لیتے ہوئے اُن کی کفالت اپنے ذمہ لینے کا اعلان کیا اور فوراً انہیں اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ لڑکیاں اُسی کوٹھی میں آ گئیں جہاں بقول بدخواہوں اور سابقہ تھانیدار کے' ان کے ساتھ خدانخواستہ کوئی غیر اخلاقی فعل ہُوا تھا۔

سردار خان کی سخاوت اور نیکیوں کے سوتے صرف لڑکیوں کے لیے ہی نہیں پھوٹتے رہے بلکہ قید کی سزا کاٹ کر رہا ہونے پر عطنے اور بھتنے کو بھی فیض یاب ہونے کا موقع دیا گیا۔ جیل سے لانے کے لیے لینڈ روور بھیجی گئی۔ کوٹھی میں لا کر انہیں بڑی فراخ دلی سے پوری اجازت دی گئی کہ وہ اپنی بہنوں اور منگیتروں سے مل سکتے ہیں اور چاہیں تو ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ لیکن دونوں جانب سے تھوڑی دیر کو مل بیٹھ کر پیار اور کسی جھجکے ہوئے انہونے سانجھے دکھ کی باتیں کر لینے میں بھی کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی گئی۔

دوسرے روز بابو تھیمز کے مالک جی۔ این۔ صحرائی کو بلوایا گیا اور دونوں لڑکے

اس کے حوالے کر دیے۔ اختلاف کا عنصر اُن کی شخصیتوں کا جزو ہی نہیں رہا تھا۔ یوں جیسے وہ کسی کاملِ فن عامل کے معمول بن چکے ہوں۔ انہوں نے بے چوں و چراں اپنی بقیہ زندگی تھیٹر کے نام کر دی۔ وہ دونوں دُبلے پتلے اسمارٹ اور متناسب جسموں کے مالک تھے۔ نین نقش بھی پُرکشش تھے۔ جسم میں لچک تھی۔ بہت جلد ڈانس سیکھ گئے۔ رنگت گو سانولی تھی لیکن کلین شیو کر کے مناسب میک اپ کے بعد جب انہیں لڑکیوں والے بھڑکیلے لباس زیب تن کرا کے تھیٹر کے باہر بانسوں سے بنے چبوترے پر کھڑا کیا گیا تو اُن کا بانکپن دیکھنے کے لیے تماشائیوں کے ٹھٹھ لگ گئے۔ ایک طرف شو شروع ہونے کا اعلان ہو رہا تھا اور جلدی جلدی ٹکٹ خرید کر اندر آنے کی ترغیب دی جا رہی تھی تو دوسرے سپیکر پر گانے کے بول گونج رہے تھے...... "مُن وے بلوری اکھ والیا۔ اساں دل تیرے نال لا لیا" ...... "سانولی" اور "سلونی" کولہے مٹکا مٹکا کر ناچ رہی تھیں۔ دونوں کے ہونٹ' گانے کے بول اور ان کے الفاظ کے مطابق ہلتے اور جب جسم کے پیچ وخم و مصنوعی نشیب و فراز کا زیر و بم ہل چل مچاتا تو کئی منچلے "ہائے او ہائے" کا نعرۂ تحسین بلند کرتے۔ ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کر چومتے اور پھر ہوا میں اچھالتے۔ ان کی کافر اداؤں پر فریفتہ ہو کر کرنسی نوٹ سٹیج پر پھینکتے۔ لیکن "سانولی" اور "سلونی" اپنی دھن میں مگن فن کا مظاہرہ کرتی رہیں۔ ان کی کاجل سے سجی آنکھوں میں آنسو تھا نہ ہی سرخی سے مزین ہونٹوں پر کوئی شکوہ۔

دُعا

تب کراچی ابھی کئی کراچیوں کا مجموعہ نہیں بنا تھا۔ اُس نے رات کو ذرا تاخیر سے ماڑی پور کے بس سٹاپ پر اتر کر نیول کالونی جانے کے لیے شارٹ کٹ راستہ اختیار کیا لیکن ابھی نصف فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ دو مکرانیوں نے روک لیا۔ ان میں سے ایک طویل القامت اور دوسرا میانہ تھا۔ میانہ قد والے نے کوئی تیز دھار آلہ ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اس کے چہرے کے سامنے لہرا کر بولا۔ ''اڑے نکال ڑے جو کچھ بھی تیرے پاس ہے ورنہ ابھی کلٹی ہوئیں گا ادھر ہی۔'' اس کی جیب میں صرف اڑھائی روپے تھے جو پوری ایمان داری سے مکرانیوں کے حوالے کر دیے تو ایک نے پوچھا' کتنے ہیں ڑے؟ اس نے بڑی عاجزی سے رقم کی مالیت بتائی لیکن انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک نے کہا۔ ''اڑے سالے بھیک دیتا ہے؟'' اس نے بڑی لجاجت سے جواب دیا۔ ''نہیں بھائی جان! تلاشی لے لو میں نے اپنے پاس ایک ٹیڈی پیسہ بھی بچا کر نہیں رکھا۔'' دوسرے نے استفسار کیا۔ ''کیا کرتا ہے ڑے؟'' اس نے جواب دیا۔ ''میں کراچی یونیورسٹی کا طالب علم ہوں۔'' طویل القامت مکرانی نے اس کے پیسے واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''لے ڑے اپنا روکڑا۔ چل پھوٹ اِدھر سے۔''

وہ اس واقعہ سے اس قدر حواس باختہ ہوا کہ نیول کالونی جانے کی بجائے واپس ماڑی پور بس سٹاپ کی جانب بھاگ پڑا لیکن وہاں پر ہر سو ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

سواری ملنے کے آثار دکھائی نہیں دیے تو وہ غیر ارادی طور پر پیدل ہی چل دیا۔ اسے یہ قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ وہ کون سی جگہ تھی۔ بس اتنا ہی یاد ہے کہ پولیس کی وردی میں ملبوس ہاتھوں میں ڈنڈے لیے دو سپاہیوں کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس کی جان میں جان آئی کہ عوام کی جان و مال کے محافظوں کی موجودگی میں اب سماج دشمن عناصر سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ دونوں میں سے ایک کا قد بمشکل اتنا ہی تھا کہ جتنا کم سے کم پولیس میں بھرتی کے لیے قابل قبول ہو سکتا ہے۔ جب کہ دوسرے کا اپنے ساتھی سے تقریباً ڈیڑھ انچ زیادہ ہوگا۔ لہٰذا وہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ اسے میرٹ پر پولیس کی ملازمت ملی ہے۔ قریب آ کر اسے روک لیا اور پوچھا کہ وہ کہاں سے آ رہا ہے' کہاں جا رہا ہے اور مزید یہ کہ اپنی شناخت کرائے۔ اس نے ساری روداد سنا ڈالی۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ وہ مشتبہ لگتا ہے۔ دوسرے نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے اس کی تلاشی لینا شروع کر دی' جیسے مجاز اتھارٹی سے انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر قبل از وقت ہی سرچ وارنٹ حاصل کر رکھا ہو۔ اس نے ذرا ہمت کر کے اعتراض کیا کہ وہ ایک شریف شہری کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہے ہیں تو میرٹ پر پولیس مین بننے والے نے کہا کہ شریف شہری رات کے وقت ایسے علاقوں میں آوارہ گردی کرتے ہوئے نہیں پائے جاتے۔ وہ یقیناً کوئی واردات ڈالنے کی نیت سے نکلا ہے لہٰذا ان کے ساتھ پولیس سٹیشن چلے۔

اس نئی صورت حال پر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس نے پولیس سٹیشن میں زیر حراست ملزموں کے ساتھ عموی طور پر روا رکھے گئے غیر معمولی حُسن سلوک کے قصے سن رکھے تھے۔ وہ کینٹین میں بیٹھ کر اخبار کا مطالعہ بھی باقاعدگی سے کیا کرتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ محض آوارہ گردی میں پکڑے گئے لوگوں میں سے بعض کو اتنا مارا گیا کہ انہوں نے ازخود قبول کر لیا کہ وہ بین الاضلاعی درجے کے چور ڈاکو ہیں اور جو کوئی چھوٹے موٹے لفندرے تھے ان کی ایسی چھترول ہوئی کہ وہ بین الصوبائی چور ہونے کا

اعتراف کر بیٹھے۔ وہ اس نئی صورتِ حال پر لرز کر رہ گیا۔ چونکہ اپنے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا کہ پولیس کے حُسنِ سلوک کی تاب لانا اس کے بس کی بات نہیں اور جس طرح کی پولیس کہانیاں وہ سنتا رہا ہے اگر اس پر عملاً اطلاق ہو گیا تو وہ آغاز میں ہی چوروں کے کسی بین الاقوامی گروہ کا سرغنہ ہونے کا اعتراف کر لے گا۔ دونوں سپاہیوں کی منت سماجت کرنے لگا کہ وہ غریب گھرانے کا طالبِ علم ہے' اللہ کے واسطے اسے کسی آزمائش میں نہ ڈالا جائے۔

اس کی جیب میں اڑھائی روپے' ایک ٹافی' دو چھوٹی الائچی' کلائی پر گھڑی اور سامنے والی جیب میں ایگل فونٹین پین بھی تھا۔ عوام کی جان و مال کے دونوں محافظوں نے اس کی زبان سے جب یہ سنا کہ وہ غریب گھرانے کا طالبِ علم ہے تو ان کے دل پسیج گئے اور اللہ کی راہ میں اس پر ترس کھاتے ہوئے چھوڑ دیا لیکن جامہ تلاشی کے نتیجے میں حاصل ہونے والا "مالِ مسروقہ" شاید اس لیے اپنی حفاظت میں رکھنا ضروری سمجھا کہ اگر اسے کوئی اور نکرائی سرِ راہ روکے تو مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ کر سکے۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ لنڈے کی پتلون اور شرٹ پہنے ہوئے تھا ورنہ انجام شرم ناک بھی ہو سکتا تھا۔ تمام ممکنہ خطرات سے محفوظ کرتے ہوئے اسے حکم دیا کہ وہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھے اور نہ ہی سڑک چھوڑے۔ چپ چاپ سیدھا چلتا جائے۔ کوئی نہ کوئی خدا ترس اسے لفٹ دے ہی دے گا۔

اس نے محافظوں سے بڑے ادب کے ساتھ عرض کی کہ پچاس پیسے کا سکہ اور الائچی عنایت کر دی جائے تو وہ ان کا شکر گزار رہے گا۔ "ابے سالے وہ کیوں؟" ڈیڑھ انچ چھوٹے قد والے نے اکڑ کر پوچھا تو میرٹ پر بھرتی ہونے والے کے برابر دکھائی دینے لگا۔ اس نے کہا۔ پچاس پیسے اس لیے کہ اگر کوئی بس لاری مل جائے تو وہ کچھ کرایہ ادا کر کے اپنی پیدل مسافت کی طوالت کو کسی حد تک مختصر کر سکے اور الائچی چبانے

کے لیے تاکہ دل بہلا رہے اور غم کی شدت میں کچھ کمی کا احساس ہونے لگے۔ اس کی درخواست کو بری طرح رد کر دیا گیا اور سرزنش کی کہ اس نے انہیں دیا ہی کیا ہے جو وہ واپس مانگ رہا ہے۔ ڈیڑھ انچ لمبے قد والے نے بھی اسے لعنت ملامت کی اور کہا کہ ایسی بات کرتے ہوئے اسے شرم آنی چاہیے۔

دونوں سپاہیوں نے اپنے تئیں گویا یہ اطمینان کر لیا کہ وقوع پذیر ہونے سے قبل ہی انہوں نے ایک ممکنہ واردات کا قلع قمع کر لیا ہے تو باقی ماندہ فرائض کی بجا آوری کے لیے معمول کے گشت کا سلسلہ وہاں سے جوڑ دیا جہاں سے اس کی آمد کے باعث ٹوٹا تھا۔ وہ لحہ بہ لحہ تاریکی میں ڈوبتے گئے تاہم لاٹھیوں کے سڑک کی سطح پر ٹکرانے کی آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔

وہ ایک ایسے مقام پر بری طرح لٹ گیا تھا جو شاید ماضی کا دیبل تھا یا اس کا قرب و جوار۔ اس کا خیال لپک کر دونوں مکرانیوں کی طرح چلا گیا' جن سے ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ہونے والی پُر خطر ملاقات خوش گوار انجام سے ہم کنار ہوئی تھی۔ عجیب خواہش پوری قوت سے بیدار ہوئی کہ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر پکارے۔ ''مکرانی بھائیو! میری مدد کو پہنچو۔''

تب سے اس کے دل میں ایک وسوسہ گھر کر گیا ہے۔ رات کو سفر پر نکلتے ہوئے اللہ سے دعا کرتا ہے کہ بھلے کوئی ڈاکو برابر آ جائے' وہ منت سماجت کر کے جان چھڑا لے گا لیکن پولیس سے مڈبھیڑ نہ ہو۔

اِک بات بہت ضروری

مجھے اپنے بچوں سے بڑی محبت تھی۔ اسی محبت نے مجھے مرنے نہ دیا۔ ورنہ میں کب کا مر چکا ہوتا۔ دراصل میں لمحہ لمحہ پلتے بڑھتے اور ترقی کے زینے طے کرتے اپنے بچوں کو دیکھتے رہنا چاہتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ بالفرض اگلے ہی لمحے اگر مجھے موت آنی ہے تو میں اپنی محبت کی پوری توانائی کو بروئے کار لا کر اسی ایک لمحے کو قید کر لوں اور تا قیامت اگلا لمحہ کبھی نہ آنے دوں۔ میں وقت کے نظام کو ایسے جکڑ لوں کہ کائنات ساکت ہو جائے اور موت کی رسائی مجھ تک ممکن نہ رہے۔ میری بیٹی اور بیٹا بھی مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور میری بیوی تو خیر تھی ہی سراپا محبت۔ یہ محبت کا بے پایاں جذبہ ہی تھا جس نے ہم سب کو ایک دوسرے کے لیے زندہ رکھا ہوا تھا۔ میری بیوی کے کچھ خواب تھے جو وہ مجھے کبھی کبھار سنایا کرتی تھی۔ لیکن اب عرصہ ہوا' اُس نے خواب دیکھنے چھوڑ دیئے تھے یا مجھے سناتی نہیں تھی کہ شاید میں اُس کے خواب پورے نہ کر سکوں اور اس طرح مجھے اپنی ناکامیوں پر دکھ ہو۔ میں چپ ہوتا تو وہ بھی خاموش رہتی۔ میں خوش ہوتا تو وہ بھی مسرور ہو جاتی۔ میں ہنستا تو وہ بھی مسکرانے لگتی۔ میں کسی انجانے جذبے سے سرشار کسی خیال سے جھوم کر گانے لگتا تو وہ بھی گنگنانے لگتی۔ میں ناراض ہو جاتا تو وہ سہم جاتی۔ یوں جیسے جذبوں کا سوئچ ایک ہی ہو اور اس سے ہم دونوں آپریٹ ہوتے ہوں۔

مجھے اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی لیکن میں نے اُس سے ابھی تک مکمل کے

اس بارے میں اظہار نہیں کیا تھا۔ میں نے سوچا کہ ایک دن جب مکمل فراغت ہو گی' میری بیٹی اور بیٹا اپنی عملی زندگیوں کا آغاز کامیابیوں کے ساتھ کر چکے ہوں گے' مجھے کوئی اُلجھن نہیں ہو گی' کہیں کام پر جانے کی جلدی ہو گی نہ ہی دیر سے گھر لوٹنے پر تھکن طاری' وقت میرے پاس وافر ہو گا تو میں اسے اطمینان سے یہ بات کہنے کے لیے اپنے فارم ہاؤس لے جاؤں گا' جہاں باہر لان میں خود رو بے ہنگم اُگی گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ کے پاس بیٹھ کر سردیوں کے آغاز کی دھوپ تاپتے ہوئے کہوں گا: ''جان! تم بوڑھی ہو کر بھی اتنی خوبصورت ہو اور ہاں! میں نے تم سے کہنا تھا کہ مجھے تم سے بڑی محبت ہے۔''

وہ حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہے گی: ''یہ آخری عمر میں آج کیا سوجھی؟''

''سوجھنے کی کیا بات ہے؟ تم ہو ہی بہت خوبصورت اور مجھے تم سے محبت ہے۔'' میں اسے جواب دیتا ہوں۔ پھر میں چشم تصور سے دیکھتا ہوں کہ میرا سویٹر بُنتے ہوئے اُس کی انگلیاں سلائیوں پر رُک جاتی ہیں اور میرے چہرے کی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہتی ہے۔''آپ کی طبیعت ٹھیک ہے ناں؟''

اپنے منصوبے کو عملی شکل دینے کی غرض سے اِن جاڑوں کے آغاز میں ہی اُسے اپنے ہم راہ فارم ہاؤس پر لے آیا تھا چونکہ میں اب مزید تاخیر نہیں کر سکتا تھا اور یہ ضروری بات جو مدتوں سے مؤخر کرتا چلا آ رہا تھا' اب ہر صورت کہہ دینا چاہتا تھا۔ میں نے اور بھی بہت سی باتیں کرنا تھیں اور خاص طور پر یہ بات بتانا تھی کہ مجھے اُس سے شروع دن سے ہی بڑی محبت ہے۔

ابھی دوسرا ہی دن تھا اور ٹھٹھرتی ہوئی صبح' میں نے سوچا ذرا دھوپ نکلے اور باہر موہڑوں پر دونوں بیٹھیں گے تو وہ ضروری بات کروں گا۔ لیکن اس سے پیشتر ہی شہر سے میری بیٹی کی گاڑی آ گئی اور میری بیوی کو لے کر چلی گئی۔ نہ جانے اسے اپنی ماں کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔ بہر حال میں خاموش رہا اور اپنی بیوی کی واپسی تک اس

سے اپنی بے پناہ محبت کا اعتراف کرنے کا حتمی ارادہ ملتوی کر دیا۔

میں خود شہر نہیں گیا تھا۔ وہاں بھی لوگ مجھے بہت چاہتے تھے لیکن میں خود ہی اِدھر رہنا پسند کرتا تھا۔ دراصل مجھے اب بار بار کھانسی آنے لگتی اور سگریٹ نوشی بھی ترک نہیں کرتا تھا۔ مجھے وہم ہو گیا تھا کہ شہر والے گھر میں میری وجہ سے آلودگی پھیلتی ہوگی۔ نہ جانے مجھے زندگی میں کون کون سی بیماریاں لاحق ہوئی ہوں جو اب تک دبی رہی ہوں۔ لیکن مزید پیچیدہ ہو چکی ہوں۔ بعید نہیں کہ اس طرح میری نازک اندام بہو اور پھول سا پوتا متاثر ہو۔ میری بیٹی کی سہیلیاں بھی اکثر گھر میں آتی رہتی تھیں۔ وہ ہر وقت میرے لباس کے بارے میں غیر معمولی حد تک فکر مند رہتی۔

میرا بیٹا بہو اور بیٹی مجھے ہر طرح کا آرام اور آسائشیں میرے کمرے کے اندر فراہم کرتے تھے۔ کمرے سے متصل جدید ترین باتھ روم تھا۔ اے سی لگا ہوا تھا۔ ٹی وی اور وی سی آر موجود تھا۔ مجھے وہاں ہر طرح کے ادبی رسائل اور اخبار مہیا کیے جاتے تھے۔ لکھنے کے لیے بڑے شاندار چکنے لکیر دار کاغذ اعلیٰ قسم کی سیاہی اور بہترین قلم بھی وافر تھے۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر قیمتی پردے آویزاں رہتے اور ایک چھوٹا سا ریفریجریٹر بھی موجود تھا۔ میرا بستر بڑا نرم اور آرام دہ ہوتا جس پر ہر روز میری پسند کے مطابق سفید اُجلی اور استری شدہ چادر مع تکیوں کے غلاف تبدیل کی جاتی تھی۔ مگر مجھ میں ایک خرابی پیدا ہو گئی کہ میں کافی عرصہ سے اپنے لباس کے معاملے میں بڑا لاپرواہ ہو گیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات کے لیے یا کسی چیز کی خاطر ننگے پاؤں چل کر لاؤنج میں چلا آتا تھا۔ حالانکہ میری اولاد بہت ہی خدمت گزار اور سعادت مند تھی اور ان کی یہ خواہش تھی کہ میں کمرے سے باہر آنے کی بجائے انٹرکام پر بات کر لیا کروں تاکہ وہ خود میری خدمت میں حاضر ہو کر میری ضرورت کے بارے میں پوچھ کر حکم بجا لائیں۔ درحقیقت میں ایک ناشکرا انسان ہونے کی وجہ سے اُن کی خدمت

گزاریوں کی قدر و قیمت کو درست طور پر سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ جس وجہ سے اُن کی دل شکنی ہو جاتی اور مجھے بھی بعد میں دکھ ہوتا تھا کہ میری وجہ سے میرے بچوں کو رنج اٹھانا پڑا۔ اسی لیے میری زیادہ تر یہی خواہش ہوتی تھی کہ میں فارم ہاؤس پر رہوں۔ لیکن میری شریکِ حیات وہاں میرے پاس ہوتا کہ میں اُسے بتا سکوں کہ مجھے اُس سے محبت ہے اور یہ باور کرا سکوں کہ شروع دن سے ہی اُس سے محبت تھی۔

مسئلہ یہ تھا کہ میری اولاد کے سر پر میری خدمت کرنے کا جنون سوار رہتا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں ان کے ہاتھ سے نکل جاؤں اور وہ خدمت کرنے کا اچھا بھلا موقع گنوا کر سعادت سے محروم ہو جائیں۔ اوپر سے لوگوں کی باتیں بھی سنیں کہ دیکھو جی' بوڑھے ماں باپ کو کھیتوں میں پھینک رکھا ہے اور خود شہر میں پرآسائش زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ لہٰذا وہ اس مسئلے میں بڑے محتاط تھے اور تینوں کی رائے ایک ہی تھی۔ وہ میری خدمت میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بڑے مؤدب انداز میں میرے کئی دیگر ہم عصر بزرگوں کے بارے میں بتاتے کہ وہ انتہائی کسمپرسی کی حالت میں رہتے ہوئے بھی کس قدر مطمئن اور شاد ہیں۔ پانچ وقت باقاعدگی سے نماز ادا کرتے ہیں۔ تلاوت اور تسبیح میں مشغول رہتے ہیں۔ میرے بچوں کو بڑا شوق تھا کہ وہ مجھے اس عمر میں ایک عبادت گزار بزرگ کے روپ میں دیکھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ان کی یہ خواہش پوری کرنے کے لیے کوئی خاطر خواہ تردد نہیں کرتا تھا۔ دن میں ایک آدھ بار جب جی میں آتا نماز ادا کر لیتا۔ دراصل مجھے سوائے نماز اور چند آیات کے اور کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ میری اولاد بے چاری کو لوگوں سے جھوٹ بولنا پڑتا تھا۔ میں اکثر اپنے کمرے میں بیٹھا سن رہا ہوتا تھا جب وہ گھر میں آئے کسی مہمان سے کہہ رہے ہوتے:

"ابا جان اپنے کمرے میں ہر وقت اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں۔ باہر کم ہی نکلتے ہیں۔ ہم کہتے بھی ہیں کہ کسی وقت عبادت میں وقفہ کر کے ہمارے پاس آ کر بیٹھیں لیکن"......

"واہ جی واہ' سبحان اللہ...... کیا قسمت پائی ہے جی آپ کے والدین نے......
خدا ایسا بڑھاپا سب کو نصیب کرے۔ جواب نہیں جی آپ لوگوں کا بھی۔ آفرین ہے۔
بڑا سکھ دیا ہے آپ تینوں نے اپنے ماں باپ کو۔ ماشاء اللہ۔" کسی ایک مہمان کی آواز
سنائی دیتی تو دوسرا کہنے لگتا۔

"جی بالکل۔ اسی لیے عبادت میں لگے رہتے ہیں۔ اور کیا چاہیے انہیں؟"
حالانکہ میں عبادت کے بجائے کوئی رسالہ کتاب پڑھ رہا ہوتا۔ کتاب بھی
دینی نہیں' کوئی اور ہی۔ میرے کمرے میں بے شمار کتابیں تھیں۔ ہر روز گھر کا کوئی فرد
موقع پا کر مذہبی کتابیں نمایاں طور پر سجا کر رکھ دیتا اور میرے پسندیدہ موضوعات پر لکھی
کتابیں اِدھر اُدھر ہو جاتیں۔ لیکن میں ادب اور آرٹ پر کوئی نہ کوئی کتاب ڈھونڈ کر
پڑھنے لگتا۔ مجھے اپنے آپ پر بڑا غصہ آتا کہ میں اپنے پیارے بچوں کی خوشی کی خاطر
عبادت گزار بزرگ کیوں نہیں بن جاتا۔ ایسے ہی لمحے مجھے یاد آ جاتا' جب میں چھتیس
سال کی عمر میں اپنی بیوی کے ساتھ حج کرنے گیا تھا۔ تب گرمی کا موسم تھا۔ مئی کا آخری
اور جون کا پہلا ہفتہ۔ میں وہاں دورانِ حج گرمی کی شدت کے باعث نڈھال ہو گیا اور
ہجوم میں پھنس کر بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ ابھی زندگی کے دن باقی تھے کہ بچ گیا۔ لیکن
وہاں میں نے اللہ میاں کے روبرو بڑی عاجزی سے دعا کی تھی۔ "اے پاک پروردگار!
میرا یہ حج قبول فرما لے اور معذرت بھی کہ میں دوبارہ یہاں کبھی نہیں آؤں گا۔" مجھے ان
لمحات کے دوران اپنی ذہنی کیفیت آج پینتیس چھتیس برس بعد بھی یاد ہے کہ اللہ سے
ایسی بات کہتے ہوئے کتنی ندامت ہوئی تھی۔ میرا جسم مارے شرم اور خوف کے پانی ہو گیا
لیکن خدائے بزرگ و برتر اُس وقت میرے روبرو تھا۔ اُس کی ذاتِ پاک میرے دل'
میرے ذہن اور جسم کے آر پار' بلکہ میری ہستی کے ریزہ ریزہ کے اندر جھانک رہی تھی۔
اس لیے میں دل کی بات نہ بھی کہتا تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ لہٰذا میں نے کہہ دیا جو میرے

دل میں تھا کہ وہ ویسے بھی جان گیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر دہرایا تھا: ''اے اللہ! تُو میرا یہی حج قبول فرما اور مجھے پھر یہاں نہیں بلانا۔''

میں نے اس لمحے روزِ روشن کی مانند واضح طور پر محسوس کیا کہ میرے رب نے میری اس گستاخی کو معاف فرما دیا اور مسکرا کر کہا تھا: ''جاؤ ہم تمہیں پھر یہاں کبھی نہیں بلائیں گے۔''

میں نے اللہ سے اپنا یہ مکالمہ جب بیوی کو سنایا تو وہ یک دم بدک کر دو قدم دور ہٹ گئی اور خوف زدہ ہو کر بولی: ''ہائے خدائے! یہ کیا کفر بکے جا رہے ہیں۔ چپ کریں۔''

میں نے بے بسی کے عالم میں اُسے دیکھا اور کہا: ''میری جان! چپ رہنے سے کیا ہوتا ہے؟ باری تعالیٰ ویسے بھی میرے دل کا بھید پا گیا تھا اور میں اپنے اندر کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ اس وقت ہماری باتیں سن کر مسکرا رہا ہے۔''

''توبہ توبہ' کبھی کوئی ایسے بھی کہتا ہے؟ دیکھیں تو سہی' آپ کے دادا کی عمروں کے لوگ خوشی خوشی فریضہ حج ادا کر رہے ہیں...... اور آپ اتنے نازک کیوں ہیں؟ ذرا سی جسمانی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتے...... کافروں والی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں''...... میری بیوی نے اپنے چہرے سے عرقِ انفعال کے قطرے پونچھتے ہوئے لرزتی آواز میں مجھے سرزنش کی تھی۔

''آج پھر حج کے وہی دن قریب آ رہے ہیں۔ میرے بچوں کو بڑا شوق ہے کہ میں حج کی سعادت حاصل کروں۔ دراصل وہ خود اپنے خرچ پر مجھے حج پر روانہ کر کے سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اب جب کہ میری عمر بھی دوگنی ہو چکی ہے اور میں اپنے رب سے رخصت لے کر آیا تھا' لیکن سبھی کو مجھے الحاج بنانے کا شوق چرایا ہے۔ میں کیا کروں؟ میری بیوی بخوشی تیار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے اپنے رب کی بخشش

ہوئی رخصت کو لوٹا دیا تو یہ میرے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ میں نے اپنی بیوی سے کہہ دیا ہے کہ اس مرتبہ میں وہاں زندہ نہیں بچوں گا۔ حیرت ہے' جو عورت تمام عمر ہر دم میری خیر مناتی رہی' ایک ایک قدم پر میری سلامتی کے لیے دعائیں کرتی' جب تک سفر سے میں لوٹ نہ آتا تھا' دہلیز سے لگی کھڑی رہتی تھی۔ کہیں جانے سے قبل مجھے امام ضامن باندھتی اور واپسی پر شکرانے کے نفل ادا کرتی۔ میں ذرا تھک جاتا تو میرا سر دبایا کرتی۔ میں سونے لگتا تو کلامِ پاک کی آیات پڑھ کر مجھ پر پھونکتی۔ حتیٰ کہ میں سو جایا کرتا تو وہ مجھ پر دم کرتی رہتی۔ آج وہی عورت کس بے دردی اور دیدہ دلیری سے کہہ رہی ہے:

''اور کیا چاہیے؟ اگر وہاں موت آ جائے تو اس سے بڑھ کر اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے؟ آخر مرنا ہے ہی۔ دعا کریں ہم دونوں اُس مٹی میں دفن ہوں۔'' حد ہو گئی ہے۔ یعنی جو میں کہتا ہوں' اس کا کوئی جواب ہی نہیں۔ فارم ہاؤس پر میرے ساتھ جاتی نہیں' تاکہ میں اسے بتا سکوں کہ مجھے اُس سے کتنی محبت ہے۔ اُلٹا مرنے کی باتیں کرتی ہے۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ ابھی میری محبت زندہ ہے اور وہ خود بھی میرے ساتھ مرنے پر تلی بیٹھی ہے۔

عجب شریکِ حیات ہے۔ اپنی اور میری حیات کا خاتمہ کرنے پر تلی بیٹھی ہے۔ اتنی ضروری بات کرنی ہے۔ اس کا موقع مجھے دیتی نہیں۔ پہلے ہی اتنی دیر ہو چکی ہے اور اب میں نے اس دوسرے حج کے نتائج کے بارے میں کچھ کہا تو پھر کہے گی کہ میں کافروں والی باتیں کرتا ہوں۔ چلو خیر...... بقول اس کے' کافروں والی بات میں نہیں کرتا۔ لیکن میں نے اُس سے کہا:

''مجھے معلوم ہے' تم وہاں بشمول میرے کیوں مرنا چاہتی ہے۔ تیری یہ خواہش ہے' بلکہ سازش کہ تیری اولاد کو یہاں رتی بھر تردد نہ کرنا پڑے اور ہم فوت بھی ہو جائیں۔ سونے پر سہاگہ' ہر مومن مسلمان تمہاری بیٹی اور بیٹے کو ہماری موت پر تعزیت

کرنے کے ساتھ ساتھ نیک والدین کی اولاد ہونے پر مبارکبادیں بھی دے۔ ہدیۂ تبریک پیش کرے اور ان کی خوش قسمتی پر رشک کا اظہار کرے کہ وطن میں کفن سیا نہ قبر کھدی۔ سبحان اللہ! کیسے مقدروں والے تھے جو پاک مٹی میں دفن ہوئے۔ نہ نہ میں انہیں اتنا بڑا فائدے کا سودا نہیں کرنے دوں گا۔ وہ بے کس مفلس نہیں۔ میں یہاں ہی مروں گا۔ وہ خود میرے کفن دفن کا بندوبست کریں تا کہ انہیں سمجھ آ جائے کہ بڑا مرنا کیسے بھگتایا جاتا ہے۔بس۔ اور تم بھی سن لو کہ میں تمہیں وہ بات بتا کر رہوں گا''......

''اچھا اچھا۔ چپ کریں۔ پتا نہیں کیا جوش سوار ہو گیا ہے۔ ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے' محبت محبت۔ پہلے کہاں سوئے ہوئے تھے؟'' اُس نے میری بات کاٹ کر کہا اور زیر لب مسکرانے لگی۔

اس خیال کے پیش نظر کہ مجھ پر مزید دباؤ نہ ڈالا جائے' میں فارم ہاؤس چلا آیا تھا اور اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے آیا تا کہ میں اُس سے اطمینانِ قلب کے ساتھ وہ انتہائی ضروری بات کر سکوں۔ لیکن دوسرے ہی روز وہ شہر چلی آئی۔ بیٹی نے گاڑی کے ذریعے بلا بھیجا تھا۔ میں اس عمر میں جتنا اُسے قریب رکھنے کی کوشش کرتا ہوں' وہ اتنا ہی دور بھاگتی ہے۔ ہر وقت بچوں میں گھسی رہتی ہے۔ یا پھر نماز' روزہ' تہجد' تلاوت اور تسبیح۔ میں سارا سارا دن اس انتظار میں رہا کہ وہ بچوں میں سے نکلے' ذرا الگ ہو یا عبادت میں وقفہ کرے تو میں اُس سے پیار محبت کی باتیں کروں' جو میں نے جوانی میں کرنا تھیں۔ لیکن کچھ مصروفیات کے باعث ہو نہ سکیں۔ جب کبھی کچھ موقع ملتا ہے اور میں ابھی بات چھیڑتا ہی ہوں تو وہ دامن چھڑا جاتی ہے اور کہتی ہے:

''ہائے خدائے' کچھ تو شرم کریں۔ آپ کو ہو کیا گیا ہے اس عمر میں؟''

''ہاں یہ صحیح ہے۔ واقعی مجھے اس عمر میں آخر کچھ ہو ہی گیا ہے۔ ابھی جب میں اپنی اولاد سے ایک بہت بڑی سعادت کے حصول کا سنہری موقع چھین کر بھاگ نکلا

تھا اور فارم ہاؤس پر آتے ہوئے اپنی بیوی کو کچھ اس انداز میں ساتھ لے آیا جیسے کوئی اغوا وغیرہ کا معاملہ ہو۔ اغوا یہ بالکل بھی نہیں تھا چونکہ سب بخوبی جانتے تھے کہ بڈھا بڈھی' میاں بیوی ہیں۔ لیکن اغوا سے کچھ ملتا جلتا کیس ہی تھا۔ پیشتر اس کے کہ اس واردات کے کامیاب ارتکاب کے نتائج سے مستفید ہوتا اور وہ نہایت ہی ضروری بات میں اُس سے کہہ پاتا' شہر سے گاڑی اُسے لینے آ گئی اور وہ اپنی تسبیح سمیت واپس چلی گئی۔ جو ایک دن اور رات کا دورانیہ اُس نے فارم ہاؤس پر میرے ساتھ گزارا' میں سوچتا رہا کہ وہ تسبیح پر اپنی انگلیوں کی جنبش میں وقفہ کرے اور ہلتے ہوئے لب ذرا ساکت ہوں تو میں کہوں کہ مجھے اُس سے بڑی محبت ہے۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ میں اُس کی عبادت میں خلل ڈال کر اپنی بات کہہ دوں۔ لیکن میں کفر کے فتوے سے خوفزدہ ہو گیا۔ مذہبی معاملات میں میرے بارے میں پہلے ہی شکوک وشبہات پائے جاتے تھے۔ عبادت کے دوران میں تمام وقت اُس کی پیشانی پر مستقلاً لکھا رہا۔ ''ہائے خانے' شرم کریں۔ آپ کو ہو کیا گیا ہے اس عمر میں؟'' ......

اب وہ چلی گئی ہے اور میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ لیکن میں واپس نہیں جاؤں گا خواہ وہ ضروری بات اب کبھی بھی نہ کہہ سکوں۔ اگر میں شہر چلا گیا تو وہ سب مل کر مجھے حج پر جانے کے لیے مجبور کر دیں گے اور میں پردیس میں مارا جاؤں گا۔ اللہ اور میرے مابین یہ معاملہ چھتیس برس قبل خوش اسلوبی سے طے ہو چکا ہے اس لیے میں طے شدہ معاملات کو ازسرِ نو چھیڑ کر نافرمانوں میں اپنا شمار کیوں کراؤں؟ میں اپنے دیس کی مٹی میں دفن ہونا چاہوں گا' جس سے میرا خمیر اُٹھا تھا۔ یہ مٹی اور زمین بھی مجھے میرے اللہ نے ہی عطا کی' جو مقدس ہے۔ ان حالات کی نزاکت کے پیش نظر میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں یہاں فارم ہاؤس پر رہ جاؤں گا۔ ہمیشہ کے لیے مرنے کے بعد بھی اور اگر بیوی نہ آئی تو پھر سے تصویریں بنانا شروع کر دوں گا۔

معلوم نہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میرے ذہن میں زمان ومکان کا ابہام پیدا ہو گیا ہے۔ مجھے معلوم ہی نہیں کہ میں یہاں کب سے ہوں۔ مجھے شاید صدیاں بیت گئی ہیں اور میں طبعی عمر سے کئی سو سال زیادہ عرصہ تک زندہ رہ گیا ہوں۔ لیکن نہ جانے مجھے موت کیوں نہیں آ رہی۔ حالانکہ میرا گوشت گل رہا ہے اور ہڈیوں سے الگ ہو رہا ہے لیکن محبت اب بھی میری ہستی سے بدستور لپٹی ہوئی ہے۔ تاہم گونگی بہری اور بوڑھی ہو گئی ہے یا شاید بہت ہی بوسیدہ اور اس میں جا بجا پیوند لگے ہوئے ہیں، جیسے کسی بھکاری کی گدڑی۔ میں اسے خواہ مخواہ کندھوں پر ڈالے اترائے پھرتا رہا ہوں۔ مفت کا بوجھ اٹھائے۔ حالانکہ میرے ناتواں کندھے اب اس بار کے متحمل ہی نہیں رہے۔ میں نے سوچا کہ اسے سرِ راہ ہی کہیں پھینک دوں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ کسی اور کو گزند نہ پہنچائے۔ اگر یہ کسی کو چمٹ گئی تو پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ میں نے اس کا مستقل تدارک کرنے کے لیے اپنے عزم کے تختوں سے ایک تابوت بنایا اور صبر کی میخیں ٹھونک کر اپنی محبت اس میں ہمیشہ کے لیے بند کر دی۔ اب میں فارغ تھا لہٰذا سوچا کہ پینٹنگ شروع کر دوں۔

میں نے پہلی تصویر بنانا شروع کی تو میرے ذہن میں کوئی واضح خیال و خاکہ نہیں تھا۔ لیکن حیرت ہے کہ میں نے جتنی بار تصویر بنائی، ہر بار میری بیوی کا چہرہ بن گیا۔ میں اسے مٹاتا اور بناتا رہا۔ ہر بار اس میں تبدیلی لانے کی کوشش کرتا لیکن وہ خود ہی تصویر میں ہر بار اُبھر آتی۔ ہر بار چہرے پر لکھا ہوا ہوتا۔ "ہائے ہائے آپ کرتے کیا ہیں؟ یہ کوئی عمر ہے عاشق معشوقی کی۔" تب مجھے پتا چلا کہ تابوت کے تختوں کے مابین کچھ درزیں رہ گئی تھیں۔ تبھی محبت کی خوشبو میرے آس پاس بکھری رہتی تھی۔ میں بھی حیران تھا کہ وجہ کیا ہے؟ میں نے سوچا کہ یہ میرے بعد بڑی خوار ہو گی۔ کم بخت میرے بغیر رہتی ہی نہیں۔ تب میں نے ارادہ کر لیا کہ میں اسے اپنے ساتھ ہی رکھوں۔ اب اور کتنے دن مجھے زندہ رہنا ہے۔ یہ جنم جنم کا ساتھ آخر کیوں ٹوٹے اور

جب یہ میرے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو جائے گی' تب اس سے کسی کو بھی خطرہ نہیں رہے گا۔ میرے ذہن میں یہ سوچ اور ارادہ بیدار ہوا ہی تھا' یعنی تجدید تعلق کی تحریک نمو پائی ہی ہوگی کہ تابوت میں پڑی بند میری محبت میں اک نئی روح نے جنم لیا اور وہ دوسرے ہی لمحے مضبوط تختے توڑ کر باہر نکل آئی۔ اک عالمِ وحشت میں دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے اتنے بوسے دیئے کہ مشامِ جان میں پھر سے محبت کا تازہ رس بھر گیا۔

اس کے بعد جو تصویریں میں نے بنائیں وہ میرے کمرے کی دیواروں پر آویزاں ہیں۔ سامنے والی دیوار پر لگی پینٹنگ میں ایک خیال پینٹ کیا ہے۔ ''کاگا سب تن کھائیو چن چن کھائیو ماس' دو نیناں مت کھائیو انہیں پیا ملن کی آس۔'' اس خیال کو میں نے اس طرح واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ کھلے آنگن کی منڈیر پر کوا بیٹھا ہے۔ آنگن کے چوپٹ کھلے دروازے میں ایک ہرن بیٹھا ہے جس کے جسمانی خطوط مبہم لیکن دونوں آنکھیں بڑی نمایاں ہیں۔

ابھی ابھی میں اس تصویر کو بغور دیکھ رہا تھا کہ اگلے ہی لمحے کوا اپنی ہیئت بدل کر اُلو بن گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی سنسان اجاڑ ویرانہ ہو' جہاں میں پڑا ہوں اور اُلو مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے اپنے ذہن کو جھٹکا اور خود سے کہا۔ ''میں ویرانے میں نہیں۔ اپنے فارم ہاؤس میں ہوں۔ جہاں کچھ ہی دور مزارعوں کا ڈیرہ ہے اور مویشیوں کا باڑہ بھی۔ یہاں ہر طرح کی رونق ہے۔ یہ خیال دل میں آتے ہی اُلو غائب ہو گیا لیکن چند ہی لمحوں میں اس کی جگہ ایک چمگادڑ نے لے لی اور میں نے دیکھا کہ ہر سُو تاریکی چھا گئی۔ گہری تاریکی' سناٹا اور میں۔ چمگادڑ جھولتے جھولتے دوسرے ہی لمحے مجھ پر جھپٹ پڑی تو میں لپک کر باہر آ گیا۔ دوپہر کا وقت تھا اور سخت دھوپ جھلسا دینے والی لُو کے باعث ہر جانب سناٹا تھا۔ دور دور تک کھیتوں میں کوئی بھی انسان نظر نہیں آ رہا تھا اور مال مویشی غالباً درختوں کے نیچے نڈھال پڑے ستا رہے تھے۔ میں واپس اندر لوٹ آیا اور

میں نے دیکھا' وہاں تصویر میں وہی کوا ہے جو میں نے درحقیقت پینٹ کیا تھا۔ میں نے چند ہی لمحے کوے پر نظریں گاڑی ہوں گی تو مجھے لگا جیسے اس کی چونچ سے لہو ٹپک رہا ہے اور وہاں دروازے کے پاس کوئی ہرن نہیں بلکہ میں خود پڑا ہوا ہوں۔ میرے بدن پر سے جا بجا گوشت نُچا ہوا ہے...... خون بہہ رہا ہے۔ کوا مجھ پر جھپٹنے کے لیے پر تول رہا ہے۔ پیشتر اس کے کہ وہ میرے جسم پر سے گوشت کی ایک اور بوٹی نوچ لینے کے لیے خون آلود چونچ سے میری کھال ادھیڑ دیتا' میں نے اپنی قوت کو یک جا کر کے ایک دہشت ناک چیخ ماری تو کوا خوف کے مارے اڑاری مار گیا۔ جب کہ نیچے دروازے میں بیٹھا وہ مبہم سا جسم حرکت کرنے لگا' جس کی محض دو آنکھیں ہی واضح تھیں جو مجھے گھورنے لگیں۔

مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہاں کوئی ہرن ہے نہ میں خود بلکہ وہ بھوک کا مارا ہوا کوئی بجو تھا جو اٹھ کر میری قبر کی جانب بڑھنے لگا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے میری قبر میں سرنگ لگائی ہے۔ میں اُسے ڈرا کر بھگانا چاہتا ہوں لیکن مجھ میں طاقت ہی نہیں رہی۔ پھر میرے دائیں پاؤں کو بجو اپنے دانتوں میں دبا لیتا ہے اور کھینچنے کے لیے زور آزمائی کرنے لگتا ہے۔ پہلے میں ڈرتا ہوں' پھر میرے دل میں خیال آیا کہ مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ بجو مجھے کھا جائے یا حشرات الارض۔ مجھے بالآخر مٹی ہونا ہی ہے۔ کیوں نہ اس فاقہ زدہ بجو کا رزق بن جاؤں۔ میں کسی کے کام آ جاؤں۔ بجو آخر میرا کیا بگاڑ لے گا۔ زیادہ سے زیادہ گوشت ہی کھائے گا۔ میرا وجود ہی عدم میں بدل سکے گا۔ میں پھر بھی رہوں گا ہی۔ پھر مجھے ہنسی آ جاتی ہے۔ میں بجو سے کہتا ہوں۔ "ارے میاں بجو! تم بے شک مجھے کھا جاؤ۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے لواحقین صبح آئیں گے تو اس قبر میں بنے ہوئے چھوٹے سے سوراخ کو فوراً بند کر دیں گے اور اسی روز گلگت میں میری خالی قبر پر ایک خوبصورت پختہ تربت بنا دیں گے۔

میرے اندازے درست ثابت ہوئے۔ میری قبر میں بنایا ہوا بجو کا سوراخ

انتہائی رازداری کے ساتھ بعجلت بند کر دیا گیا اور اس اہم کام میں ماسوائے میری بیٹی، بیٹے اور بہو کے اور کسی کو شریک نہیں کیا گیا۔ اس پر قبر تو کجا اچھا بھلا ایک طرح کا خوبصورت سا مقبرہ بنا دیا گیا' جسے سرامکس ٹائلز سے مزین کر کے چاروں اطراف سنگ مرمر کی بڑی بڑی سلیں نصب کر دی گئیں۔ ان پر قرآنی آیات کندہ تھیں۔ میرے چار چوفیرے قرآنی آیات اور تکیے پر نصب سنگ مرمر کی بڑی سی تختی پر میرا نام "حاجی فخر عالم ولد الحاج مولانا نور عالم چشتی' تاریخ پیدائش ۴ مئی ۱۹۱۲ء تاریخ وفات ۲۳ مئی ۱۹۸۴ء۔ برکت کے لیے کلمہ طیبہ' پاک ہستیوں کے نام اور نیچے ایک شعر۔

آسمان تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مجھے ندامت اور دکھ کا احساس مار رہا تھا کہ میں عربی پڑھ نہیں سکتا ورنہ فیوض و برکات کے یہ خزینے سمیٹ لیتا۔ اس لمحے میرا دھیان رب کی جانب مبذول ہو گیا۔ فوراً ہی میرے ریزہ ریزہ سے پکار آئی۔ "تُو مجھ سے بات تو کر' چاہے جس زبان یا لب و لہجے میں' جھجک کیسی...... تُو نہ کر' تب بھی میں دیکھ رہا ہوں تجھے اور پڑھ رہا ہوں"...... مجھے قرار آ گیا ہے۔

مجھے اپنے مزار نما مقبرے پر ہنسی آ گئی کہ میں اس میں ہوں ہی نہیں اور خالی خولی ڈھیری پر اس قدر اہتمام۔ میں نے دیکھا کہ میرے بیٹے کو بڑا افسوس ہو رہا تھا۔ وہ مجھے حج پر حج کرانا چاہتا تھا۔ یعنی حج کرا کرا کر مار دینا چاہتا تھا تا کہ میں ایک سکے بند الحاج بن جاؤں۔ اگر ایسے ہوا ہوتا تو آج وہ میرے کتبے پر محض حاجی کی بجائے الحاج لکھوا سکتا تھا۔ شان میں کس قدر اضافہ ہوا ہوتا۔ اگر چہ میں ان کی بات نہیں مانتا تھا یعنی اپنی زندگی میں۔ وہ بھی مجھ سے شاذ ہی متفق ہوا کرتے تھے۔ لیکن میں اپنے معاملات اپنے اللہ سے براہ راست طے کرنے کا عادی تھا۔ میں نے اپنے پہلے اور آخری واحد حج کے موقع پر بذات خود اللہ میاں سے ہمیشہ کے لیے رخصت حاصل کر لی جو اس ذات

باری نے مجھے بخشش عطا کر دی تھی۔ افسوس ہے کہ اس کا کوئی چشم دید گواہ نہیں۔ دراصل ایسے واقعات کا چشم دید گواہ نہیں ہوتا۔

میری بیوی یوں تو بڑی اچھی خاتون ہے لیکن میری اس بات پر وہ بھی یقین نہیں کرتی۔ بلکہ شاکی رہتی ہے اور سمجھتی ہے کہ میں پٹڑی سے اترا ہوا ایک بے دین شخص ہوں۔ عبادت سے کتراتا ہوں اور سہل پسند ہونے کی وجہ سے جسمانی مشقت سے بچنے کے لیے نئے نئے فلسفے گھڑتا رہتا ہوں۔ کوئی بھی یہ یقین نہیں کرتا کہ میرا اللہ ہر لحہ ہر دم ہر سانس کے ساتھ میری روح میرے جسم کے ذرے ذرے، روئیں روئیں میں گردش کر رہا ہے۔ میں اُس سے ایک ایک لمحے میں ہزار ہزار بار مخاطب ہوتا ہوں، لیکن اپنی مادری زبان میں اور اُس نے میری ایک ایک بات کو سمجھا ہے۔ وہ کیسے نہ سمجھے؟ وہ میرا خالق ہے۔ اس نے خود ہی مجھے میری ماں بخشی تھی۔ جس کے جسم سے میں نے نمو پائی۔ مجھے یہی زبان اس وسیلے سے ملی تھی۔

مجھے اپنے اردگرد ہر سُو قرآنی آیات، سنگِ مرمر کی عمدگی سے تراشی ہوئی چکنی سلوں پر کندہ کی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ اگربتیوں کی مہک اور پھولوں کی خوشبو میں میرے لواحقین تلاوت کر رہے ہیں۔ دو درجن سے زائد افراد اجرت پر لائے گئے ہیں جو مسلسل تلاوت کر رہے ہیں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ آج میرا سوئم ہے اس لیے کھانے پینے کا اعلیٰ بندوبست کیا گیا ہے۔ دیگیں خوب کھڑک رہی ہیں۔ انواع و اقسام کی اشیائے خورونوش وافر مقدار میں پڑی ہیں۔ مجھے ہنسی آ رہی ہے کہ یہ بے چارے کر کیا رہے ہیں؟ میں وہاں ہوں ہی نہیں۔ میری بیوی آنکھیں میچے زیرِ لب قرآنی آیات پڑھ رہی ہے۔ وہ بڑی خوبصورت لگ رہی ہے۔ تب میں نے جانا کہ میری محبت میری بیوی کے آس پاس منڈلا رہی ہے۔ میں یہ سمجھا تھا کہ وہ بھی میرے ہم راہ قبر میں دفن ہو گئی ہو گی اور بچھو نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے اسے بھی چٹ کر لیا ہو گا۔ حیرت ہے کہ وہ مری نہیں۔ میں

جان گیا کہ وہ قبر میں سرنگ بنتے ہی نکل گئی ہو گی اور اب وہ میری بیوی سے لپٹ رہی ہے۔ اس کے بوسے لیے ہیں۔ وہ چونک کر بڑبڑائی ہے:

"شرم کرو، بچے پاس ہیں۔"

شرم کی کیا بات ہے؟ محبت میرے خالق نے میرے وجود کی مٹی گوندھتے ہوئے ملا دی تھی۔ یہ الفاظ تم اُسی سے کہو۔ وہ بدک کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور "لاحول واللہ" کا ورد کرنے لگی ہے۔ میں نے اُس سے کہا ہے:

"لاحول کس لیے پڑھ رہی ہو۔ اس خیر و برکت کی محفل میں شیطان کا گزر ممکن ہی نہیں۔ خالقِ کائنات اوّل و آخر محبت ہے اور عشقِ کامل بھی۔ عشق و محبت ہی وہ سب سے زیادہ خوبصورت جذبہ ہے جو اُس نے خود تخلیق کیا ہے۔ اسی جذبہ کے باعث دنیا اور ساری کائنات کا حسن اور نظام قائم ہے۔ یہی جذبہ جس کے ادراک نے مجھے مسندِ انسانیت پر فائز کیا۔ میں اس کے اظہار پر شرم کیوں محسوس کروں۔ تم اس سلسلے میں براہِ راست اللہ سے بات کر لو۔"

اُس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور آنکھیں چھم چھم برسنے لگی ہیں۔ میری محبت ایک بار پھر اُس سے لپٹ گئی ہے اور کہہ رہی ہے: "روتی کیوں ہو؟ میں سدا تمہارے ساتھ رہوں گی۔"
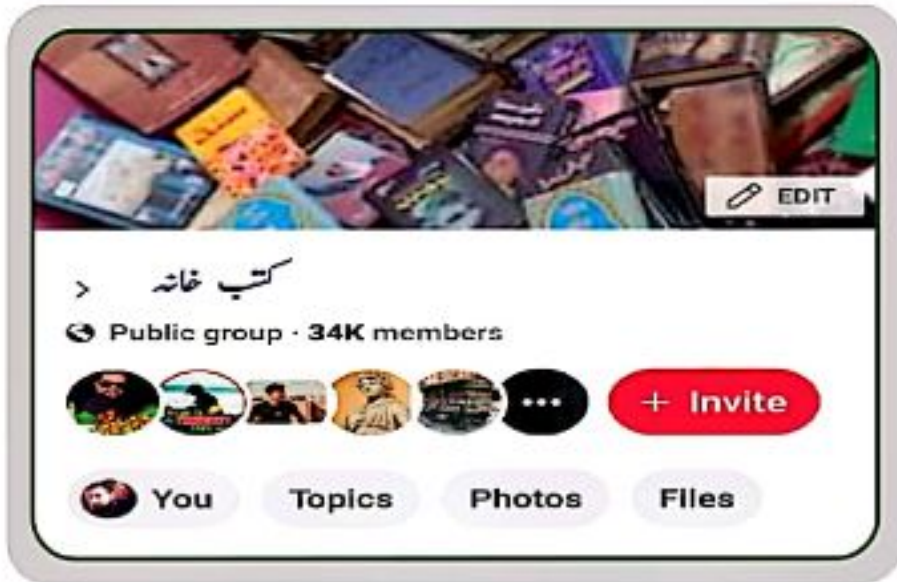
محمد الیاس

گُہر

برف

بارش

صدیوں پہ محیط اک سفر

مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں

دوزخ میں ایک پہر (افسانے)

منظر پسِ غُبار

لوحِ ازل پہ لکھی کہانیاں

Rs. 450.00

www.sangemeel.com
ISBN-10 969-35-2515-9
ISBN-13 978-969-35-2515-1
9 789693 525151